پیار کی دیوی

پیئر لوئی

زندہ کتابیں

ایک زمانہ تھا جب حسن اور شباب پر قیدیں نہ تھیں، یہ داستان
اسی رنگین دور کو اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ تازہ کرتی ہے

2.75

مکتبۂ جدید

حسن اور عشق دو ایسی طاقتیں ہیں کہ انسان اُن کے آگے ہمیشہ سر بسجدہ رہا ہے، انسان ان دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہمیشہ ایک کھلونا بنا رہا ہے۔ اس انسانی بے بسی نے مذہبی اور معاشرتی بندھنوں کو مضبوط سے مضبوط تر ہونے کی دعوت دی ہے۔ لیکن آج یہ بندھن جس قدر مضبوط ہیں کبھی اتنے ہی نرم تھے۔ ایک وقت تھا کہ حسن آزاد تھا اور عشق بے باک۔ اُس وقت حسن اور عشق کا وصال ایک عبادت تھا۔

یہ کہانی اُسی وقت سے تعلق رکھتی ہے۔ فرانس کے نامور مصنف: پئر لوئی نے ہمارے لیے اُسی بھولے بسرے وقت کو تازہ کیا ہے جب انسان، پیار کی دیوی: ایفرودت، کے مہرباں سائے میں محبت کی تانیں اُڑانے میں مگن تھا۔ حسن مجسم: کرائسس کے گرد بنی ہوئی یہ رس اور رنگ بھری داستان ہمیں ہمارے سنگین اور سفاک ماحول سے اٹھا کر اپنی دنیا میں لے جاتی ہے — وہ دنیا جو آرزوؤں کا ایک بے پایاں سمندر ہے، آرزوؤں کے ساتھ ساتھ چڑھتا اور اترتا ہؤا سمندر۔

شاھد چشتی نے اس خوبصورت کتاب کا بہت خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب زندگی کے حسن کو نکھارتی ہے اور عشق کے قیمتی جذبے کو سیراب کرتی ہے۔

پیئر لوئی

پیار کی دیوی

ترجمہ :۔ شاہد چشتی

مکتبہ جدید لاہور

بار اوّل، زندہ کتابیں ۱۹۶۳ء
طابع و ناشر: رشید احمد چودھری
مکتبۂ جدید پریس، لاہور

گذارشِ احوال واقعی

ساتویں عیسوی صدی کے آغاز میں اسکندریہ پر ایک زبردست فکری انقلاب آیا جس کی رو میں وہ عظیم اور گرانقدر تہذیبی ورثہ برباد ہو گیا جو برسوں پرانے رسم و رواج کا آئینہ دار تھا۔ اس انقلاب کو اس آگ سے کوئی تعلق نہ تھا جو عہد عیسوی سے تین صدیاں قبل جرمن نسل ونڈال نے جلائی تھی اور جس کے نتیجہ میں فرانس، ہسپانیہ، شمالی افریقہ اور روم تاراج ہوئے اور اُن کا تمام ادبی سرمایہ اور فنونِ لطیفہ کا اثاثہ برباد ہو گیا۔ یہ انقلاب دراصل ان اسلامی افواج کا لایا ہوا تھا جو نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے عرب سے اٹھیں اور تمام شمالی افریقہ کے کافرانہ نظام کو روندتی ہوئی بالآخر ہسپانیہ پر قابض ہوئیں۔

تاریخ والوں کا کہنا ہے کہ چونکہ عربوں کے رائج کئے ہوئے نظام میں مادی تصورات اور نظریات کے مزید پروان چڑھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی شمالی افریقہ کی عیسائی اور یہودی آبادی نے بذاتِ خود اس علاقہ کی تاریخی دستاویزیں اور دوسرا ثقافتی ریکارڈ آگ کی نذر کر دیا جس کا ایک مقصد تو عرب فاتحین کی خوشنودی حاصل کرنا تھا اور دوسرا اس بہانے عربوں پر ونڈالزم کی تہمت تراشنا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں مقاصد میں کامیاب ہوئے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جہاں مغربی مؤرخ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام شمالی افریقہ اسلام قبول کر گیا وہاں وہ اسکندریہ کے ثقافتی ریکارڈ کو تباہ کرنے کی بلاواسطہ ذمہ داری عربوں کے سر پہ تھوپتے ہیں۔

بہرکیف جب پیئر لوئی نے جو ۱۰ ستمبر ۱۸۷۰ء کو پیرس کے ایک ادب دوست خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا اور ۴ جون ۱۹۲۵ء کو فوت ہوا۔ اپنے ناول "ایفرودت" کی خاطر قدیم رسم و رواج کا مطالعہ شروع کیا تو وہ اس سلسلہ میں تقریباً تین سال

دریائے نیل کے کناروں اور چند دوسرے ایشیائے صغیر کے شہروں میں امتدادِ زمانہ سے بچے کھچے ریکارڈ میں اپنے مطلب کی چیزیں ڈھونڈتا رہا۔

یہ نہایت حیرت انگیز حقیقت ہے کہ پیری نے اپنی اس داستان میں نہ صرف یہ کہ عہدِ ماضی کا ایک صداقت افروز نقشہ کھینچا ہے بلکہ وہ ہمارے سامنے عیش و نشاط کا ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جو ہمارے موجودہ اخلاقی نظام کی طبعِ نازک پر بے حد گراں گذرتا ہے۔ تاہم مصنّف کی صدق دلی کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے داستان میں تاریخی حقائق سے بہت کم روگردانی کی ہے۔

کہیں کہیں اس کی پیش کی ہوئی تصویر از حد مفصّل نظر آتی ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ماضی بعید میں ایک طویل مدت تک پرستشِ جنس روزمرّہ کی زندگی کا ایک منظم پہلو رہا۔ اگر دن کے وقت عہدِ قدیم کے لوگ پرستشِ جنس میں مشغول رہتے تو ان کے رات کے اوقات جنسی عیش و نشاط کی نذر ہوتے۔

وینس، ایفرودت اور اسطارطہ کے معابد قومی ادارے مانے جاتے تھے اور وہاں قوم کے معزز ترین افراد اکثر و بیشتر آتے رہتے تھے۔ کنواری لڑکیوں کو ان معابد میں بطور ایک مذہبی فریضہ بھیجا جاتا تھا تاکہ وہ شادی کے تمام تر واجبات سے بطریق احسن آگاہ ہوں۔

قورطیبرہ سماج کی ایک نہایت معزز رکن مانی جاتی تھی ——— جنسیات سے متعلق تمام رسوم کو قومی سطح پر بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ لہٰذا ہمیں ان وقتوں کی زندگی سے روشناس ہونے سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس عہد میں زندگی کا تصور اور اسے گذارنے کا ڈھنگ بابل، مشرقی ممالک، مصر اور یونان اور روم میں کم و بیش ایک سا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ داستان ایفرودت میں پیری کا اندازِ منظرکشی بعض قارئین

کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ مگر ہمیں اس حقیقت کو ہرگز ہرگز نہ بھولنا چاہیے۔ کہ ہم اس داستان کو ان جدید اخلاقی اقدار کی روشنی میں جانچ رہے ہیں جو ہم نے برسوں بلکہ صدیوں کے غور و فکر کے بعد وضع کیں اور ان اقدار کو اپنے لیے حالات کے مطابق مستحسن قرار دیا۔

ہمیں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ مفکروں کے نظریات و تصورات صدی بعد صدی بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ اس مسلّمہ انقلاب جاریہ کے پیش نظر مناسب یہی ہے کہ ہم وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے چار ہزار برس پہلے کے انسانوں کے فکر و عمل کو ہدفِ تضحیک نہ بنائیں۔ انسان اس وقت ایٹمی سائنس کی برق رفتار ترقی کے دور سے گذر رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی بیشتر اخلاقی اقدار بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ ہمارے فکر و عمل کی دنیا میں ایک اچھوتا انقلاب آیا چاہتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے انسان کے مقابلہ میں آج کا انسان بالکل ہیچ معلوم ہو۔ مختصر یہ کہ "ایفرودت" یا "پیار کی دیوی" ان رسم و رواج اور تصوراتِ حیات کی ایک نہایت معقول تصویر ہے۔ جسے پیئر لوئی نے عہد قدیم کے مختلف تاریخی دستاویزوں سے جو "شیر آورون" کی سی عرق ریزی کے بعد مرتب کیا اور مطالعۂ کتب کے شوقین حضرات کے سامنے پیش کیا۔

پیری بمشکل ۱۹ سال کا تھا جب اس نے ملک فرانس کے ادبی حلقوں میں نام پیدا کرنا شروع کیا۔ ایفرودت کا پہلا باب "کرائسس" اس نے ۱۸۹۳ء میں بطور ایک مختصر افسانہ لکھا اور تین سال بعد مکمل ناول "ایفرودت" کے نام سے ۶۰۹ نسخوں کی تعداد میں شائع ہوا۔ پیئر کی موت تک یہ ناول ساڑھے تین لاکھ کی تعداد تک فرانس میں بک چکا تھا۔ ایک معتبر اندازہ کے مطابق آج تک کم از کم پیئر کی "پیار کی دیوی" جس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ہو چکا ہے چالیس لاکھ کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ امریکہ

میں "مرقع چغتائی" کی اسٹائل میں اس کے بیشتر مصوّر ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مصوّر ایڈیشنوں کی بیشتر تصاویر پیری کی بیوی کی مو قلم کا نتیجہ ہیں۔ مادام لوئی بذاتِ خود ایک اعلیٰ درجہ کی فن کار اور ادیب تھی۔

پیئر لوئی کی "پیار کی دیوی" کا اُردو ترجمہ سب سے پہلے سید عابد علی عابدؔ نے اس وقت کیا جب بقول شخصے' غالب جوان تھا۔ میں نے قبلہ عابد صاحب کی "داستان" کو اپنے موجودہ ترجمے میں ممد و معاون بنانے کے لیے بہت ڈھونڈا مگر نہ ملی۔ بہر کیف "پیار کی دیوی" "پیئر لوئی کی" "ایفرودیت" کے تین مختلف انگریزی ترجموں پر مبنی اُردو ترجمہ ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں کیا کیا کچھ کرنا پڑا، کتنے شب و روز صرف ہوئے، کن کن دوستوں نے میرا ہاتھ بٹایا یہ ایک علیحدہ داستان ہے جو غالباً کتابِ دل کے لیے موزوں ہے۔ بہر کیف میں ان سطور کو ختم کرنے سے پہلے اپنے عزیز دوست سردار علی تابش ایڈیٹر "الہام" بہاولپور اور بزرگ و محترم رہنما سیّد شبیرؔ بخاری۔ ایم۔ اے، آفیسر انچارج "تحریک مکاتبِ آئمہ مساجد" بہاولپور کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں جنھوں نے قدم قدم پر مجھ ایسے نرے اخبار نویس کو نہ صرف ایک ادیب نما مترجم بنانے میں مدد فرمائی بلکہ دورانِ ترجمہ میرے ذوق و شوق کو قائم رکھنے کے لیے کیا کیا کچھ نہ کرتے رہے۔ اگر ترجموں کے لیے انتساب لازمی ہوتا تو میں بلاجھجک اپنی اس "ادبی کاوش" کو اپنے نہایت ہمدرد دوست ملک نذیر احمد (انچارج بہاولپور اسٹیٹ لائبریری) کے نام نامی سے منسوب کرتا کیونکہ مکمل ایک سال ان کی لائبریری کا چہیتا "ریفرنس اینڈ ریسرچ سیکشن" میرے لیے مخصوص رہا۔

شاہد چشتی

مقدمۂ مصنّف

"یونانی دنیا کے کھنڈر بذات خود ہمیں سکھاتے

ہیں کہ جدید دنیا میں زندگی کیونکر گوارا بنائی جا سکتی ہے ـــــ رچرڈ واگنر

سیوس (C E O S) کا عالم متبحر پروڈیکس جو عہد عیسوی سے تقریباً پانچ صدی قبل ہو گذرا ہے اس شہرۂ آفاق اخلاقی تمثیل "حراقلیس نیکی اور نشاط کی کشمکش" کا مصنف ہے جیسے حضرت بسیل نے نہایت تاکید کے ساتھ عیسائیوں کے غور و فکر کے لیے تجویز کیا ہم جانتے ہیں کہ حراقلیس نے اپنے لیے اوّل الذکر کو منتخب کیا لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی متعدد سنگین جرائم کا گہوارہ بنی۔

اگر پروڈیکس کو صرف نکوکاری کی تلقین مقصود ہوتی تو اس صورت میں وہ ایک ایسی حکایت کا مصنف ہوتا جو لطیف اشارات و کنایات میں ایک لاجواب تصنیف ہوتی مگر چونکہ وہ ایک جہاندیدہ اور پختہ فکر فیلسوف تھا اس لیے اس کی لکھی ہوئی داستانوں کا مجموعہ "ساعتیں" ایک ایسی گرانقدر ادبی پیشکش تھی جس میں اخلاقی صداقتوں کو مختلف حالات میں منطبق ہوتے دکھایا گیا ہے۔ یہ تصنیف آدمی کی عمر کے تین مختلف ادوار (بچپن، جوانی اور بڑھاپا) کے مطابق تین حصّوں میں منقسم ہے۔ بچوں کے لیے پروڈیکس نے حراقلیس کے انتخاب نکوکاری کی عارفانہ مثال مستحسن خیال کی۔ جوانوں کو اس نے ہومر کی عظیم تصنیف اوڈیسی کے ہیرو پیرس کے انتخابِ نشاط کی مثال پیش کی اور جیسا کہ میرا خیال ہے باشعور عمر رسیدہ مردوں سے وہ کچھ اس طرح مخاطب ہوا۔

"کہار ڈیلفی کے گلپوش دامن میں ایک شکار کے تعاقب میں سرگرداں اوڈیسیئس کی مڈبھیڑ اچانک دو ایسی دوشیزاؤں سے ہو گئی جو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے محوِ خرام

نازتھیں۔ ان میں سے ایک جس کے بال ملائم اور سیاہ تھے، آنکھیں سرمئی اور ذہن سنجیدہ تھا، اس سے بولی؟ "میں عاربط ہوں۔" دوسری جس کے پپوٹے بوجھل، ہاتھ نازک اور چھاتی گداز تھی، بولی؛ "میں طرائفے ہوں، پھر دونوں مل کر بولیں، ہم میں سے جسے چاہو چن لو۔" لیکن دانشمند اوڈیسیئس نے بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ میں تم دونوں میں سے ایک کو کیسے اپنے لیے چن لوں جبکہ تم ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جا سکتیں۔ جس آنکھ نے تم میں سے ایک کو دیکھا گویا کچھ نہیں دیکھا تمہارا ایک دوسرے کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسرے سے الگ الگ تم بے رنگ اور بنجر سائے ہو۔ جس طرح صحیح نکو کاری اپنے تئیں نشاط سے ماخوذ بے پایاں مسرتوں سے محروم نہیں کرنا چاہتی اس طرح لطافتِ طبع اس شخص کے لیے موزوں نہیں جو شرافتِ نفس سے عاری ہو۔ میں تو تم دونوں کا خواہاں ہوں۔ بسکہ مجھے راہ دکھاؤ! ــــــ وہ اپنی گفتگو بمشکل تمام کر پایا تھا کہ وہ دونوں نسوانی پیکر پگھل کر ایک دوسرے میں حلول ہو گئے اوڈیسیئس نے جانا کہ وہ تو فی لحقیقت الفرودت کی عظیم ہستی سے مخاطب ہے۔"

جو ناول آپ پڑھنے والے ہیں اس کا مرکزی کردار ایک ایسی عورت ہے جو عہدِ قدیم کی ایک مثالی نور طیزہ ہے مگر قاری کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ وہ عورت آخر میں تائب نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی موت کے وقت کوئی درویش منش ہستی اس کی نجات اخروی کے لیے دعا مانگتی ہے کجا کوئی پیغمبر یا دیوتا بنفسِ نفیس اس کی موت کے لمحۂ تاریک کو منوّر کرتا۔ بحیثیت نور طیزہ وہ اپنا کردار نہایت بیباکی اور جوش و خروش بلکہ اس فخر یہ انہماک کے ساتھ ادا کرتی ہے جو سماج میں اپنے لیے آزادانہ طور پر منتخب کئے ہوئے مقام اور زندگی گذارنے کے لیے ایک قابلِ احترام ذریعہ معاش کے شایانِ شان ہے رفتہ رفتہ وہ عورت اپنے دل میں اپنے آپ کو عزت و احترام کے بلند ترین مقام پر لے جانے کی

بے پناہ آرزو موجزن پاتی ہے اور اُسے کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس کا طریق حیات کسی اخلاقی جواز کا بھی محتاج ہے۔ یہ حقیقت قدرے توضیح چاہتی ہے۔

ہمارے نام نہاد جدید ادیب جنھوں نے آج تک نوعمر لڑکیوں یا اعلیٰ طبقے کے لڑکوں سے بھی کم بیدار مغز عوام سے مخاطب ہونے کی زحمت گوارا فرمائی اپنے خیالات ونظریات کی ترجمانی کے معاملہ میں اس قدر مکروفریب سے کام لیا ہے کہ ایک ذی شعور قاری خواہ مخواہ تلخ نوائی پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے: "ہم نے ہوس نشاط اور عیش پرستی کی ایسی حقیقی تصویر کھینچی ہے کہ نکوکاری کی عظمت عوام پہ واضح ہو۔" اپنے ناول جس کا تمام منظر اسکندریہ سے متعلق ہے، کا مقدمہ لکھتے وقت کم از کم میں تو اس غلط زمانی کے جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ آرزوئے بوس وکنار کہیئے یا ہوس عشق کہیئے ہر اعتبار سے اہل یونان کے نزدیک انسانی جذبات میں نہ صرف سب سے زیادہ اعلیٰ وارفع جذبہ تھا بلکہ باعتبار عظمت نہایت سیر حاصل جذبہ تھا۔ انھوں نے اس عظیم جذبہ کو کبھی فحاشی اور بے حیائی کے سطحی احساسات سے ملوث نہیں کیا جیسا کہ بعد میں اسرائیلی روایات سے متاثر عیسوی نظریات کی بدولت ہوا۔ ہیرادوطس الہامی کتاب میں ایک مقام پر سرسری طور ذکر کرتا ہے: "بعض وحشی اقوام میں برہنہ اندام پھرنا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔" جب یونانی یا لطینی لوگ کسی ایسے مرد کو معتوب یا ذلیل کرنا چاہتے تھے جو فاحشہ عورتوں کے ہاں جاتا تھا وہ اسے "پورنی ٹس" (جس کا مطلب زناکار تھا) کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک مرد اور جوان عورت جو آپس میں کسی دوسرے رشتہ میں منسلک نہ ہوتے، عیش ونشاط کی خاطر اگر کسی عام جگہ پہ باہم مل جاتے تو ان کا یہ فعل کسی کو ناگوار نہ گذرتا اور مشغول محبت جوڑے کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا جاتا۔ صاف ظاہر ہے کہ عہد قدیم کی زندگی کو ان اخلاقی اقدار کی روشنی میں نہیں جانچا جا سکتا جو جینوا کے کالونسطوں کے یہاں سے ہم تک پہنچے۔

جہاں تک میرے ذاتی نکتہ نظر کا تعلق ہے میں نے اس کتاب کے لکھنے میں ایسی

سادگی سے کام لیا ہے جو کبھی ایتھنز کے مہم نگاروں کی نگارشات کا طغرۂ امتیاز تھا مجھے امید ہے یہ کتاب اسی جذبہ کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

اگر ہم چاہیں کہ اہل یونان کو آج کے نظریات کی روشنی میں جانچیں، تو ظاہر ہے کہ ہم یونان کے عظیم ادیبوں کی ایک تصنیف کا حرف بحرف ترجمہ بچوں کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے۔ اگر اوڈی پس کے اصل کردار کو احتسابی قطع برید کے بغیر پیش کر دیا جائے تو یقیناً پولیس کو تھیٹر بند کرنا پڑے گا۔ اگر تھیوقریطس کا سالم ترجمہ کر دیا جائے تو ترجمہ کو بازار میں آنے سے پہلے ہی بحقِ سرکار ضبط کر لیا جائے گا۔ البتہ ارسطوفینز کا معاملہ قابل استثنا ہے لیکن دوسرے ایک سو بتیس [۱۳۲] ایتھنیس شعرا مثلاً انغیتیس، فلاطروس، اسطارطس عیوبولاس اور قراطینوس وغیرہ اپنے قابلِ قدر شاعرانہ کلام کے علاوہ چودہ سو چوالیس [۱۴۴۴] گرانقدر کامیڈیاں بھی ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں نہایت حیران کن واقعہ ہے کہ کسی کو ان عظیم الشان اور بے مثال ادبی شہ پاروں کو ترجمہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

یونانی اخلاقیات کی عظمت کو تسلیم کرنے کے معاملہ میں ایک عجیب رواج ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم بعض یونانی مدبروں کی تعلیمات کو جنسی نشاط کی مذمت میں اقتباساً پیش کرنے لگے ہیں حالانکہ یہ فعل مسئلہ کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنانے کے مترادف ہے۔ ان معدودے چند اخلاقی علمبرداروں نے بغیر کسی امتیاز کے تمام انسانی حواس کی زیادتیوں کو قابلِ مذمت گردانا ہے۔ ان کے نزدیک ایک عیاش اور قمار باز میں کوئی فرق نہیں تھا چنانچہ ان کی نظر میں وہ شخص جو پیرس کے کسی بڑے ریستوران میں بیٹھا ایک نہایت قیمتی عشائیہ کا آرڈر دیتا تھا اتنا ہی قابلِ مذمت تھا۔ جتنا وہ آدمی جو اپنے لیے کسی عام راہ گذر پر مشغولِ عیش ہونے کا اہتمام کرتا تھا۔ موخرالذکر کو تو ہمارے ملک کے موجودہ قانون کے مطابق بھی ایک سال قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ضمناً یہ عرض کر دینا

بھی نامناسب نہ ہوگا کہ قدیم عہد کا سماج اس قماش کے تمام پرہیزگار مدبروں کو یا تو مریض خیال کرتی تھی یا پاگل۔ تمثیل گاہوں میں انھیں ہدفِ تضحیک بنایا جاتا۔ سرِبازار انھیں پیٹا جاتا۔ ظالم و جابر لوگ انھیں درباری بھانڈ تصور کرتے اور آزاد جمہوری مملکت کے شہری انھیں مستحق گردن زدنی نہ پاکر جبراً ملک بدر کر دیتے تھے۔

غرضیکہ نشاۃِ ثانیہ سے لے کر آج تک کے تمام جدید معلمینِ اخلاق عمداً اور دانستہ طور پر قدیم نظریاتِ اخلاق کو اپنی سیرت کی تنگ دامانیوں کا موجب قرار دیتے ہیں۔ اگر سیرت و اخلاق کے قدیم نظریات قابلِ قدر اور عظیم تھے اگر ان نظریات کو بطور ایک مثالی ضابطۂ اخلاق اپنایا جا سکتا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی دوسرا ضابطۂ اخلاق اس قابل نہیں ہے جو حسن کے معیار پر خیر و شر اور جائز و ناجائز میں نہایت [illegible] باریکی سے تمیز کر سکے اور ساتھ ہی نہایت صدق دلانہ بیباکی سے یہ واضح کر سکے کہ ہر شخص کس طرح دوسروں کے حقوق کا احساس کرتے ہوئے اپنا ذاتی حقِ تعیش استعمال کر سکتا ہے۔ یہ توفیق صرف اسی ضابطۂ اخلاق کو نصیب ہوئی کہ اس نے نہایت بیباکی کے ساتھ یہ [illegible] کہا کہ زیرِ آسمان دنیا میں جسمانی کسبِ نشاط سے زیادہ کوئی شے یا فعل مقدس نہیں اور یہ کہ انسانی شکل و صورت سے زیادہ کوئی خوبصورت چیز دنیا میں نہیں۔

یہ تھا ضابطۂ اخلاق اس قوم کا جس نے اقروپولس تعمیر کیا اور اگر میں یہ کہوں کہ وہ ضابطۂ اخلاق نامور ہستیوں کے نزدیک ہمیشہ قابلِ قدر اور عظیم رہا ہے تو یہ ایک عامیانہ تصدیق ہوگی جبکہ فن کاروں، ادیبوں، جنگجوؤں اور مدبروں کی اعلیٰ فہم و فراست کے مطابق قدیم متمدن اقوام کی وسیع النظریاں ہرگز ہرگز اخلاقی بے راہرویاں نہ تھیں۔ ارسطو نے اپنی حیاتِ معاشقہ کا آغاز فاحشہ اور عیاش عورتوں کی صحبت میں اپنی آبائی جائیداد کو ضائع کرنے کی شکل میں کیا۔ سیلفو، کا نام نامی ایک مخصوص بدی سے منسوب ہے اور یہ بات قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ راسین فی الواقعہ تمام عمر اپنے تھیٹر کی ممثلات سے گریزاں رہا اور یہ کہ نپولین

واقعی ایک پرہیزگار انسان تھا۔ میرابیو کے ناول "اشتائیر" کے یونانی زبان میں کہے ہوئے اشعار دیدروت کے مکاتیب، اور مون طسقیو کے ادبی شہ پارے بیباکی کے لحاظ سے کس طرح بھی قاطیلوس کی تصانیف سے کم اہم نہ تھے۔ اور کیا آپ کو علم ہے کہ فرانس کا سب سے زیادہ درویش منش، مختنی اور محتاط ادیب شہیر بوفن نے جذباتی آشنائیوں پر کس طرح اظہار خیال کیا ہے: "اے محبت! تو تمام دنیا کی ذی روح ہستیوں کے لیے وجۂ مسرت کیوں ہے اور انسان کے لیے وجۂ ملال کیوں؟ کیا اس لیے کہ جذبہ کا صرف جسمانی پہلو حسن ہے اور بقیہ تمام پہلو ہیچ؟"

تو اس کی وجہ کیا ہے اور یہ کیونکر ممکن ہوا کہ قدیم متمدّن اقوام کے نظریات کے عام عدم رواج کے باوجود یونانیوں کی انتہائی عیش پرستیاں آج کے عظیم مفکروں کی جبین فکر پر شعاع نور کی طرح فروزاں رہی ہیں! یہ اس لیے کہ جنسی تعیّش کی آرزو بہر حال شعوری ترقی کے لیے لازماً ایک پراسرار تخلیقی محرک اور جذبہ کا کام دیتا ہے۔ وہ حضرات جنھوں نے نفسِ امارہ کی ناگہانی اشد ضروریات کی صحیح تفہیم سے دامن چرایا اور انہیں نہ تو قابلِ مذمت قرار دیا اور نہ لائق تحسین، وہ لوگ یقینی طور پر ذہن انسانی کی احتیاجات کی معنویت کی تفہیم سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ جس طرح روح کی تابندگی چہرہ کو پرحیات اور بارونق بناتی ہے اسی طرح جسمانی توانائی ذہنی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مصوّر ریوبنس مصوّر اور ادیب آنگرے کے مخالفین کو عظیم ناقد لافردیٹس نے بجا طور پر "مخنثین دہر" کا ذلیل لقب دیا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقوام اور افراد کی ذکاوت بہر حال جنسی میلانات سے ماخوذ ہوتی ہے۔ بابل، اسکندریہ، ایتھنز، پیرس، وینس، روم —— یہ تمام شہر جنھوں نے دنیا پر حکومت کی، عام قانون فطرت کے عمل ترویج کے مطابق جس قدر زیادہ عیش پرست تھے اس قدر زیادہ طاقتور تھے گویا ان کی قومی شان و شکوہ کا اصل موجب

ان کی عیش پرستیاں تھیں۔ ان شہروں کی مجالس مقننہ میں وہ اراکین جو مصنوعی نکوکاری کی ترویج کے لیے تنگ نظری پر مبنی خشک اور اصلیت سے بعید قوانین پاس کروانے کی کوشش کرتے تھے عوام انہیں ابتدا سے ہی ذلیل وخوار کرنا شروع کر دیتے تھے بلکہ انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی۔ سرزمینِ یونان جو کسی زمانہ میں قوتِ تھا۔ اسکندریہ اور سرا کیوز اور ملتوس کے درمیان ارتقائے روحانیات کے اعتبار سے ایک زبردست مرکزی مقام کی حیثیت رکھتی تھی ہمارے لیے ایک بھی شاعر، مصور، فلسفہ دان، مورخ یا سائنس دان باقی نہیں چھوڑ گئی۔ لے دے کے اس سرزمین روحانیات کے متعلق کوئی یاد باقی ہے تو وہ شعوری اعتبار سے ناتراشیدہ اس دیہاتی بوبیلوٹ کے متعلق ہے، جو ایک مجہول روحانی نظریہ کی خاطر اپنے تین سَو دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ایک کہستانی درہ میں لڑتا لڑتا ناکام و نامراد موت کے گھاٹ اتر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نیک سیرتی کے اسپارٹی "تصور" کو دو ہزار سال بعد بھی بودا پاتے ہیں اور بقول رینان ہم مجبور ہیں کہ "اس سرزمین کو بُرا بھلا کہیں جس نے سیاہ کاریوں کی داشتہ کی پرورش کی اور اس پر لعنت بھیجیں جواب موجود نہیں"۔

کیا ہم عفسیوس اور سارڈنی کا عہدِ زرّیں پھر کبھی دیکھ نہ پائیں گے؟ صد حیف ہمارے عہدِ نو کی نام نہاد مہذّب و متمدّن دنیا دن بدن بھونڈے پن اور بدردی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا قافلۂ تہذیب معاشرت رفتہ رفتہ شمال کی دھند، کہر اور کیچڑ کی طرف رواں ہے۔ ہم ظلمتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ بدنام و رسوا شاہراہوں پر سیاہ پوش لوگ نظر آ رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا یہ لوگ کن خیالات میں مگن ہیں؟ حد تو یہ ہے کہ آج کا پچیس ۲۵ سالہ جوان ذہنی اور جسمانی طور پر اس قدر ناکارہ ہو چکا ہے کہ وہ عمر رسیدہ لوگوں کے حلقہ میں جانے کے خیال تک سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔

کم از کم وہ لوگ جو ہمیشہ متاسف رہیں گے کہ وہ اس سرزمین کی نشاط آفریں جوانی سے لطف اندوز نہ ہو سکے جس کا نام "قدیم عہد زریں" تھا اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں چند مختصر لمحوں کے لیے اس دور کی رنگین زندگی سے روشناس کرایا جائے جس کے مطابق انسانی جسم جو بوجہ شبیہہ ربانی ہونے کے نہایت بے نقص و بے عیب ہے فرائینے نامی ایک نورطینزہ کے روپ میں ساحلِ علوسس پر بیس[۲] ہزار زائرین کے اجتماعِ عظیم کے روبرو بے جھجک بے نقاب ہو سکتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک انتہائی نشاطِ آفریں عملِ محبت یعنی وہ پاکیزہ اور فطری ہنگامہ حسن و عشق جس کے باعث ہم پیدا ہوئے، ہر عیب، ہر جھجک اور ہر تصورِ معصیت سے بالاتر تھا۔ ان لوگوں کو اجازت ملنی چاہیئے کہ وہ انیس[۱۹] صدیوں کے وحشیانہ پن، مکروریا اور کریہہ المنظری کو مطلقاً بھول جائیں اور پھر عفونت افروز گندے تالاب کو خیرباد کہہ کر اس پاک و مطہر سرچشمہ کی طرف نہایت پاکیزہ جوش و خروش کے ساتھ گامزن ہوں جہاں سے جمالِ حقیقی پھوٹتا ہے اور پھر اس عظیم مندر کی از سرِ نو تعمیر کریں جس میں کبھی سحر طرازانہ بانسریاں نغمہ افروز تھیں اور نہایت عارفانہ جوش و جذبہ کے ساتھ لافانی ربۃ الفردوت کی عقیدت سے معمور دلوں کو ان فراموش شدہ مقدس حرم خانوں کی نذر کریں جو کبھی حقیقی انبساطِ روح و جسم کا گہوارہ تھے۔

(پیئر لوئی)

ترتیب

کتابِ اوّل: طلوع

کتابِ دوم: جستجوئے حصول

کتابِ سوئم: ہنگامۂ خرابات

کتابِ چہارم: انکشافات

کتابِ پنجم: غروب

تصریحات

کردار

ایفرودت حسن وعشق اور تعیش کی یونانی دیوی جو
عہدِ قدیم میں مختلف ناموں سے یاد کی جاتی تھی - مثلاً اسطارط،
عسطوریت، عشطاذ، وینس، زہرہ، بلکشی، کالی، فاریہ،
ملیتا، ساپٹریس، ڈورتھیا، عیسطرونیہ، کرائسہ،
اندرمتی، اندوبین، حاطرہ وغیرہ - یہ تمام نام الفرودت کے
متنوع الاشکال اور کثیر الصفات ہونے کے غماز ہیں -
عہدِ قدیم کی ہر مہذب اور متمدن قوم نے اس دیوی کو ایک
علیحدہ نام سے پکارا اور پوجا ہے - APHRODITE

کرائسس	Chrysis	داستان کی ہیروئین -
دماطریس	Demetrios	داستان کا ہیرو - ایک نامور بت تراش -
جالا	Djala	کرائسس کی ہندو مشاطہ جس کا مالاباری نام جلنا تہ چندر شرپالہ تھا
برنیس	Bernice	ملکۂ مصر -
طرائفرہ	Tryphera	کرائسس کی مداح سہیلی قورطینرائیں
سیسو	Seso	
ماؤساریہ	Mousarion	
بخیث	Bacchis	ایک جہاندیدہ معمر قورطینرہ -
نقراط	Naucrates	ایک فلسفی -
فراسیلاس	Phrasilas	ایک عظیم قلمکار
فلدماس	Philodemos	ایک لاطینی شاعر

جائمن	Timon	ایک رنگین مزاج نوجواں
ایفرودسیہ	Aphrodosia	بخیث کی چہیتی کنیز۔
چیریز	Cheres	ایک جہاز ساز۔
رعودث	Rhodis	ایک کنواری نے نواز۔
مرطوصیلہ	Myrtoceila	ایک کنواری مغنیہ۔
تھیانو	Thiano	ایک رقاصہ۔ رعودث کی اوباش بہن۔
طاؤنی کسندرۂ	Touni Cassandra	معبدِ اسطارطہ کے پیشوائے اعظم کی بیوی۔
ملیتا	Melitta	ایک کمسن قورطینرہ۔
میکائیلس	Mackylus	ملیتا کا عارضی دوست۔
شمارس	Chimaris	ایک خانماں برباد نجومی قورطینرہ۔
حیلوپ	Heliope	
سیلانی	Selene	
ارتیاث	Artias	ایفرودسیہ کی چھ بہنیں۔ بخیث کی کنیزیں۔
حرمیون	Hermione	
قرونمغیرہ	Chronomagira	
دمیدہ	Diomeda	
فِسطینہ	Faustina	ایک رومن حسینہ۔ شاعر فلدماس کی محبوبہ۔
قلستاں	Collistion	
فلوطیس	Phillotis	قورطینرا ئیں۔
ناتھیں	Gnathene	

کرائسس

سینہ کے بل لیٹی ہوئی کرائسس کہنیاں بڑھائے، ٹانگیں دراز کیے، اپنے ایک گال کو سہارا دیئے، سبز کتان کے تکیہ میں ایک لمبی طلائی پن سے چھوٹے چھوٹے ہم شکل سوراخ بنا رہی تھی۔

سورج نصف النہار پر آیا اور ڈھل گیا اور اس کے دو گھنٹہ بعد جب وہ نیند سے جاگی تو زیادہ سونے کے باعث واماندگی اور خستگی محسوس کر رہی تھی اور اس وجہ سے وہ اپنے بستر پر جس کا ایک حصہ اس کے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا، بدستور دراز تھی۔

اس میں کلام نہیں کہ اس کے اَن گنت لامبے، چمکیلے، لچکدار اور گھنے بال سمور کی طرح نرم اور گداز تھے۔ علاوہ اس کے وہ زندگی کی حرارت سے بھرپور تھے۔ گیسوؤں کے بادل اس وقت اس کی نصف پُشت پر محیط ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے ننگے پیٹ کے نیچے بھی پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو گول گول گچھوں کی شکل میں اس کے گھٹنوں تک چمکتے چلے گئے تھے۔ اپنے بالوں کی سموری سیج پر لیٹی ہوئی یہ نوجوان عورت اپنے ان بھورے اور سنہری بالوں کی بدولت ہی اسکندریہ کی نوردطینیاؤں میں کرائسس کے نام سے مشہور تھی۔

بے شک اس کے گیسو نہ تو بیگماتِ شام کے گیسوؤں کی طرح ہموار تھے اور نہ ہی ان میں اہلِ ایشیا کے بالوں کی سی سیاہی اور چمک تھی۔ انہیں بناتِ مصر کے بھورے اور سیاہ بالوں سے بھی مناسبت نہ تھی۔ وہ تو صحرا پار کی آریائی نسلِ غلیلہ کے بالوں

سے ملتے جلتے تھے۔

کرائسٹس۔ اس نام سے اسے محبت تھی۔

ربۃ تعیش الفرودت کے پرستار اور شاعرانہ مزاج رکھنے والے نوجوان اس کے یہاں بھی آتے تھے۔ وہ سب اپنے اشعار میں اسے کرائسٹمہ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ اشعار ہیجانِ نشاطِ شب میں ڈھل ڈھل کر ہر صبح آستانِ محبت کے گلہائے رنگین میں منتقل ہو جاتے۔ وہ الفرودت کے حسن سحر کی قائل نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھی کہ اس کا مقابلہ ایک دیوی سے کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس مخفی مسرت کی وجہ سے وہ کبھی کبھی ایک ہمدرد دوست کے روپ میں دیوی الفرودت کے معبد میں حاضر ہوتی اور عطریات اور ملبوسات سے بھرے ہوئے صندوقچے ہدایائے محبت پیش کرتی۔ بطور

وہ غناسرت جھیل کے کنارے پیدا ہوئی تھی۔ وہی رومانی جھیل جو دھوپ اور سایوں سے لبریز ایک گلپوش وادی میں واقع تھی۔ کہتے ہیں اس کی ماں جسے اہالیانِ غلیلہ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ہر روز شام کے وقت یروشلم کو جانے والی سڑک پہ کھڑی ہو جاتی اور وہاں سے گزرنے والے مسافروں اور سوداگروں سے ہمکلام ہوتی اور بعد ازاں اسے اپنے آپ کو قریب کی چراگاہ کے فرشِ سبزہ پر ان کے سپرد کرنے میں ذرا سا بھی تامل نہ ہوتا غرضیکہ اہلِ غلیلہ اس کی بہت قدر کرتے تھے۔ پرهتوں تک کو اس عورت کے دروازہ سے روگردانی کی مجال نہ ہوتی کیونکہ وہ ایک باکمال مخیر اور راست باز خاتون تھی۔ جب بھی موقع آتا وہ خوشی خوشی قربانی کے میمنوں کی قیمت اپنی جیب سے ادا کرتی تاکہ خدائے لم یزل کا فضل و کرم ہمیشہ اس کے شاملِ حال رہے۔ چنانچہ جب وہ حاملہ ہوئی تو اس وجہ سے کہ اس کا کوئی شوہر نہ تھا، چاروں طرف سے لعن طعن شروع ہو گئی۔ اس زمانہ میں اس کی ملاقات ایک ایسی صاحب نظر ہستی سے ہوئی جو اپنی پیشنگوئیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس نے اس کو بتایا کہ وہ ایک ایسی لڑکی کو

جنم دینے والی ہے جو ایک دن تمام قوم کا سرمایۂ افتخار و اعتقاد ثابت ہو گی۔ اس بیچاری کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بات کیسے ممکن ثابت ہو گی۔ تاہم جب اس کے ہاں بچی پیدا ہوئی تو اس کا نام سارہ رکھا عبرانی زبان میں جس کا مطلب 'شہزادی' تھا، چنانچہ اس نام کے طفیل لوگوں کی سخن طرازیاں ختم ہو گئیں۔ مقام حیرت تھا کہ اس بات کا کرائسس کو مطلق علم نہ ہو سکا، اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ پیشینگو نے اس کی والدہ کو سخت تنبیہ کر رکھی تھی کہ جس شخص کے متعلق پیشینگوئی کی جائے اسے پیشینگوئی کی اطلاع کرنا قرین مصلحت نہیں ہوتا۔ رہا اس کے ماضی کا سوال تو اس کے متعلق وہ اس لیے سوچنا گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ اسے پسند نہ تھا۔ ماضی سے متعلق اگر کوئی یاد یا احساس اس کے دل میں تھا تو وہ سراسر خوف و ہراس سے ماخوذ تھا۔ اس خوف کی وجہ وہ بندشیں تھیں جو اس کی ماں اس پر عائد کرتی رہتی تھی۔ شام کے وقت جب کبھی اس کی ماں کو باہر سڑک پر جانا ہوتا وہ سارہ کو کمرے میں بند کر دیتی اور وہاں اسے پہروں بیٹھے رہنا پڑتا۔

کرائسس کو اس قید خانہ کا وہ گول دریچہ اب تک یاد تھا جس سے وہ بصد حسرت دریاس جھیل غناسرت کی لہروں، دھند میں لپٹے ہوئے نیلگوں کھیتوں، صاف شفاف آسمان اور وادیٔ غلیلہ کی سبک رو ہواؤں کو دیکھا کرتی ان کے گھر کے ارد گرد نرگس اور گلابی سن کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ کہر آلود مرغزار میں کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں سر اٹھائے نظر آیا کرتی تھیں دریچہ سے وہ ندی بھی نظر آتی تھی جس کی تہوں میں لال گھونگے ملتے تھے اور جس میں بستی کی کم سن بچیاں نہایا کرتی تھیں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے تالابوں میں، مرغزاروں میں اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر گلِ سوسن کا راج تھا۔

وہ بارہ سال کی ہو گی جب وہ گھر سے بھاگ نکلی چشمۂ آب پر بیٹھے بیٹھے اس نے راہگیروں سے کچھ اس طرح آنکھیں لڑائیں کہ بعد ازاں اسے شہر طائر کو

جانے والے ہاتھی دانت کے سوداگروں کے ایک گھوڑ سوار دستہ کے پیچھے پیچھے چلنے میں بالکل عار محسوس نہ ہوئی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ان لوگوں نے کس طرح خوشی خوشی اسے گھوڑے پر بٹھا لیا تھا اور کس طرح رات کے وقت انھوں نے دوبارہ پڑاؤ ڈالا تھا۔ بہت ہی عجیب رات تھی وہ کہ جب آسمان پہ ایک تارہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اُسے طائر میں اپنے داخلہ کا سماں بھی یاد تھا۔ لگام مٹھیوں میں بھینچے ہوئے وہ نہایت طمطراق کے ساتھ ایک بار بردار گھوڑے پر اپنی برہنہ پنڈلیاں لٹکائے بیٹھی تھی تاکہ بستی کی عورتیں اس کی ان ٹانگوں کا اچھی طرح نظارہ کرسکیں جن پر خون کی دھاریاں اب تک موجود تھیں۔ اسی شام سوداگر مصر کو روانہ ہو گئے اور وہ ان کی رفاقت میں بالآخر اسکندریہ پہنچ گئی۔

یہ وہاں کی بات ہے کہ عرصہ دو ماہ گزر جانے کے بعد جب سوداگر جانے لگے تو جانتے جانتے اس کو سنگِ مرمر کے ایک چھوٹے سے مکان میں آباد کر گئے۔ اس گھر کو جس کے باہر ایک چبوترا بھی تھا انھوں نے طرح طرح کے سامان سے آراستہ کیا چنانچہ اب اس گھر میں کانسی کا ایک قد آور آئینہ، غالیچے اور گدے گدے تکیوں سے لے کر ایک ہندو کنیز تک موجود تھی۔ یہ کنیز فن مشاطگی میں یکتائے روزگار تھی۔ ان عاشق سوداگروں کے یومِ روانگی کی شام کو ہی کرائسس کے دوسرے طلب گار آ گئے اور اس سے اگلی شام اور دوسرے۔

شہر کے شمالی حصّہ میں جہاں وہ قیام پذیر تھی یونانی من چلے جانے کیوں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک عرصہ دراز تک اپنی ماں کی طرح اس کا واسطہ مسافر اور سوداگر قسم کے لوگوں سے پڑتا رہا۔ اپنے اولیں عشاق کو بھی اس نے دوبارہ کبھی نہ دیکھا باوجودیکہ کسی حد تک وہ انہیں اس وجہ سے بہت پسند کرتی تھی کہ وہ ان پر

حسبِ منشا چھا سکتی تھی وہ اس کی ہر طرح کے ناز و نخرے برداشت کرتے رہتے۔ لیکن قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی اس کی محبت کا دم بھرنے لگتا وہ اسے فوراً ترک کر دیتی اور اس کا بابِ خلوت اس کے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا —— باہمی تعلق داری کے اس بیّن فقدان کے باوجود اس کے وجود نے اسکندریہ میں ایک نئی شہوانی تحریک کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ متعدد قافلوں کے سردار کرائسس کی رعنائی جمال سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کی جنون آمیز دھن میں اپنے تجارتی سامان کے ساتھ کوڑیوں کے مول بک گئے۔ چنانچہ ان سے حاصل کی ہوئی بے اندازہ دولت سے کرائسس نے اپنے لیے ہیرے اور جواہرات سنجاب و سمور کے گدگدے بستر، نادر زمانہ خوشبوئیں، مرصع ملبوسات اور چار کنیزیں خریدیں۔

رفتہ رفتہ وہ بہت سی زبانیں سیکھ گئی تھی۔ دیس دیس کے قصے اور کہانیاں بھی اسے معلوم ہو چکی تھیں، مثلاً اس کے اسیریئن عشاق نے اسے ڈونزی اور استختار کی حیرت انگیز عشق بازیوں کے قصے سنائے۔ فونیشیا والوں نے اس کو اسختار وطا اور ایڈونیس کے جنوں آمیز عشق کا حال سنایا۔ ملکہ افخس کے معاشقوں کی دل گداز داستان اس نے الجزائر کی ان یونانی نژاد دوشیزاؤں کی زبان سے سنی جنھوں نے کرائسس کو بوس و کنار کے وہ عجیب و غریب ڈھنگ سکھائے تھے جن سے وہ شروع شروع میں خاصی خائف ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کے بغیر اسے زندگی کا ایک دن گذارنا بھی محال تھا۔ اسی دوران میں اسے اطلانطیہ کے محیر العقول انداز دلبری کا بھی علم ہوا بے شک یہ اطلانطیہ کے طریقِ محبت کا اعجاز تھا جس کی بدولت لبستی کی نے نواز ہوائیں بڑے بڑے جواں مردوں کو کمزور اور بے بس کر چکنے کے بعد آج بھی حسنِ دوشیزگی کے اعتبار سے مالا مال نظر آتی تھیں آخر میں وہ تھی اس کی ہندو لونڈی جو گذشتہ سات سالوں سے متواتر و پیہم نہایت صبر و تحمل کے ساتھ کرائسس کو اپنے دیس کی کسبیوں کے محبت کرنے

کے پُرپیچ طریقے سمجھا رہی تھی۔

موسیقی کی طرح محبت کرنا بھی ایک فن ہے۔ موسیقی کی طرح محبت بھی انسان کے دل میں ایسے جذبات و احساسات پیدا کرتی ہے جو نرم و نازک بھی ہوتے ہیں اور ہیجان انگیز بھی بلکہ ان کا تاثر باعتبار وسعت زیادہ ہمہ گیر ہوتا ہے۔ چنانچہ کرائسٹس جو فن محبت یعنی بوس و کنار کی ہر تال اور طریقہ سے اب بخوبی آگاہ ہو چکی تھی اپنی بہت ہی قدر کرنے لگی تھی۔ بے شک وہ اب معبد اعلیٰ کی شہرہ آفاق مغنیہ فلانگو کی نسبت ایک بہتر فنکار تھی۔

فی الحقیقت اپنی زندگی کے سات سال اس نے کچھ اس ڈھب سے گذار دیئے تھے کہ کبھی بھول کر بھی اس کے دل میں اپنی حیاتِ معاشقہ کو زیادہ پُرتنوع اور ہنگامہ خیز بنانے کی آرزو پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن — زندگی کے بیسویں سال کے آغاز سے کچھ پہلے جب وہ ایک نو عمر دوشیزہ سے عورت بنی، اس نے اپنے پستانوں پر پختگیٔ عمر کے اولیں آثار لکیروں کی شکل میں نمودار ہوئے دیکھے اور نتیجۃً ہوسناک ولولے یکایک اس کے دل میں موجزن ہو گئے۔

چنانچہ ایک دن جب وہ دوپہر گذرنے کے دو ساعتیں بعد نیند سے خستہ و ماندہ بیدار ہوئی تو وہ اپنے بستر پر سینہ کے بل کچھ اس انداز دلبری کے ساتھ لیٹ گئی کہ اس کی ٹانگیں ایک دوسرے سے الگ پھیلی ہوئی تھیں اور اس کا رخسار ہاتھ کا سہارا لیے ہوئے تھا اور وہ سبز کتان کے تکیہ میں ایک لمبی طلائی تیلی سے چھوٹے چھوٹے سوراخ بنا رہی تھی۔

سب سے پہلے اس نے چار سوراخ کئے اور ان سے ایک مربع شکل بن گئی اور پھر اس مربع کے وسط میں اس نے ایک نقطہ لگایا۔ بعد ازاں اس نے ایک بڑا مربع بنایا اور پھر نقطوں کی مدد سے جب اس مربع کے گرد اس نے ایک دائرہ کھینچنا چاہا تو وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس پر اسے یکایک طیش سا آ گیا اور وہ تکیہ میں بے تحاشہ سوراخ پر سوراخ کرتی ہوئی

چلائی: "جالا — جالا!"

جالا اس کی ہندو کنیز تھی جس کا اصل نام "جلنانہ چندر شوپالہ" یعنی "پانی میں منعکس چاند کی طرح لحظہ بہ لحظہ بدلنے والی" تھا مگر سہل انگار اور عافیت پسند کراٹسس اسے اس لمبے تڑنگے نام سے نہیں پکار سکتی تھی۔

"جالا! کل میرے ہاں کون آیا تھا؟"

"حضور کو علم ہی ہوگا!"

"نہیں، نہیں، میں نے تو اس کی شکل تک نہیں دیکھی — کیا وہ خوبرو تھا؟ میں تو تمام رات سوئی ہی رہی۔ خستہ و ماندہ تھی نا میں؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں رہا — وہ کب واپس گیا تھا؟ صبح کو نا؟"

"طلوع آفتاب کے وقت اس نے بتایا کہ..."

"وہ کیا دیتا گیا؟ کافی کچھ دے گیا ہوگا؟ نہیں، نہیں اس لینے دینے کے قصہ پر خاک ڈال! مجھے کیا پروا ہے! البتہ یہ بتاؤ وہ کہتا کیا تھا؟ کیا وہ خوش تھا؟ اس کے چلے جانے کے بعد کوئی دوسرا تو نہ آیا ہوگا؟ مجھے میرے کنگن دینا!"

اتنے میں جالا جواہرات کا صندوقچہ لے آئی لیکن مقام حیرت تھا کہ کراٹسس نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کی بجائے وہ اپنی بانہیں اوپر کی طرف اٹھا کر بولی: "آہ، جالا — میری پیاری جالا — میرا من آج غیر معمولی جھوں کے لیے بیتاب ہو رہا ہے۔"

"حضور! ہر انسانی فعل یا تو غیر معمولی ہوتا ہے یا کچھ بھی نہیں۔" جالا نے کمال سنجیدگی سے کہا۔ "زندگی کے سب ایام ایک جیسے ہوتے ہیں!"

"ہرگز نہیں اگرچہ میں پہلے کچھ ایسا ہی محسوس کرتی تھی۔ جانتی ہو دنیا کے ہر دیس میں دیوتا فانی عورتوں سے پریم کرنے کے لیے اترتے رہے ہیں۔ آہ، جالا! اب ان کا انتظار کن خوابگاہوں میں کیا جائے؟ کن بیابانوں میں انہیں ڈھونڈا جائے جو کرۂ ارض کے

مردوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں؟ درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی وہ کون سی پیار تھنا ہے جن کے اثر سے وہ کھچے چلے آتے ہیں؟ آہ، جالا! میری پیاری جالا! بتا وہ دیوتا سمان مرد کہاں ہیں؟ وہ جن کی محبت کے زیر اثر میں دنیا و مافیہا کو بھول سکوں گی؟ اگر ان دیوتاؤں کو اس دھرتی پہ مزید آنا گوارا نہیں یا اگر وہ فنا ہو چکے ہیں یا ان کا جذبہ عشق سرد ہو چکا ہے تو کیا مجھے ان کی محبت اور ان کے پریم سے لطف اندوز ہوئے بغیر ہی مر جانا ہوگا؟ کیا وہ میرے جیون میں عشق و محبت کے المیہ واقعات کا طوفان بپا کرنے نہیں آئیں گے؟"

یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور پھر اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر کے بولی: "جالا! یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی نے مجھ سے عشق کیا بھی تو اس کے ساتھ میری انبساط عشق کی انتہا فقط یہ ہو گی کہ میں اسے اتنا ستاؤں گی، اتنا تڑپاؤں گی کہ وہ آخر وہ مجھ سے بیزار ہو کر موت کو ترجیح دے گا۔ فی الواقعہ جو لوگ آجکل میرے یہاں آتے ہیں وہ اس قابل کہاں ہوتے ہیں کہ ان کو رونے پہ مجبور کیا جائے اور ہاں —— قصور میرا بھی تو ہے کہ وہ جو میرے بلانے پہ میرے ہاں آتے ہیں۔ وہ میرا دل بہلانے کے علاوہ مجھ سے عشق کیوں کریں!"

"سرکار آج کون سا کنگن پہنیں گی؟"

"میں آج اپنے سب کنگن پہنوں گی مگر خدارا! تو یہاں سے چلی جا اور مجھے میرے حال پہ چھوڑ دے! مجھے آج کسی کی ضرورت نہیں —— جا، چلی جا اور دروازہ کی سیڑھیوں پر پہرہ دو اور جو بھی آئے اسے بتا کہ میں —— آج فارغ نہیں ہوں۔ میں آج اپنے ایک حبشی نژاد غلام سے خراجِ محبت وصول کر رہی ہوں۔"

"کیا حضور باہر تشریف نہیں لے جا رہیں؟"

"یقیناً مگر اکیلی! آج تو میں پوشاک بھی خود ہی پہنوں گی۔ آج شاید میں واپس بھی نہ آسکوں، مگر ہاں، تو جا ——" یہ کہہ کر کرائسس بستر سے نیچے اتر آئی اور سینہ تان

کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس اثنا میں جالا چپکے سے باہر چلی گئی اور کرائسٹس کمرے میں چہل قدمی کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ گردن پر کچھ اس انداز سے رکھے ہوئے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ وہ ٹھنڈے مرمریں فرش پر ننگے پاؤں چلنے سے بہت خوش ہو رہی ہے مختصر سی سبک خرامی کے بعد وہ حمام میں چلی گئی۔

یہ حقیقت تھی کہ حمام کے فراخ اور کشادہ تالاب میں تیرنے سے اسے انتہائی سرور حاصل ہوتا تھا۔ تالاب کے فرش پر لیٹے ہوئے وہ اپنے آپ کو اس صدفِ دُربار کی طرح محسوس کرتی جو کسی چٹان پر محوِ استراحت ہو۔ نیلگوں پانی میں اس کے بدن کی جلد جہاں نہایت بے داغ نظر آتی وہاں اس کی ٹانگوں کے خطوط بھی اور زیادہ لمبے معلوم ہوتے۔ اس کا جسم اس قدر ہلکا اور لچکیلا ہو جاتا کہ وہ اسے اپنی انگلیوں پر ٹھہرا سکتی۔ چنانچہ پانی میں وہ اپنے جسم کو انگلیوں کی مدد سے طرح طرح کے ہچکولے دیتی۔ مرمریں فرش کو مختلف زاویوں سے چھوتی اور پانی کی ہلکی ہلکی لہریں بار بار اس کے رخساروں کو چومتیں اور کانوں میں سرگوشیاں کرتیں۔ ــــ اوقاتِ غسل فی الواقعہ کرائسٹس کا اپنے آپ سے والہانہ عشق کرنے کا نشاط آفریں وقفہ ہوتا۔ یکے بعد دیگرے اس کے تمام اعضا اس کے بے پناہ جذبۂ خود پرستی اور طویل ہم آغوشیوں کا موجب بنتے۔ وہ اپنے بدن کے ہر دلفریب حصّہ کا بوسہ لینے کی پرجوش سعی کرتی۔ اس دوران میں وہ اپنے گیسوؤں اور اپنے پستانوں سے ہزار قسم کے دلچسپ کھیل کھیلتی اور بلاشبہ تنہائی میں اس کا یہ عمل اس کی بیشتر لازوال خواہشاتِ نفس کو آسودہ و مطمئن کرنے والا ثابت ہوتا۔

دن ڈھل چکا تھا جب وہ حمام کے تالاب سے نکل کر جھومتی ہوئی دروازہ کی طرف آئی۔ مرمریں فرش پر اس کے بھیگے پاؤں کے نشانات چمک رہے تھے۔ آخر کار اس نے دروازہ کھولا۔ کچھ دیر وہاں بانہیں پھیلائے کھڑی رہی اور بعد ازاں اپنے بھیگے ہوئے برہنہ جسم کے ساتھ اپنے پلنگ کے پاس آ کھڑی ہوئی جالا کو کمرہ میں اپنی منتظر پا کر وہ بولی "مجھے

خشک کرو!"

مالاباری عورت نے سب سے پہلے ایک بڑا اسفنج کرائستس کی پشت پر لہرانے والے نم آلود، نرم اور سنہری بالوں سے پیوست کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بال خشک ہو چکے ہیں تو اس نے انہیں جھٹک کر پھیلا دیا۔ اس کے بعد اس نے روغنِ زیتون میں تر کیا ہوا ایک اسفنج اپنی مالکہ کے نازک بدن پر آہستگی سے رگڑا پھر بدن کو ایک معمولی کپڑے سے صاف کرنے لگی تو کرائستس کی سپید جلد پر ہلکی ہلکی سرخی دوڑنے لگی۔

کرائستس اس کے بعد سنگِ مرمر کی کرسی پر بیٹھ گئی اور جب کرسی کی ٹھنڈی سطح نے اس کے جسم میں کپکپی پیدا کرنا بند کر دی تو وہ آہستہ سے بولی "میرے گیسو سنوارو!"

شام کی ڈھلتی ہوئی روشنی کی افقی شعاعوں میں اس کے بال جو نمی کے باعث ابھی تک کس قدر بوجھل تھے دھوپ میں بارش کی طرح چمک رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے لے کر کنیز انہیں بل دینے لگی۔ کافی بل آ چکتے تو وہ انہیں چھوٹی چھوٹی طلائی سلاخوں پر لپیٹ دیتی اور اس طرح آخر کار کرائستس کے گیسوؤں نے ایک ایسے بل کھائے ہوئے ناگ کی شکل اختیار کر لی جس کے بدن میں تیر ہی تیر پیوست ہوں۔ پھر اس نے بالوں کو ایک سبز ریشمیں فیتہ کے ساتھ گوندھا۔ اس دوران میں کرائستس اپنے ہاتھ میں آئینہ تھامے رہی اور گاہے گاہے سرسری طور پر آئینہ میں جھانک لیتی محض یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ اس کی مشاطہ کے سیاہ فام ہاتھ کس طرح اس کے بالوں کے گچھوں سے اٹھکیلیاں کر رہے ہیں۔ وہ کس طرح اس کی آوارہ لٹوں کو قابو میں لا رہے ہیں اور وہ کس طرح تزئین گیسو کے پیچیدہ فن کو نقاشی کے لطیف ڈھنگ پر نبھا رہے ہیں!

سر کے بالوں سے فارغ ہو کر جالا کرائستس کے سامنے کی طرف دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور زیر ناف حصۂ بدن کی روئیدگی کو صاف کرنے لگی تاکہ کرائستس کے پرستاران حسن کو آج بھی اس کا جسم ایک مرمریں مجسمہ کی طرح بے داغ اور صاف نظر آئے۔

"مجھے پینٹ کرو۔" کرائسٹس نے قدرے اور گھمبیر ہو کر کہا۔

جزیرہ ڈیوس قرلیس کی چوبِ گلاب کی بنی ہوئی ایک صندوقچی میں ہر رنگ اور ہر قسم کا سامانِ تزئین و آرائش موجود تھے۔ جالا نے موشتر کے برش سے تھوڑا سا کالا پینٹ اٹھایا اور کرائسٹس کی خمیدہ ابروؤں پہ لگایا تاکہ تضادِ رنگ کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی نیلاہٹ زیادہ اجاگر ہو جائے۔ پھر اس نے رنگدار کھریا مٹی سے دو ایسے نشان لگائے جن کے اثر سے آنکھوں میں ملائمت اور وسعت کی جھلک پیدا ہو گئی۔ تابدار شنگرف سے دو نشان اس نے آنکھوں کے ان گوشوں پہ لگائے جہاں سے آنسو بہتے تھے۔ اس کے بعد منہ اور پتانوں کی باری آئی۔ کنیز نے ان پہ ایک سفید رنگ کا روغن مَلا جس کا کام غازہ کی مہین تہہ کو جمانا تھا۔ بازوؤں اور گردن پہ کنیز نے ایک کومل پنکھ کی نوک سے سفید دھاریاں کھینچیں۔ منہ اور چوچیوں پہ سرخی لگائی۔ جالا کی مشتاق انگلیاں کرائسٹس کے رخساروں سے فارغ ہو کر اب کمر اور رانوں کے درمیانی حصّہ کی تزئین کی طرف مائل ہوئیں۔ اس کے بعد اس نے کرائسٹس کے کولہوں کے پھڑکنے والے گوشت کے نشیب و فراز کو سنوارا اور اس طرح تزئینِ جسم کا مشغلہ ختم ہو گیا۔

کرائسٹس مسکرائی اور ہندو عورت سے مخاطب ہوئی "مجھے گیت سناؤ!" — اور اس کے بعد وہ سنگ مرمر کی کرسی پہ تن کہ بیٹھ گئی۔

جالا نے جواب میں کرائسٹس پہ ایک سیر حاصل نظر ڈالی۔ کرائسٹس کی گیسو بند طلائی پنوں سے سر کی پشت کی جانب نورانی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ کرائسٹس کی انگلیاں جن کی دلکشی ترشے ہوئے چمکدار ناخنوں کی وجہ سے دوبالا ہو گئی تھی گلے میں کچھ اس طرح حمائل تھیں کہ وہ شانوں اور گردن کے درمیان ہیروں کی مالا معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے پاؤں باہم ایک ساتھ مرمریں فرش کو چھو رہے تھے۔

جالا دیوار سے جا لگی اور اس نے حسبِ معمول ہندوستان کا ایک پریم گیت

دھن میں گانا شروع کیا۔

"واہ رے کرشنا! تیرے گیسو شاخہائے شجر پر محوِ استراحت شہد کی مکھیاں ہیں۔
سمتِ جنوب سے آئی ہوئی گرم ہوائیں تیرے گیسوؤں کو پیار کی شبنم اور گل ہائے شب کے تعطر سے مالا مال کرتی ہیں۔"

کرشنا نے جواباً نہایت شیریں اور آہستہ سُر میں کہا۔

"میرے گیسو! — ہاں میرے گیسو اس لامنتہی ندی کی مانند ہیں جس پر سے شعلہ افشاں شام کا گذر ہوتا ہے۔"

جالاؔ: "تیری آنکھیں نیل کنول ہیں — سطحِ آب پر بے سہارا ساکت کھڑے رہنے والے!"

کرشنا: "میری آنکھیں میری پلکوں کے زیرِ سایہ اُن عمیق جھیلوں کی مانند ہیں جن پر سیاہ رنگ ٹہنیاں سایہ افگن ہوں۔"

جالاؔ: "تیرے لب دو نازک پھول ہیں مادہ آہو کے خون سے آلودہ۔"

کرشنا: "میرے لب زخمِ پُرسوز کے کنارے ہیں۔"

جالاؔ: "تیری زبان خونی خنجر ہے جس نے تیرا زخمِ دہن پیدا کیا۔"

کرشنا: "میری زبان مرصّع ہے سنگ ہائے سے — وہ سُرخ ہے میرے ہونٹوں کے عکس سے۔"

جالاؔ: "تیرے بازو دندانِ فیل کی طرح لہراتے ہیں۔ تیری بغلیں دو منہ ہیں۔"

کرشنا: "میرے بازو لامبی ڈالیاں ہیں کنول کی اور میری انگلیاں پانچ ۵ پنکھڑیاں ہیں اُن سے وابستہ۔"

جالاؔ: "تیری رانیں دو سونڈ ہیں سفید ہاتھی کے اور تیرے پاؤں ان سے

وابستہ سرخ پھول۔"

کرائسٹس "میرے پاؤں دو پنکھڑیاں ہیں سطح آب پر آراستہ کنول کی اور میری رانیں ڈنڈلیں ہیں نرگس کی۔"

جالالا "تیرے پستان دو سپر ہیں نقرئی اور خون آلود خول والے۔"

کرائسٹس "میرے پستان چاند ہیں پانی میں منعکس۔"

جالالا۔ "تیری ناف ایک گہرا کنواں ہے گلابی ریگذار کا اور تیرا شکم سینۂ مادر پہ دراز ایک معصوم بچہ ہے۔"

کرائسٹس "میری ناف ایک گول موتی ہے الٹے ہوئے پیالہ پہ آراستہ اور میرے زیرِ ناف ابھار کے خطوط متشابہہ ہیں تابندہ ہلالِ بیاباں سے۔"

اس کے بعد کچھ دیر مکمل خامشی چھائی رہی حتیٰ کہ کنیز جالالا نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور تعظیماً زمیں پر جھک گئی۔

کرائسٹس نے سلسلۂ ترنم پھر شروع کیا۔

"میں ارغوانی پھول ہوں شہد اور خوشبو سے لبریز۔"

"میں جل ناگن ہوں شب بیدار، نرم و نازک اور پرحیات ۔۔"

"میں ایک سنگین امانگاہ ہوں جہاں مرد منزلِ ممات کی طرف جاتے ہوئے بہرِ استراحت پناہ ڈھونڈتے ہیں۔۔"

سربسجود کنیز بڑبڑائی "آپ ہستی باجبروت ہیں۔ آپ مدعوسہ ثانی ہیں!"

کرائسٹس نے اپنا ایک پاؤں کنیز کی گردن پہ رکھ دیا اور لرزہ براندام بولی "جالالا"

رفتہ رفتہ رات بڑھتی گئی لیکن چاند کی تابانیاں اس قدر تیز تھیں کہ کاشانۂ

کرنسس کا حجرہ جسے وہ بطورِ خلوت گاہ اور آرائش گاہ استعمال کرتی تھی نیلی نیلی روشنی سے بھر گیا۔ اس خواب آلود ماحول میں کرنسس نے اپنے برہنہ اندام پر ایک بھرپور نظر ڈالی تو وہ ایک لمحہ کے لیے دم بخود ہوگئی۔ اس کا سڈول جسم بیک وقت ساکت روشنیوں اور نہایت اندھیارے سایوں کی دلآویز جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔

وہ یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"جالا! تو کس چیز کے بارے میں سوچ رہی ہے؟ رات آگئی اور میں اب تک باہر نہیں گئی! گودی بندر پر اب خوابیدہ ملاحوں کے سوا کوئی نہ ہوگا۔ میری جالا! مجھے بتا کیا میں خوبصورت ہوں؟ پیاری جالا! مجھے بتا کیا میں اس رات سے پہلے کبھی اتنی حسین و دلکش نظر آئی تھی؟ کیا تو جانتی ہے میں اسکندریہ کی تمام عورتوں سے زیادہ حسین و جمیل ہوں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ آج جو بھی میری ترچھی نظر کی زد میں آئے گا سگِ دیوانہ بن کر میرا پیچھا کرے گا؟ کیا یہ سچ نہیں کہ اس آدمی سے میں جو چاہوں سلوک کر سکوں گی؟ خواہ اسے میں حلقہ بگوش غلام ہی کیوں نہ بنا لوں! میں آج اس قابل ہوں کہ جسے چاہوں اپنا دیوانہ بنا لوں میں آج دنیا کے ہر مرد سے انتہائی غلامانہ، اطاعت مندی کی توقع کر سکتی ہوں! جالا! مجھے کپڑے پہنا!"

کرنسس کی باہوں پر نقرئی ناگ لپیٹ چکی تو جالا نے پاپوش پہنائے اور ان کے چرمی تسمے اس کی خاکستری پنڈلیوں سے باندھ دیئے۔ گرم گرم کمر پر پٹکے کے بکسوئے کرنسس نے خود کسے۔ پٹکا آن کی آن میں کولہوں کی اٹھان سے رانوں کے نشیب پر آراستہ ہوگیا۔ اس کے بعد کانوں میں بڑے بڑے حلقے پہنے گئے، اور انگلیوں میں انگشتریاں اور مہریں ڈال دی گئیں گلے میں اس نے وہ تین زنجیریں ڈالیں جن کی کڑیاں شونگی طرز کی تھیں اور جو پافوس کی بیواؤں کی خاص صنعت کا نمونہ تھیں۔

جواہرات میں آراستہ برہنہ جسم کا ایک بھرپور جائزہ لے کر اس نے زرد کتان کا وہ مہین

لبادہ زیب تن کیا جو اس کے سینہ کی بلائیں لیتا ہوا پاؤں تک پہنچتا تھا۔ لبادہ کی آڑھی ترچھی تہوں سے اس کے جسم کا بہت کم حصّہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا ایک بازو چست لبادہ میں سے باہر نکلا ہوا تھا اور دوسرا جو لبادہ میں سے بالکل باہر تھا دامن کو سنبھالے ہوئے تھا تاکہ وہ گرد آلود زمین پر نہ ڈھلک جائے پروں کا ایک بادکش ہاتھ میں لے کر وہ مستانہ وار چل پڑی۔

دہلیز کی سیڑھیوں پر ایستادہ، ایک ہاتھ سپید دیوار پر رکھے جاآلا نے اپنی مالکہ کو باہر نکلتے نہایت غور سے دیکھا۔ سامنے کی نورِ ماہتاب میں نہائی ہوئی سنسان سڑک پہ وہ مکانوں کے سامنے سے گذر رہی تھی اور ایک مختصر و متحرک سایہ اس کے عقب میں کانپ رہا تھا۔

گودی پر

اسکندریہ کی گودی پر ایک لڑکی کھڑی گا رہی تھی۔ پاس ہی گودی کی سفید منڈیر پر دو نَے بدست دوشیزائیں بانسری بجا رہی تھیں۔

(۱)

"وہ دیکھو! اساطیر دیوتا کپکپاتے سایوں اور سورج کی شعاع ریزی سے متاثر جنگلی روشوں پہ آہستہ خرام دیو مالاؤں کا پیچھا کر رہے ہیں، حورانِ کہسار کی آنکھوں پر خوف طاری ہے۔ بوالہوس اساطیر ان نازک اندام پریوں کو بہت ستا رہے ہیں۔ گاہے ان کے نوخیز پستانوں کو چھیڑ رہے ہیں گاہے ان کے لہراتے ہوئے بالوں کو ——

"وہ دیکھو! شہوت ران اساطیر نے حوران کہسار کو جبراً شبنمی سبزہ فرش پر لٹا لیا۔ بے بس پریوں کے کومل گداز اور نیم سماوی بدن درد سے کراہ رہے ہیں۔

اے عورت! عیروس دیوتا کی ممنون کرم ہو کہ جس کی بدولت تیرے ہونٹوں پر آرزوے وصل کی شیریں اور دلگداز التجائیں منت کش اظہار ہوتی ہیں ——"

اس پر نَے بدست دوشیزاؤں نے "عیروس عیروس" کی صدا لگائی اور ان کی بانسریوں سے گریہ آمیز سُریں نکلیں۔

(۲)

"حسن و جمال میں اپالو کا ثانی عَطبس اس جرم میں اپنی عاشق سائبلہ کے زیر عتاب ہے کہ اس نے سائبلہ کے دل کو تو اپنی محبت سے معمور کیا لیکن اس کا اپنا دل ولولہ عشق کی پذیرائی سے عاری رہا ——

اے سنگدل دغا باز عیروس! محبت کی بجائے حقارت تیری فطرت کا راز ہے۔
دیکھ! سائبلہ کس طرح عطیس کی خاطر چمن زاروں اور بیابانوں میں سرگرداں ہے۔
نغمات فنا اس کے لبوں پہ ہیں اور وہ خود ہی اپنی آرزوں اور تمناؤں کا گلا دبا
رہی ہے ——"

"عیروس! عیروس!" بانسریاں چلائیں۔

(۱۲)

"نرسل دیوی سرنیکس کو دیکھو! اپنے ہوس پرست طلب گار بزباؤں سے ترساں
گل پوش مرغزار سے نکل کر کنارِ دریا پر اپنے آبی مدفن کی جانب رواں دواں ہے۔
وہ بالآخر ڈوبنے لگی تا آنکہ عیروس نے اسے عشق دریا سے اٹھایا! اس کے رخساروں
کو چوما، گلے لگایا اور پیار کیا اور وہ جو بزباؤں سے گریزاں تھی بالآخر نغمات سے
بھرپور نئے کی شکل میں نمودار ہوئی ——
لاریب! عیروس جو فاتح معبودانِ ارض و قاتلِ مرگ ہے ہمارا بھی حاکم ہے ——!
اے عورت! دیکھ، غور کر! عیروس نے کس شان اور کس اعجازِ مسیحائی سے بے
جان بانسری کو تیری خواہشاتِ نفس کی ترجماں بنا دیا ——"

بانسریاں گیت کا آخری بند ابھی آہستہ اور ہلکے سُر میں الاپ ہی رہی تھیں کہ مغنیہ نے ہاتھ بڑھایا اور راہگیر تماشائیوں سے چار الوآل لے کر اپنی پازیب میں رکھ لیے ——
سماع نواز ہجوم مغنیاؤں کو تکتا ہوا آہستہ آہستہ گذر رہا تھا۔ ہجوم کی آمد و رفت اور ہاؤ ہو کا شور سمندر کے شور پر حاوی تھا۔ ملاح بڑی شد و مد کے ساتھ اپنی مستول کشتیوں کو گودی میں لنگر انداز کرنے میں مشغول تھے۔ بھکاری ہاتھ پھیلائے صدائیں لگا رہے تھے۔ باربردار گدھے اپنی پیٹھوں پر چرمی بوتلیں اٹھائے اپنے مالکوں کے آگے آگے سہمے سہمے چل رہے تھے۔ غروبِ آفتاب کا سماں تھا اور ہر طرف سیر و تفریح کے دلدادگان کی ریل پیل تھی جو تعداد میں خوانچہ داروں،

مغنیوں اور دیگر تجارت پیشہ لوگوں سے زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ جگہ جگہ نظر باز مرد پرے جمائے کھڑے تھے۔ اور شوقین مزاج عورتیں ان جمگھٹوں میں آزادانہ پھر رہی تھیں۔ اس قدر گھری بھیڑ کے باوجود بستی کے مشاہیر کو لوگ پہچاننے سے نہ چوکتے۔ نوجوان طبقہ فلسفیوں کو اور فلسفی لوگ محوِ خرام بیواؤں کو تک رہے تھے۔

وہاں پہ آج ہر قسم اور ہر عمر کی نوربطینہ ایئں موجود تھیں۔ ریشمیں ملبوساتِ زربفت میں لپٹی ہوئی ہر دلعزیز حسیناؤں سے لے کر جامہ دریدہ، برہنہ پا عورتوں تک بایں ہمہ باعتبار جمال افلاس امارت سے فروتر نہ تھا۔ فرق تھا تو یہ کہ وہ کم خوش نصیب تھیں ورنہ اہلِ بصیرت کے نزدیک تو صرف وہی عورتیں قابلِ ترجیح تھیں جن کا حسن و جمال بھڑکیلے لباس اور جواہرات کی جمال آفرینی سے مستغنی تھا۔ آج ربۃ الفرودت کی شامِ جشن تھی اور اس تقریبِ سعید کے طفیل عورتوں کو مکمل آزادی تھی کہ وہ روزمرہ کے رواج اور دستور سے ہٹ کر اپنی اپنی پسند کا لباس زیبِ تن کریں چنانچہ آج کئی عورتیں ایسی بھی نظر آ رہی تھیں جن کی عریانی ہی ان کی پوشاک تھی اور لطف یہ تھا کہ یہ عریانیاں کسی کو بھی شاق نہیں گزر رہی تھیں کیونکہ اہلِ نظر یہ بخوبی جانتے تھے کہ صرف بے داغ اور دلفریب جسم رکھنے والی عورتیں ہی بے دھڑک برہنہ سرِ عام پھر سکتی تھیں اور پھر ایسے حالات میں جب کہ شادی شدہ عورتیں حسد کی بنا پر اعلیٰ سے اعلیٰ حسن کا مذاق اڑانے سے گریز نہ کرتی تھیں۔

"ظر الفرہ! ظر الفرہ!" ایک چلبلی جوان نوربطینہ ہجوم کو چیرتی ہوئی اپنی ایک دوست کی طرف بڑھی "ظر الفرہ! کیا تم بھی مدعو ہو؟"

"کہاں؟ سیلسو؟"

"بخیتث کے ہاں؟"

"نہیں تو۔ کیا اس نے کوئی ضیافت کی ہے؟"

"ضیافت! میری جان! بہت بڑی ضیافت! وہ ضیافت کے دوسرے دن اپنی

حسین ترین کنیز الفردوسیہ کو آزاد کر رہی ہے!"

" بالآخر بخیت نے سمجھ ہی لیا کہ اس کے ہاں مرد اس کے لیے نہیں بلکہ اس کی خادمہ کی خاطر آتے ہیں!"

" میرا خیال ہے وہ اس وجہ سے ایسا نہیں کر رہی یہ سب کچھ بڈھے جہاز ساز چریز کے لیے کیا جا رہا ہے، وہ اس چھوکری کو دس مینائیوں کے عوض خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے بعد میں بیس مینائیوں کی بھی پیش کش کی مگر بخیت نہ مانی۔"

" لالچن کہیں کی!"

خود میرا بھی یہی خیال ہے مگر ہاں، سُنا تو نے! کنیز کی رسم آزادی اندرون خانہ ہی منعقد کی جا رہی ہے، شاید اس طرح بخیت کو مزید سودا بازی کا موقع مل جائے گا، تب تو چریز اُسے شاید تیس ۳۰ مینائیاں دینے پر بھی رضامند ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے اس قیمت پر وہ اپنی کنیز کو ضرور آزاد کر دے گی۔"

" الفردوسیہ کا باپ گورا تھا۔"

" مگر ماں سیاہ فام حبشن!"

" بخیت مصر ہے کہ وہ اسے کم قیمت پر نہ دے گی۔ ادھر بڈھا چریز بھی اس چھوکری کے عشق میں مرا جا رہا ہے۔"

" چریز کو ضیافت پر تو ضرور بلایا ہو گا؟"

" بالکل نہیں۔ اور ہاں، سنا تو نے الفردوسیہ کو ضیافت میں پھلوں کے بعد بطور آخری ڈش پیش کیا جائے گا۔ ہر مہمان حسب خواہش اُس سے لطف اندوز ہو گا اور اس سے اگلے روز اُسے چریز کے حوالے کیا جائے گا۔ مجھے ڈر ہے وہ اس وقت تک نہایت خستہ و درماندہ ہو چکی ہو گی۔"

" ابھی گھبراؤ نہیں! بڈھے چریز کی آغوش میں چھوکری کو تازہ دم ہونے کا کافی موقع مل

جائے گا۔ سیتسو! میں چپر یز سے خوب واقف ہوں۔ کم بخت دیکھتے ہی دیکھتے خراٹے بھرنے لگتا ہے!"

اس پر وہ دونوں کھل کھلا کر ہنس دیں۔ چپر یز کا خوب مذاق اڑا چکیں تو انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کی توصیف و ستائش شروع کر دی۔

"بہت ہی نفیس عَبا ہے تمہاری!" سیتسو بولی۔ "زرکاری تو گھر پہ ہی تو نے کی ہو گی؟"

"طرالفرہ کی مہین سنہری مائل عبا جس پر ایک بڑا سا گُلِ سوسن کشیدہ تھا اس کے سڈول کندھوں سے ہو کر ایک گلوبند کی طرح پستانوں کے درمیان سے کمربند تک کچھ اس انداز میں چلی گئی تھی کہ طرالفرہ کی داہنی جانب بالکل برہنہ تھی اور نیچے کی طرف عَبا کا گام گام پہ کھلنے اور بند ہونے والا شگاف قورطیترہ کے ساقِ بلوریں کی دعوتِ نظارہ عام کر رہا تھا۔

"سیتسو!" کسی نے آواز دی۔ "سیتسو اور طرالفرہ! تم لوگ بیکار ہو، تو آؤ میرے ساتھ چلو! میں تو اپنا نام دیکھنے فصیل تک جا رہی ہوں —"

"ماؤسارَیہ! اری تو کہاں سے ٹپک پڑی؟"

"منار سے آ رہی ہوں۔ وہاں کوئی نہ تھا!"

"کیا کہا، شکار کے لیے تو دنیا میں وہ بہترین جگہ ہے۔"

"مجھے تو وہاں کوئی نہیں ملا۔ اس لیے تو میں اب فصیل کی طرف جا رہی ہوں۔ آؤ چلیں!"

چلتے چلتے سیتسو نے بخیشؔ کی ضیافت والی بات دوبارہ بیان کی تو ماؤسارَیہ چلائی۔ "اوہ، بخیشؔ! اری کیا تم لوگوں کو بخیشؔ کی پہلی ضیافت یاد ہے، سب لوگ کرآسس کی چغلی کھا رہے تھے!"

"یاد کرنے سے فائدہ، سیتسو تو کرآسس کی گہری دوست ہے!"

ماؤسارَیہ کو اپنی طنز آمیز بات کا بہت افسوس ہوا۔ سیتسو نے جو ایک دم غمگین ہو گئی

تھی نے پوچھا "ذرا بتلانا کیا کیا باتیں ہوئی تھیں ؟"

"اوہ! نہ پوچھ۔ نہایت گھٹیا قسم کی معاندانہ باتیں سننے میں آئیں۔"

"وہ جو چاہیں بکواس کریں۔ اس میں کلام نہیں کہ ارٹمس ہر لحاظ سے، ہر اعتبار سے ہم سب پر فائق ہے۔" سیسو نے زوردار لہجہ میں کہا۔ "میں کہتی ہوں اگر اپنا دائرہ نشاط چھوڑ کر وہ کبھی روز ہمارے علاقہ میں آنکلے تو یاد رکھو، ہمیں کسی اور دیس کو نکل جانا پڑے گا۔ کوئی ہمیں مفت میں بھی قبول نہ کرے گا۔"

"کیا واقعی ؟"

"واقعی! میں اس عورت کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ یقین کرو حسن میں یہاں اس کا کوئی جواب نہیں!"

وہ سب اب اس سفید فصیل کے پاس پہونچ چکی تھیں جس کے اس سرے سے اس سرے تک عبارتیں ہی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ جب کسی مرد کو کسی خاص قورطیزہ کی خواہش ہوتی وہ اس کا نام، اپنا نام اور معاوضہ فصیل پر لکھ دیتا۔ طلب گار اور وعدہ معاوضہ حسب منشا اور معقول ہوتے تو وہ مخصوص قورطیزہ اپنے سے متعلق عبارت کے نیچے کھڑی ہو کر اپنے عاشق کا انتظار کرتی۔

"ادھر دیکھو! سیسو!" طراطفرہ نے قہقہہ مار کر کہا "کسی من چلے نے کیا ستم ڈھایا ہے!"

اس پر سب نے مل کر جلی حروف میں نوشتہ عبارت پڑھی۔

بخیت / تھرسایت / دُو ابوال

"عورت ذات سے اس قدر بھونڈے مذاق کی قانوناً ممانعت ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا مذاق مجھ سے کیا گیا ہوتا تو جانے اب تک میں نے کیا کر دیا ہوتا!"

چند قدم آگے سیسو فصیل پر ایک عبارت غور سے پڑھ رہی تھی۔ جو قدرے سنجیدہ

اور معقول تھی۔

سیستو — منائیڈس والی
طائمن ابن لیباسس } یک مینا

اپنے متعلق عبارت پڑھ کر سیستو قدرے شرمائی لیکن جرأت کر کے بولی "میں تو ٹھہروں گی!" — اور وہ وہیں دیوار سے پشت لگا کر کھڑی ہو گئی اور اس کی سہیلیاں اس پر رشک آمیز نظریں ڈالتی ہوئی اس کے آگے سے گزرنے لگیں۔

تاریکی بڑھ رہی تھی اور گودی کا ہجوم آہستہ آہستہ منتشر ہو رہا تھا۔ البتہ مغنیہ اپنی دو نے نواز ساتھیوں کے ساتھ اپنے اڈہ پہ بدستور کھڑی تھیں یکایک ایک اجنبی کو جس کا بہیٹ اور لباس قدرے مضحکہ خیز تھا، اپنی جانب آتے دیکھ کر طرالفرہ نے کہا "آپ — آپ اسکندریہ کے نہیں معلوم ہوتے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو، کمسن حسینہ! تمہارا قیاس درست ہے، واہ بھئی کیا شہر ہے! کیا لوگ ہیں!"

"کیا آپ بباسطس کے ہیں؟"

"نہیں میں قصبہ کا رہنے والا ہوں۔ میں یہاں اناج بیچنے آیا تھا۔ دیوتاؤں کا شکریہ! مجھے باون مینائی کا فائدہ ہوا۔ نہایت اچھا سودا رہا۔"

طرالفرہ کو دفعتہً وہ سوداگر ایک نہایت دلچسپ انسان معلوم ہونے لگا —

"میری بچی!" وہ قدر جھینپ کر بولا "تو مجھ پر ایک کرم کر۔ میں قصبہ واپس نہیں جاؤں گا تاآنکہ میں اس قابل نہیں ہو جاتا کہ واپسی پر اپنی بیوی اور تین بیٹیوں کو یہاں کی عظیم ہستیوں کا حال نہ سنا سکوں۔ ان عظیم المرتبہ شخصیتوں سے تو ضرور واقف ہو گی!"

ان میں سے چند ایک سے! طرالفرہ نے زیر لب متبسم ہو کر کہا۔

"خوب! تو مجھے بتانا جب ان میں سے کوئی ہمارے پاس سے گذرے۔ مجھے یقین ہے کہ گذشتہ دو دنوں میں کئی مشہور و معروف مدبروں اور بارسوخ کارپردازان حکومت کو میں نے ان

راستوں پر دیکھا ہو گا۔ افسوس میں انہیں پہچان نہ سکتا تھا۔"

"خاطر جمع رکھیں، میں اس کا خیال رکھوں گی۔ دیکھئے وہ رہے حضرتِ نقراط!"

"نقراط کون ہے؟"

"وہ فلسفی ہے!"

"وہ کیا سکھاتا ہے؟"

"بہتر ہو گا ہم اس کا ذکر نہ چھیڑیں۔۔۔۔۔"

"ربِ فیبوس کی قسم! تو ٹھیک کہتی ہے۔ اس کی تعلیم کے بارے میں خموشی ہی مناسب ہے۔ مجھے تو اس سے نفرت ہونے لگی۔"

"وہ رہا فراسیلاس!"

"کیا ہے وہ؟"

"ایک پاگل!"

"تو پھر اس کی طرف اشارہ کرنے سے تمہارا مدعا؟"

"کیا عرض کروں، لوگ اُسے عظیم ہستی مانتے ہیں!"

"آخر وہ کیا شے ہے؟"

"وہ ہر بات مسکرا کر کہتا ہے تاکہ اس کے مخاطبین کو اس کی تمام بے راہ رویاں، غلط کاریاں اور گمراہیاں جائز اور پیش پا افتادگیاں معقول معلوم ہوں۔ اس کا یہ رویّہ نا معقول نہیں کیونکہ ہر کوئی اس کی باتوں پر ایمان لے آتا ہے۔"

"بنیوس! میں کچھ نہیں سمجھا۔ بہر کیف فراسیلاس خاصہ مکار انسان معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ رہا فلاتاس!"

"ماہرِ علم الحرب؟"

"جی نہیں! ایک لاطینی شاعر جو یونانی زبان میں شعر کہتا ہے!"

"وہ میرا دشمن ہے! اسے دیکھ کر مجھے بے حد رنج ہوا!"

اس مرحلہ پہ ہجوم میں یکایک ایک کھلبلی سی مچ گئی اور ہر فرد کی زباں پہ ایک ہی نام تھا—

"دماطریس.... دماطریس!"

طراتقرہ جو ایک ستون کے سہارے کھڑی تھی، سوداگر سے مخاطب ہوئی "دماطریس۔ وہ دماطریس ہے۔ آپ یہاں کی نامور ہستیوں کو دیکھنا چاہتے تھے نا؟"

"دماطریس— ملکہ کا عاشق! تو اس کے متعلق مجھے کچھ نہ بتا!"

"آپ خوش قسمت ہیں۔ وہ کبھی باہر نہیں آتا۔ میں جب سے اسکندریہ میں آئی ہوں میں نے اسے پہلی دفعہ گودی پہ دیکھا ہے۔"

"کون سا ہے وہ؟"

"وہ — وہ نیلی پوشش جو جھکا ہوا بندرگاہ کو دیکھ رہا ہے!"

"وہ ٹھیک طرح نہیں نظر آ رہا۔ وہ بیٹھ کیوں کھڑا ہے نا؟"

"آپ جانتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ ایک عظیم بت تراش ہے جس کے سامنے ملکہ معبد اعلیٰ کے مجسمۂ الفرودت کے لیے بطور نمونہ بیٹھی۔"

"لوگ اسے شاہی عاشق بھی کہتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے ملکِ مصر اس کی مٹھی میں ہے۔"

"حسن و جمال میں وہ آپ اپنا ثانی ہے۔"

"وہ دیکھو! اب اس نے ہماری طرف رُخ موڑا۔ خوش ہوں کہ میں یہاں آیا۔ اب میں بتا سکوں گا کہ میں نے دماطریس کو دیکھا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ سنا ہے کوئی عورت اس کی آرزوئے طلب کو رد نہیں کر سکتی۔ جہان بھر میں اس کے معاشقوں کا چرچا ہے۔ کیا ملکہ کو اس کے معاشقات کا علم نہیں ہے؟"

"ہے ملکہ کو سب باتوں کا علم ہے مگر اپنی بے پناہ محبت کے باعث اس میں تابِ شکایت کہاں؟ وہ ڈرتی ہے کہیں وہ ناراض ہو کر رہوڈز میں اپنے استاد فراقرآط کے پاس واپس نہ چلا جائے۔ وہ اتنا ہی بااختیار ہے جتنا ملکہ نے اسے بنا رکھا ہے۔"

"حیرت ہے کہ اس کے باوجود وہ مسرور و شاداں نہیں نظر آتا۔ وہ غمگیں و افسردہ کیوں معلوم ہوتا ہے؟ کاش میں اس کی جگہ ہوتا تو ہمیشہ خوش رہتا! اے کاش! فقط ایک شب کے لیے میں دماطرؔیس بن سکوں!"

سورج ڈوب چکا تھا۔ عورتیں اس مرد کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں جو اسکندریہ کے طبقۂ اناث کا مشترکہ خواب تھا۔ دوسروں کے دل و دماغ میں پیدا کیے ہوئے ہیجانِ جذبات سے بیگانہ وہ گودی کی منڈیر کے پاس کھڑا نے بدست لڑکیوں کی نغمہ سنجیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ آخرکار یہ سلسلۂ رقص و سرود ختم ہوا تو وہ لڑکیاں اپنی بانسریوں کو کندھوں پر لٹکا کر بستی جانے کی غرض سے ہجوم میں آملیں۔ چلتے چلتے مغنی لڑکی نے اپنی نَے نواز سہیلیوں کی گردنوں میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔

رات قدرے اور بڑھی تو دوسری عورتیں بھی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اسکندریہ کی طرف روانہ ہونا شروع ہو گئیں۔ مَردان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ دماطرؔیس کے قریب پہنچ کر سب کے سب چند لمحوں کے لیے ٹھہر جاتے اور اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے۔ سب سے آخر میں دماطرؔیس کے سامنے سے ایک عورت گذری جس نے چلتے چلتے ایک پھول اس پر پھینکا اور پھر مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

رفتہ رفتہ گودی پر سکوت چھا گیا۔

دماطریس

نئے نواز لڑکیاں جا چکیں تو گودی کی منڈیر پہ ان کی جگہ دماطریس بہت دیر تک خاموش کھڑا سمندر کے شور، جہازوں کی چرچراہٹ اور بادِ شب کی سرسراہٹ کو نہایت غور سے سنتا رہا۔ کچھ دور بستی پر شفاف چاندنی ایک تابدار بادل کی مانند چھائی ہوئی تھی۔ نوجوان کی نگاہیں جانے کیوں بار بار دھول کے ان بادلوں کی طرف جا رہی تھیں جو نئے نواز لڑکیوں کی قبائیں اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھیں۔ ان میں سے بڑی اسے خاصی جاذبِ نظر معلوم ہوئی تھی جب کہ چھوٹی میں اسے کوئی خاص دلکشی نظر نہ آئی تھی۔ چونکہ وہ بدصورتی کے تصور تک کو گوارا نہیں کرتا تھا اس لیے وہ چھوٹی کے خیال تک سے گریزاں تھا۔ بہرکیف گودی پر کھڑے کھڑے اس کی نظر اچانک اپنے قدموں میں پڑی ہوئی ایک چمکدار شے پہ پڑی جو اس نے بالآخر اٹھا لی۔ وہ شے ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ایک کتبہ نما تختی تھی جس کے ساتھ ایک نقرئی قلم وابستہ تھا۔ کسی نے تختی کی بوسیدہ مومی سطح پر چند حروف بار بار کندہ کرنے کی کوشش میں تختی کی زیریں سطح کو بھی زخمی کر دیا تھا۔ تختی کی عبارت تین الفاظ پر مشتمل تھی۔

"مرطیس عاشقِ رعودصیلہ"

وہ لوحِ محبت، جانے ان دو لڑکیوں میں سے کس کی تھی؟ جانے ان دونوں میں محبوبہ کون تھی اور عاشق کون؟ وہ تختی کی اصل مالکہ کے متعلق ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ معاً اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اس تختی کو جو فی الحقیقت کسی بھولی بسری محبت کی یادگار معلوم ہوتی تھی ان دونوں نئے نوازوں کے حوالے کر دے باوجودیکہ شہر میں اس وقت ان کا ڈھونڈ لینا آسان نہیں تھا اور پھر ایسی حالت میں جب کہ وہ اُن دونوں میں کسی قسم کی دلچسپی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ آخرکار اس نے وہ تختی نہایت لاپروائی سے سمندر میں پھینک دی۔ سطحِ بحر پہ تختی کے ٹکراتے ہی

ایک شور سا پیدا ہوا مگر اس شور کے ختم ہوتے ہی بندرگاہ کی گودی پر سکوت دوبارہ مسلط ہو گیا۔

سرد سر منڈیر پر بیٹھے بیٹھے آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے ماضی کو یکسر بھول جائے اور صرف مستقبل کے متعلق سوچے۔ جانے زندگی سے اسے وحشت کیوں ہونے لگی تھی؛ وہ گھر سے اب صرف اس وقت نکلتا جب زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیاں ماند پڑ جاتیں اور عین اس وقت وہ واپس روانہ ہوتا جب ملاح نیند سے جاگ اُٹھتے اور باغباں بستی کے باغات کا رُخ کرتے۔ حقیقت یہ تھی کہ رات کی سکون پرور خوابیدہ فضا میں اپنے سراپا کو لیے پھرنے کا لطف آگیں مشغلہ وہ ایک مدت سے اختیار کیے ہوئے تھا اور آج اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کونسا دن تھا جب اس نے آخری دفعہ دوپہر کے سورج کو آسمان پر جلوہ فگن دیکھا تھا؛ وہ زندگی کے ہنگاموں سے حد درجہ بیزار ہو چکا تھا۔ خاص طور پر ملکہ سے اس کا جی بے حد اچاٹ ہو چکا تھا۔

آج رات تو اسے اپنے ان جذباتِ فخر و مسرت کو سمجھنا بھی محال ہو رہا تھا جو تین[۳] سال پیشتر اس کے دل میں ملکہ سے اولیں ملاقات کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ ملکہ نے اُسے اس کے فن سے زیادہ اس کی جواں مردی کی بنا پر اپنے ہاں بلوایا تھا اور وہ جوں ہی بابِ قصرِ شاہی پر پہنچا تھا نقرئی گھنٹیوں کی آوازوں نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔

اس شاہانہ استقبال سے متعلق یادیں اس کے دل میں اکثر انگڑائیاں لیتیں مگر وہ تھا کہ ان شیریں اور لطیف یادوں سے بھی رفتہ رفتہ متنفر ہو گیا تھا۔ قصرِ شاہی میں اس کے پہنچتے ہی ملکہ نے نہایت التفاتِ خسروانہ سے اسے اپنی اس خلوت گاہ میں بلوا بھیجا جو تین[۳] مزین و آراستہ شور بند حجروں پر مشتمل تھی۔ ملکہ نہایت شاہانہ تمکنت کے ساتھ ایک سبزی مائل سیج پر دراز تھی۔ سیج کی چمکدار ارغوانی سطح کے پس منظر پر ملکہ کے سیاہ بالوں کی جاذبیت کو چار چاند لگ رہے تھے اس کے جوان و رعنا جسم پر عریانی کی حد تک مہین اور باریک لباس تھا۔ یہ ہوائی لبادہ ملکہ نے خاص طور پر اپنی موجودگی میں ایک فراعنی قرطیزہ سے بنوایا تھا۔۔۔ مائلِ محبت عاشق کی لمبی دست درازیوں کی خاطر اس لبادہ میں مختلف جگہوں پر بائیس[۲۲] سوراخ رکھے گئے تھے خواہ تمام رات

ملکہ سے پیار کیجیے اور اپنے عاشقانہ تخیل کے تمام تر خوابوں کو پورا کیجیے مگر ان سوراخوں کی موجودگی میں ملکہ کے بدن سے اس لبادہ کو اتارنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ ملکہ کے حضور میں پہنچتے ہی دماطریس نے تعظیماً جھک کر ملکہ کے ننھے منے پاؤں کو کچھ اس انداز میں اپنے ہاتھوں میں لے لیا گویا وہ ایک ایسی کومل اور مدھر شے تھے جنہیں بوسہ دینا دماطریس پر لازم تھا۔ چنانچہ جب وہ ملکہ کے پاؤں چوم چکا تو وہ تن کر کھڑی ہو گئی اور اس کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ کچھ اس تجاہل عارفانہ سے اپنی پوشاک اور زیورات اتارنے لگی گویا وہ ایک اطاعت کیش حسین و جمیل کنیز تھی جو باکمال رضا و رغبت کسی بت تراش کا ماڈل بننے پر آمادہ و طیار تھی۔ غرضیکہ وہ بالکل برہنہ ہو کر آخر کار اپنے ہاتھوں کو کندھوں کی طرف اٹھا کر اپنے مہمان بت تراش کے سامنے بغیر کسی جھجک اور حیا کے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے بالوں میں گندھی ہوئی مرجان کی لڑیاں اس کے رخساروں پر سایہ افگن تھیں۔

وہ ایک بطلیموسی باپ اور اس نامور شامی شہزادی کی بیٹی تھی جس کی والدہ استارطہ اپنی زندگی میں تقریباً تمام دیوتاؤں سے وابستہ رہ چکی تھی اور جسے اہل یونان الفرودت کے نام سے پکارتے تھے بے شک دماطریس اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا اور وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ملکہ مصر کو اپنے اولمپیں نسل ہونے پر بے حد ناز تھا۔ چنانچہ اُسے مطلقاً کوئی حیرت محسوس نہ ہوئی جب ملکہ نے بلے حرکت کھڑے کھڑے دفعتہً اعلان کیا۔

”میں استارطہ ہوں۔ سنگ مرمر اور تیشہ سنبھال اور مجھے حسن پرست مردانِ مصر کے سامنے آشکارا کر۔ میری مورتی کی پوجا ہو گی!“

دماطریس نے جو اسے کافی دیر سے بنظر غائر دیکھ رہا تھا اور بالآخر سمجھ گیا تھا کہ ملکہ کے نوخیز جسم کی ہوسراں رعنائیوں کا اصل سبب کیا تھا۔ ملکہ کو یکایک اپنے بازوؤں میں بھینچ کر کہا۔ ”میں اس مورتی کا پہلا پجاری ہوں!“

اس والہانہ اظہار شیفتگی پر ملکہ جھینپ گئی لیکن کسی قسم کی رنجیدگی ظاہر کیے بغیر اس کی گرفت سے نکل کر بولی۔ ”کیا تو اپنے تئیں ایڈونیس سمجھتا ہے جو تجھے دیوی کو چھونے کی

جرأت ہوئی؟"

"ہاں!" اس نے جواباً کہا اور وہ اُسے پیار بھری نظروں سے تکتی ہوئی بولی "تو درست کہتا ہے!"

اس وقت کے بعد وہ ایک نہایت غیر معمولی انسان بن گیا۔ اس کے بہترین دوست اور ہمدرد اس سے کنارہ کر گئے۔ البتہ عورتیں اس پر جان چھڑکنے لگیں۔

جب وہ قصر شاہی کے دالانوں سے گذرتا تھا تو کنیزیں اسے دیکھتے ہی دم بخود ہو جاتیں مقربات دربار سناٹے میں آجاتیں اور اجنبی عورتیں تو اس کی سخن طرازیوں کو نہایت شوق سے سنتیں کیونکہ اس کی آواز میں ایک سحر تھا۔ وہ جب بھی ملکہ کو تخلیہ میں ملنے جاتا تو عورتیں مختلف حیلے بہانوں سے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کرتیں وہ جب بستی کی گلیوں میں سے گذرتا تو اس کے چُغہ کی جیبیں آشفتہ سر حسین عورتوں کے رُقعاتِ محبت سے بھری جاتی تھیں۔ ان رُقعات پر عموماً طالبِ عشق عورت کا نام اور چند دوسرے کلماتِ شوق و اضطراب لکھے ہوتے تھے مگر وہ نہایت بیدردی سے ان ہیزار کن پیغامات کو ضائع کر دیتا۔ لیکن جب اس کی تراشیدہ الفرودیت معبد میں نصب کی گئی تو اس کی خواہاں خواتین کا ایک انبوہِ عظیم اس کا نام پڑھنے کے لیے مجسمہ کی طرف اُمڈ پڑا تاکہ نام جان لینے کے بعد وہ اپنے منتخب و محبوب زندہ دیوتا کے حضورِ اقدس میں فاختاؤں اور گلہائے گلاب کے ہدایا پیش کر سکیں۔

جلد ہی اس کا گھر تحائف سے بھر گیا تھا کیونکہ وہ انہیں نہایت لاپروائی سے قبول کرتا رہا تھا۔ لیکن جب اسے ان تحائف سے وابستہ دوسروں کی توقعات کا علم ہوا اور وہ محسوس کرنے لگا کہ لوگ اُسے ایک فاحشہ مرد خیال کرنے لگے ہیں تو اس نے تحائف قبول کرنا فوراً بند کر دیئے اس کی اپنی خادمائیں تک اس سے محبت کی بھیک مانگنے لگی تھیں۔ ان میں سے بعض کو تو اس نے اس گستاخی کی پاداش میں کوڑے لگوائے تھے اور بعد میں ان سزا یافتگان کو رہا کر کے تیس کے بدنام و رسوا بازار میں بیچ ڈالا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ اس کے بددیانت خدام تحائف کے

لالچ میں اس کے گھر کے دروازے رنگین مزاج عورتوں کے لیے کھول دیتے اور وہ سیر و تفریح
سے واپسی پر کسی اجنبی عورت کو اپنے بستر پہ پاکر حیران و ششدر رہ جاتا۔ بستر پر اجنبی عورت
کے لیٹنے کے معشوقانہ انداز سے وہ فوراً بھانپ جاتا کہ وہ کس مقصد کے لیے اس کے خلوت کدہ
میں آئی تھی؛ اس کے سنگار میز سے چھوٹی چھوٹی چیزیں الگ ناقابلِ بیان طور پر غائب ہو جاتیں
اسکندریہ کی ایک سے زائد عورتوں کے پاس اس کے متروکہ پاپوش، آئینہ دار چوکھٹے اور وہ
پیالے جن سے وہ منہ لگا چکا تھا۔ انمول یادگاروں کے طور پر محفوظ تھے۔ جانے کون کب،
اس کے یہاں سے وہ چیزیں اٹھا لے گیا تھا۔ اگر چلتے چلتے وہ کوئی پھول زمین پہ گرا دیتا تو وہ
چشمِ زدن میں غائب ہو جاتا۔ اس کی خاکِ پا تک کو عورتیں سرمہ سمجھ کر اٹھا لے جاتیں۔

اس حقیقت سے قطع نظر کہ احباب کی بخشی ہوئی اذیتوں کے ہاتھوں اس کے
احساسِ روح کے فنا ہو جانے کا خطرہ تھا وہ فی الواقعہ اب اس عمر کو پہنچ گیا تھا جب ایک
آزاد منش مفکر اپنے روحانی احساسات کو نفسانی جذبات سے الگ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے
وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس اخلاقی قلبِ شعور کا واحد سبب اس کا اپنا بنایا ہوا مجسمۂ الفرودت
اسطارطہ تھا۔ ملکہ کے حسن و جمال کی تمام رعنائیاں، اس کے جسم کے تمام دلآویز خطوط جنکی نوک
پلک ایک فن کار کا آدرش ہی سنوار سکتا تھا، دماطریس نے نہایت ماہرانہ چابک دستی سے
سنگ مرمر میں منتقل کر دیئے تھے۔ اور آخر کار وہ دن بھی طلوع ہوا جب مورتی مکمل ہو گئی اور
اس دن کے بعد سے آج تک وہ اپنے اس یقین پر چٹان کی طرح قائم تھا کہ دنیا کی کوئی
عورت اب اس کے معیارِ تخیل پر پوری نہیں اتر سکتی۔ وہ مجسمہ اس کے تمام تر تصورات جمال
اور تمام تر ہیجاناتِ نفس کا مظہر تھا۔ وہ اس مورتی کا پوجاری تھا مگر کچھ اس طرح کہ اس کا جذبۂ
عبودیت اب دیوی کے تصور اور اس کے حسن کے ادراک میں کسی نفسانی خواہش کی آلائش
کا روادار نہ تھا۔ دیوی کا وجود اس کی نظروں میں ہر آن زیادہ سے زیادہ غیر مادی ہوتا جا رہا
تھا۔ ایک نہایت غیر مادی شئے لطیف کی طرح وہ اس کے جسم و جان میں حلول ہو رہی تھی۔

تکمیلِ مجسمہ کے بعد جب وہ ملکہ سے ملنے گیا تو اُسے وہ ایک دم کشش و جاذبیت سے مُبّرا معلوم ہوئی یہ اور بات تھی کہ کچھ عرصہ اور وہ اس کی بے جان اور بے مقصد خواہشات کو آسودہ و مطمئن کرتی رہی۔ وہ گاہے اس کو دیوی سے عین مشابہ معلوم ہوتی اور گاہے اس سے بالکل مختلف اور نتیجۃً اس کا ولولہ انفس بکھر اجاتا — ہنگامۂ بوس و کنار سے خستہ و ماندہ ہو کر جب ملکہ اس کی آغوش سے نکل کر نیند کی گود میں سو جاتی تو وہ اس کے عریاں جسم کو بار بار دیکھتا اور دل میں سوچتا کہ ہو نہ ہو ملکہ مصر ایک فریبی نما صبہ تھی جو دیوی سے اپنی کس قدر مشابہت کی آڑ میں دماطرئیس کی محبوبۂ حقیقی بننے پر مصر تھی۔ ہاں ملکہ کی باہیں نہ زیادہ پتلی اور نازک تھیں۔ اس کے اثمارِ شباب زیادہ پختہ اور لوک دار تھے اور اس کے کولہے زیادہ گھٹے ہوئے اور متناسب مگر ان تمام صفاتِ فائقہ کے باوجود ملکہ کی رانوں کے اُوپر وہ تین سلوٹیں مفقود تھیں جو اس نے مرمریں مجسمہ پہ دکھائی تھیں۔

باوجودیکہ وہ ملکہ کے ہاں تقریباً روز ہی جاتا تھا مگر دماطرئیس کے مداح اور پرستار جانتے تھے کہ ملکہ سے اس کے عشق کی تمام گرم جوشیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اس نے اس واقعہ سے صرفِ نظر کیا اور اب وہ ایک ایسے تغیر کا آرزو مند تھا جس کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔

شاذ ہی ایسا ہوا ہے کہ ایک مرد باوجودیکہ دو داشتائیں رکھتا ہو، موقع آنے پر بھٹک نہ گیا ہو۔ دماطرئیس نے بھی اس فطری کمزوری کے آگے سپر ڈال دی۔ عام طور پر جب بھی اس کا دل قصرِ شاہی کو جانے کی ضرورت سے بغاوت پر آمادہ ہو تا وہ چپکے سے اپنی رات ان معزز قورطیزاؤں کے پاس گزار آتا جو باغ معبد میں مقیم تھیں۔ وہ ان عورتوں کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ فی الحقیقت سطحی محبت کی زیادتیوں کے باعث وہ زندگی سے بیزار تھیں اس لیے ان کے لب بھول کر بھی گریہ و فغاں پہ آمادہ نہ ہوتے۔ ایک خامشی پرور قناعت تھی جس کے سہارے وہ جیے جا رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جس لطفِ نشاط کی خاطر وہ ان کے یہاں آتا وہ اُسے لازماً میسر آ جاتا۔ اس کے برعکس اسی لطف کو ملکہ فرطِ جنون میں بلّی کی طرح چیخ چیخ کر تباہ و برباد کر دیتی تھی۔

بارغ معبد کی پیشہ ور حسیناؤں سے وہ طرح طرح کی آسان فہم باتیں کرتا۔ وہ کبھی وماطریس سے ان مردوں کا ذکر کرتیں جو اس روز ان کے پاس رہ گئے ہوتے۔ کبھی موسم کا ذکر چھڑ جاتا اور کبھی سبزۂ فرش کی نرماہٹ کا۔ بادِ شب کی سبک خرامی کی بھی باتیں ہوتیں وہ یہ بھی پوچھتیں کہ آیا اسے گلستان معبد کی فضا کی عشرت انگیزیاں پسند آئیں؟ حیرت تھی کہ انھوں نے کبھی اسے فن بُتگری کے متعلق باتیں کرنے پر مجبور نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے اس جیسے دوسرے بُت گروں مثلاً اقلیس اور اسکوپاس کے فن کے بارے میں کبھی کوئی رائے دی۔ ہاں البتہ وہ اس کے حسنِ انتخاب کی ضرور داد دیتیں اور ساتھ ہی اس کی جواں مردی کی تعریفیں کرتیں اور نتیجۃً وہ یہ باور کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ سب کی سب اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی تھیں۔

ان عورتوں کی آغوش سے نکل کر وہ معبد کی سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر عالمِ وجد میں دیوی کو پہروں دیکھتا رہتا۔ عقیدت مندوں کے نذر کیے ہوئے ہدایائے نیاز سے لدی، چھریرے ستونوں کے درمیان اپنے پیازی رنگ کے پایہ پر دیوی ایک زندہ اور جاندار ہستی معلوم ہوتی۔ وہ برہنہ تھی اور اس کے اندام پر نسوانی جلد کا سا رنگ ملا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آئینہ سنبھالے ہوئے تھا جس کا دستہ شوخ نما تھا اور دوسرا ہفت تار گوہریں ہار درست کر رہا تھا۔ ہار کا ایک موتی جو دوسروں سے نسبتاً بڑا تھا اس کے پستانوں کے درمیان اس طرح آویزاں تھا جیسے دو گول بادلوں کے درمیان تابندہ ہلال۔

وماطریس مورتی کو بکمال شفقت دیکھتا رہتا اور عوام الناس کی طرح یہ باور کر لیتا کہ ہار کے سب موتی فی الواقعہ مقدس تھے کیونکہ وہ ان پوتر قطرات آب سے پیدا ہوئے تھے جو بطنِ صدف میں داخل ہو گئے تھے۔

وہ مجسمہ الفرودت سے یوں مخاطب ہوتا۔

"اے خواہرِ مقدس! اے گل اندام! اے نقش نازک! اے کہ تو جواب اس حقیر الشبابی اسے بالکل مختلف نظر آتی ہے جسے میں نے بطور مثال اپنے سامنے بٹھایا تھا۔۔۔۔۔۔

اے پیکرِ لافانی! اے مورثِ حسینانِ جہاں اسطارطہ کی ہم نسل اور ارضی روح! اے کہ تو جو اسطارطہ کی اضطراب آشنا آنکھوں کا نور تھی، اس کے لب ہائے لعلیں کا ارتعاشِ پُرسوز تھی! اے کہ تو جو آغوشِ اسطارطہ میں مدہوش رہا کی، اس کے سینہ میں تلاطمِ جذبات پھونکا کی، اس سے ولولہ نفس بن کر لپٹا کی! اے کہ تو جو حسن و جمال کا شاہکار ہے! اے دیوی! اے مادرِ خدایانِ ارض! اے محبوبِ جواں مرداں! اے دلبرِ آشفتہ سراں! اے سرچشمۂ شوق و اضطراب! اے منبعِ انبساط! اے طرفۂ جمال! مری چشمِ تخیل نے تجھے دیکھا تھا، پھر میں نے تجھے اپنے سامنے لا بٹھایا تھا، حتیٰ کہ میری آرزوئے طلب نے مجھے پا لیا اور میں اس قابل ہوا کہ تیرے رنگ اور روپ کی حیرت انگیز دلفریبیوں کو دنیا پر آشکارا کر سکوں۔ اے معبودۂ من! باور کر میں نے اپنا انمول آئینہ اور اپنے بے بہا جواہرات تیری مورتی کو نہیں بلکہ تیری ذات کے حضور میں اسی دن نذر کر دیئے تھے جب تو ساحلِ قبرص پر شگافِ فلک سے امواجِ بحر کے کف آلود تبسموں اور شبنم میں بھیگی ہوئی شفق کی سرخیوں کے پُرشکوہ جلو میں وارد ہوئی تھی اور نیلی فام جل پریوں نے تیرے ورودِ مسعود کی خوشی میں ناقوس پھونکے تھے۔“

دیوی کی پوجا سے فارغ ہو کر آج وہ سیدھا بندرگاہ کی گودی پر چلا آیا تھا۔ جہاں ہجوم آہستہ آہستہ شہر کی جانب منتشر ہو رہا تھا اور نے نواز حسینائیں جذبات انگیز دھنیں چھیڑے ہوئے تھیں۔ آج رات وہ باغِ معبد کی قرطبیز اؤں کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہر ا تھا۔ سبزۂ فرش پر ایک جوڑے کو سرِ عام محوِ اختلاط دیکھ کر اس کے جمالیاتی ذوق کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ وہ بے حد آزردہ خاطر ہو گیا تھا۔ اس کی روح کا تار تار کانپ اٹھا۔ اور وہ گھبرا کر باہر نکل آیا لیکن جوں جوں رات بڑھی اس کی طبیعت بہلتی گئی سکوتِ شب کا فسوں اس پر اثر انداز ہو چکا تھا بالآخر اس نے اپنا رُخ اس ہوا کی طرف پلٹ دیا جو سطحِ سمندر سے بالا بالا عما تھیوز کے گل ہائے گلاب کا عطر دیارِ مصر کی طرف لا رہی تھی۔

یوں کھڑے کھڑے دفعتہً دماطریس کے پردہ ذہن پر عورتوں کے حسین و جمیل نقوش

کھینچنے لگے۔ کچھ عرصہ سے لوگوں کی فرمائش تھی کہ وہ باغِ معبد کے لیے شہزادیت بنات فینوس کا ایک مشترکہ مجسمہ بنائے۔ چنانچہ اس وقت وہ اس مجسمہ کی نوعیت اور اہمیت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ چونکہ جواں تھا اس لیے مجسمہ کو روایتی طرز پر بنانے کے خیال کو اس نے فوراً اپنے دل سے نکال دیا اور اب سوچ رہا تھا کہ عورت ذات کی تین بڑی خصوصیات فائقہ کو کس طرح بطریق احسن سنگ مرمر پر منتقل کیا جا سکتا تھا۔ ! اچانک اسے ایک تدبیر سوجھی۔ ہاں ! وہ دو بہنوں کو کپڑوں میں دکھائے گا اور تیسری کو بالکل برہنہ ! جامہ براندام ایک شہزادی نیم وا آنکھوں سے اپنے مور پنکھ کے بادکش کو دیکھ رہی ہو گی اور دوسری محوِ رقص ہو گی۔ ان دونوں سے بڑی شہزادی جو بالکل برہنہ ہو گی ان کی پشت پر ایک انتہائی عالم وجد میں اپنی گھنی زلفوں سے کھیل رہی ہو گی۔

کئی ایک خاکے اور بھی اس کے ذہن میں ابھرے۔ ایک یہ تھا کہ وہ جل پریوں کی ملکہ اندرمتی کا سنگ سیاہ سے بنا ہوا مجسمہ کسی متلاطم سمندر میں واقع مینار نور کی چٹان سے چمٹا ہوا دکھائے یا پھر کوہ برونشین پر طلوع آفتاب کے وقت جا[4] یا بر کاب گھوڑ سواروں کا منظر تراشا جائے پرستارِ حسن محض ساغروس کی تشنۂ ہوس جل پریوں سے گریزپائی کے منظر کو سنگ مرمر پر منتقل کرنے کے خیال نے تو اس پر کیفیتِ وجد طاری کر دی۔ آہ ! احساس حسن آج اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا ! یہی وجہ تھی کہ دیوی کے متعلق آج اس کے تمام تصورات خواہشاتِ نفسانی کی آلائشوں سے پاک تھے۔ آج وہ آخر کار صحیح معنوں میں اپنے آپ کو ایک آزاد انسان محسوس کر رہا تھا۔

جب اس نے سمندر کی طرف سے اپنا رُخ موڑا تو اس کی نظر دور فاصلہ پر ایک تن تنہا محوِ خرام عورت پر پڑی جو رُخ پہ زرد نقاب افگندہ تھی۔

راہ گیر

چاندنی سے معمور سنسان گودی کی سڑک پر ایک عورت گردن کو خفیف سا خم دیئے آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی اور ایک مختصر و مضطرب سایہ اس کے قدموں میں لرزاں تھا۔

دماطرئیس نے اُسے غور سے دیکھا وہ ایک باریک ریشمیں کمر بند عبا پہنے ہوئے تھی اس کا ایک بازو چُست عبا میں سے باہر نکلا ہوا تھا اور دوسرا جو بالکل عریاں تھا اس کا دامن سنبھالے ہوئے تھا۔

اس کے جواہرات کو دیکھتے ہی اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ ایک قرطبینہ تھی، چنانچہ اس کے عشوہ آگیں آداب و سلام سے بچنے کے لیے وہ راستہ سے ایک طرف ہٹ گیا وہ اس سے ہرگز آنکھ نہ ملانا چاہتا تھا کیونکہ اس کے ذہن پر زاغورس سے متعلق عظیم کارٹون کا خاکہ بدستور چھایا ہوا تھا اور وہ اس سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مُنہ موڑ کر راہ گیر عورت کو پھر دیکھا۔

حیرت تھی کہ وہ بدستور چلی جا رہی تھی حالانکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے رعب میں آ کر رک گئی ہو گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس کے متعلق کچھ سوچنا تو درکنار سمندر تک کو بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنا گوارا نہ تھا۔ اس پر اپنے سے متعلق خیالات میں محو ہونے کا بھی گمان نہ ہوتا تھا۔ نہایت سادگی اور بے تکلفی سے وہ تنِ تنہا بڑھے جا رہی تھی۔ گویا آج رات بادِ خنک، تنہائی، ویرانی اور ارتعاشِ سکوت کے سوا کوئی دوسری شے اس کا حصولِ مقصد نہ تھی۔

سناٹے میں آیا ہوا دماطریس اسے مسلسل تک رہا تھا حتّٰے کہ اس کا دل ایک ناقابلِ فہم تحیّر سے بھر گیا۔

اپنے ساتھ ایک مختصر و مضطرب سایہ لیے وہ بڑھی چلی جا رہی تھی اور وہ اس کے قدموں

کی دلپذیر آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھا۔ وہ بالآخر جزیرہ مَنار کی چٹان پہ پہنچ گئی۔

دفعتہً جیسے وہ اس اجنبی عورت سے بے حد محبت کرتا ہو دماطرلیس اس کے تعاقب میں بھاگنے لگا مگر جانے کیوں بھاگتے بھاگتے ٹھٹکا، کانپا اور قدرے پسپا ہو کر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا اور اس کے بعد گردی سے کنارہ کش ہونے کے متعلق سوچتا رہا۔ لیکن آج اس کی آشفتہ سری کو تابِ فرار کہاں تھی؛ اس کی تمام تر قوتِ ارادی جو آج تک صرف حصولِ عیش و نشاط پر صرف ہوتی رہی تھی اور زندگی میں پہلی مرتبہ ایک کڑے امتحان سے دوچار ہوئی تھی۔ بالآخر سپر انداز ہو گئی، اور دماطرلیس کے قدم بے بسی کے عالم میں جہاں تھے وہیں رک گئے، جم گئے گویا وہ اس اجنبی عورت کا استقبال کرنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا۔ دراصل وہ عورت اس کے دل اور دماغ پہ بُری طرح مسلط ہوئی جا رہی تھی۔ سا س پہ اس کے ضمیر نے اسے ٹوکا تو وہ خجل و منفعل ہو کر اپنی اس لغزش کی عجیب و غریب توجیہیں کرنے لگا۔ مثلاً یہ کہ وہ اس عورت کا محض جمالیاتی نکتہ نگاہ سے قدر دان تھا — ہاں وہ عورت جو ابھی ابھی اس کے پاس سے گزری تھی مجسمۂ شرائیت کے لیے بہترین معیار ثابت ہو گی۔ شرائیت جسے وہ ننگا ہاتھ میں لیے دکھانا چاہتا تھا۔ اور جس کا وہ کل مجسمہ شروع کرنے والا تھا۔ اس عورت کے حسن خوش ادائی کی مماثل ہونا چاہیے

اس کے خیالات اچانک منتشر ہونے لگے اور اس زرد پوش عورت کے متعلق متعدد سوالات اس کے ذہن پر یورش کرنے لگے۔ مثلاً۔

رات کی اس ساعت میں وہ یہاں کیا کرنے آئی تھی؟

آخر کیوں؟ کس کی خاطر؟ کیا وہ گھر سے عمداً دیر سے نکلی تھی؟

اس نے اسے سلام کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ اس نے اُسے ضرور دیکھا تھا! اس نے اسے سڑک سے ایک طرف ہٹتے دیکھا تھا! وہ اسے سلام کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ آخر کیوں؟

افواہ گرم تھی کہ بعض عورتیں پو پھٹنے سے پہلے سمندر میں غسل کرنے آتی تھیں۔ مگر مَنار

کے پاس نہانے کا مطلب ؟ وہاں تو سمندر گہرا تھا بہت گہرا۔ اس کے علاوہ کتنی بے معنی سی بات تھی کہ ایک عورت زیورات سے آراستہ ہو کر سمندر پہ نہانے کے لیے آئے آخر وہ کون سی شے تھی جو اس عورت کو رہاکوتیس کے حسن آباد سے یہاں اس وقت کھینچ لائی ؟

کوئی خاص تفویض ؟

ممکن تھا کسی تنوع پسند من چلے نے سمندر کی لہروں سے دھلی ہوئی چٹان کو بطور بستر عیش استعمال کرنے کی ٹھان رکھا ہو!

دماطریس ابھی کسی قطعی نتیجہ پہ نہ پہنچ پایا تھا کہ اتنے میں وہ جوان عورت اپنے بادکش سے گودی کی منڈیر کی گرد جھاڑتی ہوئی واپس آتی دکھائی دی۔ شفاف چاندنی میں اس کا رُخ زیبا بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔

تحائف

وہ ایک منفرد جمال کی حامل تھی۔ اس کے گھنے سنہری بال دو حصوں میں منقسم تھے جس سے اس کی پیشانی جھکی جھکی جاتی تھی۔ گندھے ہوئے بالوں کا یہ دلفریب سلسلہ کانوں کو محیط کرتا ہوا پشتِ گردن پر ایک ہفت تو عقاص بن گئی تھی اس کی ناک ستواں اور نازک تھی۔ س کے مستی آلودہ لبوں کے مدوّرہ گوشوں پر گاہے گاہے رزنے والے سوراخ ہائے بینی نمایاں تھے اس کا لچکیلا خطِ بدنی گام گام پر لہراتا تھا اور اس کا ہر قدم اثمار شباب کی حیات آفریں آویزش، بل کھاتی ہوئی کمر اور کولہوں کی دم بدم جنبش سے متاثر تھا۔

نوجوان سے تقریباً دس قدم کے فاصلہ پر پہنچ کر اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو دماطریس دفعتہً کانپ اٹھا۔ اس عورت کی آنکھیں غیر معمولی تھیں —— پلکوں اور پپوٹوں کے بوجھ سے بند بند سی، نیلی مگر عمیق اور تابناک پر نم اور خستہ، آتش و آب سے معمور انداز نگاہ دختران آب کی موسیقی کی طرح سحر انگیز۔ جو بھی زد میں آتا اسیر ہو جاتا مگر اس وقت نوران دو آنکھوں کا اندازِ استغنا ہی ایک ستم ڈھا رہا تھا۔ دماطریس جس کے دل پر دوسروں کی شدید سے شدید محبت بھی اثر انداز نہ ہو سکتی تھی آن کی آن میں اس حسنِ بے نیاز کا نیاز مند ہو گیا۔

جہاندیدہ اور تجربہ کار جہاز رانوں کا کہنا ہے کہ دریائے گنگا سے پرے کے ارغوانی سمندروں کی تہہ میں مقناطیسی پتھر کی ایسی چٹانیں واقع ہیں کہ جوں ہی کوئی جہاز ان کے اوپر سے گذرتا ہے اس کے تمام آہنی کیل اور تختے اپنی جگہوں سے اکھڑ کر زیر آب چٹانوں سے جا چپکتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تیز رو جہاز جو کبھی ایک متحرک اور پُر رونق بسیرا تھا، ایک پریشاں حال، شکستہ تختوں کا عذاب زدہ بیڑہ بن جاتا ہے۔ جسے ہوا اور لہریں چند ہی منٹوں میں اِدھر اُدھر منتشر کر دیتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال دماطریس کا ہوا۔ دو بڑی بڑی

مقناطیسی آنکھوں نے اس کی تمام قوتیں سلب کرلیں اور اس کے ہوش و حواس تک ان آنکھوں کی نذر ہو گئے۔

نظریں جھکائے وہ اس کے پاس سے گذر گئی——

عین ممکن تھا وہ اس کی اس ادا سے مشتعل ہو جاتا مگر اس نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اسے ڈر تھا کہیں اس کا غصہ بڑھ جائے اور وہ سنبھل نہ سکے۔ اسے اس کے ساتھ باتیں کرنی تھیں۔

اس انتہائی احتیاط ادب اور ضبط کے باوجود وہ جب بولا تو اس کا لہجہ عامیانہ تھا۔

"بندہ سلام عرض کرتا ہے!"

"اور میں تمہیں!" اس نے جواب دیا۔

"اس وقت خراماں خراماں کہاں جا رہی ہیں؟" دماطریس نے بڑی ہوشیاری سے بات بڑھائی۔

"گھر"

"اکیلی؟"

"اکیلی"—— یہ کہہ کر اس نے اس طرح حرکت کی گویا وہ آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔

اس کی اس ادا پہ دماطریس کو معاً خیال آیا کہ اسے تو رطینیرہ سمجھ کر اس نے غلطی کی۔ کچھ عرصہ سے منصفوں اور دوسرے اعلیٰ سرکاری ملازمین کی بیگمات میں کسبیوں کی طرح بناؤ سنگار کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ غالباً وہ بھی ایک معزز خاتون تھی چنانچہ جب وہ دوبارہ اس سے مخاطب ہوا تو اس کا لب و لہجہ طنز سے خالی تھا۔ "تو جناب اپنے شوہر کے پاس۔۔۔۔۔؟"

وہ ہنسی اور گردن کی منڈیر پر اپنے ہاتھ رکھ کر بولی "آج شام میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔"

دماطریس پر ایک بجلی سی گری۔ بہر کیف وہ سنبھلا اور قدرے جھینپ کر بولا۔ "آج رات شوہر کی تلاش بیکار و بے سود ہے۔ آپ بہت دیر سے تشریف لائیں۔ اب یہاں کوئی بھی تو نہیں۔"

"آپ سے کس احمق نے کہہ دیا میں کسی کی تلاش میں ہوں؟ تنہا ٹہلنے کو جی چاہا تھا، نکل آئی۔ مجھے ہرگز کسی کی تلاش نہیں۔"

"اگر یہی بات ہے تو جناب آئی کہاں سے ہیں؟ یہ ریشمی نقاب، یہ زربفت ملبوس، یہ زیورات — کیا یہ سب اپنے لئے؟"

"تو کیا میں ننگی باہر نکلا کروں؟ یا پھر کنیزوں کا سا بھاری بھرکم اُدنی لباس پہن کر باہر آیا کروں؟ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں بے حد حسین و جمیل ہوں۔ دیکھا نہیں میں چلتے چلتے اپنی انگلیوں کو دیکھتی رہتی ہوں تاکہ میں اپنی مرصع انگشتریوں کو دادِ تحسین دے سکوں — آہا! یہ میری پیاری پیاری انگشتریاں!"

"اس سے تو بہتر ہو گا اگر جناب آئینہ لیے فقط اپنی مخمور آنکھیں اس میں دیکھا کریں۔ یہ آنکھیں آپ کی میگوں آنکھیں اسکندریہ کی پیداوار نہیں۔ غالباً آپ یہودن ہیں کیونکہ آپ کی آواز ہم سے مختلف ہے۔"

"میں یہودن نہیں غلیلتن ہوں۔"

"اسمِ گرامی؟ ... مریم؟ نعیمی؟"

"میں اپنا شاہی نام نہیں بتاؤں گی جو ایک شاہی نام ہے اور تم لوگ اس سے نا مانوس ہو۔ میرے احباب مجھے کرائیسس کے نام سے پکارتے ہیں اور یہ وہ نام ہے جس کا خراجِ تحسین تو بھی — ہاں تو بھی نادانستہ طور پر مجھے ادا کر چکا ہے۔ کیا نہیں؟"

جواب میں دماطریس نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔

"معاف کرو۔" وہ ایک استہزا آمیز انداز سے بولی۔ "ایسی حرکات کے لیے اب وقت

کہاں ، باہر آئے مجھے تین گھنٹے گذر چکے۔ تھکن سے چُور چُور ہوں!" یہ کہہ کر وہ جھکی اور اپنے ایک پیر کو ہاتھ میں لے کر دوبارہ بولی "دیکھنا! ان تسموں نے میرا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ اگر میں نے انھیں جلدی سے ڈھیلا نہ کیا تو میرے پاؤں زخمی ہو جائیں گے۔ اور وہ بہت ہی عجیب بات ہو گی۔ اگر کسی نے ان زخموں کو ہی چومنا شروع کر دیا۔ چھوڑو، مجھے فوراً چھوڑ دو —— اُف! کیا مصیبت ہے! معلوم ہوتا تو میں یہاں ہرگز نہ رکتی۔ ذرا دیکھنا! کمر کے کے پاس میرا نقاب کس قدر پُرشکن ہو چکا ہے!"

دماطریس کی جبیں عرق آلود ہو گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے پسینہ پونچھا اور قدرے کھسیانہ ہو کر بولا "خدا مجھے راہ دکھائے!"

"مگر میری مرضی نہیں ہے۔" کرائیسس نے تحیر آمیز لہجہ میں کہا۔ "عجیب انسان ہو! کم از کم یہ پوچھنے کی زحمت تو گوارا کی ہوتی کہ میری کیا مرضی ہے؟ مجھے راہ دکھاؤ! —— تم کیسی بے تکی ہانک رہے ہو؟ کیا تو نے مجھے ایک بازاری چھوکری سمجھ لیا جو محض چند کوڑیوں کے عوض اپنے چاہنے والے کو جانے اور پرکھے بغیر اس کے ساتھ ہو لیتی ہے؟ پوچھا ہوتا آیا میں آج آزاد ہوں بھی کہ نہیں؟ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آج کس طرح لاتعداد لوگ محض میرے دیدار کی خاطر اپنے دروازوں پر منتظر کھڑے تھے اور میں نے ان کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی۔ وصل محبوب کا شرف تو خیر بہت دور کی بات ہے ..... مجھے راہ دکھاؤ! —— یقین رکھ میں ہرگز ہرگز تجھے راہ نہ دکھاؤں گی۔ نہیں، اسی جگہ کھڑے رہو یا کسی طرف کو چل دو، مگر مہربانی کر کے میرے گھر کا رخ ہرگز نہ کرنا ورنہ .....؟"

"ورنہ کیا؟ اے مغرور عورت! جانتی ہو میں کون ہوں؟"

"تو سمجھتا ہے میں تجھے نہیں جانتی؟ تو دماطریس ہے، اسائیس کا رہنے والا۔ جانتی ہوں تو نے میری محبوب معبودہ کا مجسمہ بنایا ہے۔ تو میری ملکہ کا عاشق ہے اور اس وجہ سے شہر اسکندریہ کا اصل حکمران۔ لیکن اس وقت میری نظر میں تیری وقعت ایک غلام کی سی ہے اس لیے کہ

تو نے مجھے دیکھا اور مجھ پہ ہزار جان سے فدا ہو گیا ہے"!

وہ کسی قدر اس کے قریب تر ہو گئی اور اشتعال مجسم بن کر بولی "اے دماطریس! تو مجھ پر جان و دل سے فدا ہے۔ کیا نہیں؟"

وہ ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی "جانتی ہوں کہ تو جواب میں کیا کہنا چاہتا ہے، یہی ناکہ تو کسی پہ فدا نہیں، الٹا دوسرے تجھ پہ فدا ہیں ---- یہ کہ تو ایک محبوب و منتخب ہستی ہے، تو ایک معشوق ہے، تو ایک معبود ہے۔ میں یہ سب کچھ جانتی ہوں..... بے شک وہ تو ہی تو تھا جس نے اس غلانسرہ کی التجائے وصل کو ٹھکرایا جو مدتوں اپنے فدائی عنطوخس سے گریزاں رہی ..... آہ بے چاری دیمونسہ جس نے تمام عمر باعصمت رہنے کا حلف اٹھایا تھا لیکن بالآخر محبت کے ہاتھوں بے بس و مجبور ہو کر ایک رات تیرے بستر پہ برہنہ آپڑی تھی جب تو محوِ خواب تھا۔ وہ تجھے یقیناً پا لیتی اگر تو نے جاگتے ہی اسے اپنے غلاموں کی مدد سے باہر نہ نکلوا دیا ہوتا..... مجھے نامور خاتون قلستان کا حال زار بھی معلوم ہے جو تیرے قریب ہونے کی جرأت نہ پا کر ایک عرصہ سے تیرے گھر کے سامنے ایک گھر لیے بیٹھی ہے اور ہر صبح اپنے حمام کے دریچے سے نیم عریاں حالت میں تجھے دیکھتی رہتی ہے۔ اے دماطریس! تو سمجھتا ہے کہ مجھے تیرے متعلق کسی بات کا علم نہیں؟ مت بھول کہ قورطیبزائیں ایک دوسری کو سب کچھ بتا دیتی ہیں۔ میں تو تجھے اسکندریہ میں پہنچنے کے دن سے جانتی ہوں۔ شاید ہی کوئی ایسا دن گذرا ہو جب میرے یہاں تیرا ذکر نہیں آیا۔ مجھے تو تیری وہ باتیں بھی یاد ہیں جو تو خود بھول چکا ہو گا یا دوسروں نے تیرے گوش گذار نہیں کیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ فائلس تیرے دروازہ پہ پھانسی لے کر مر گئی۔ کیا نہیں؟ ہاں، تیرے عشق میں خودکشی کر لینا زمانے کا دستور بنتا جا رہا ہے۔ بیچاری لائیڈ بھی اس راہِ فنا پہ گامزن ہے۔ آج شام ہی میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ فرطِ غم سے نیلا تھا اور اس کی آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں تھا۔ ٹرائیڈ کو تو جانتا بھی نہ ہو گا؟ وہی پندرہ سالہ بچی جسے اس کی ماں نے گذشتہ مہینے ساموتس کے ایک جہاز راں کے ہاتھ ایک رات کیلیے پہلی بار فروخت کیا تھا۔ وہ نووارد دنیائے

لذت، اکثر میرے پاس آتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اب تک اسے کوئی مشورہ نہیں دیا۔ مشورہ بھی کیا دوں وہ ابھی اس قابل بھی نہیں کہ ٹھیک طور سے زندگی کی شطرنج پہ پانسہ پھینک سکے۔ میں اکثر اسے اپنے ساتھ سلاتی ہوں کیونکہ جب اسے کوئی طلب گار نہیں ملتا تو اس بے چاری کے پاس شب بسر کرنے کے لیے کوئی جگہ تک نہیں ہوتی۔ حیرت ہے کہ وہ تجھ پر دور ہی دور سے جان دیتی ہے۔ کاش! تو نے اس کی آشفتہ سری کی جنوں سامانیوں کا منظر دیکھا ہوتا!۔۔۔ ہائے، وہ اس کا تیرا نام لے کر مجھ سے لپٹ جانا، آہیں بھرنا اور پھر دفعتہً رو پڑنا۔ ایک عرصہ سے وہ تجھے خط لکھنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے روک دیا، منع کیا۔ سمجھا؟ میں نے اسے سمجھایا کہ اس کی یہ آرزو عبث اور بے کار ہے۔۔۔"

دماطریس اسے اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔

"ہاں!" کرائسٹس نے مزید کہا، "جانتی ہوں میری ان باتوں سے تجھے ذرہ بھر دلچسپی نہیں اس لیے کہ تجھے لائیڈ کی بجائے مجھ سے محبت ہے اور تیرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں۔ دراصل اس وقت، اس لمحہ تو میرے مژگاں کے بارِ لطیف کے متعلق سوچ رہا ہے اور یہ کہ میرا دہن کس قدر شیریں ہے۔ اور میرے گیسوئے تابدار کس قدر نرم اور ملائم!۔۔۔ بے شمار انسان میرے حقائقِ حسن سے واقف ہیں۔۔۔ ہاں، ان گنت عشاق میری خصوصیاتِ جمال سے آگاہ ہونے کے لیے اپنی جنوں سامان زندگیوں کی تمام تر قوتیں مجھ پر صرف کر چکے ہیں۔۔۔ ۔۔۔ میرے دربارِ حسن میں کون نہیں آیا؟۔۔۔ مرد، بوڑھے اور جوان۔۔۔ عورتیں، کمسن لڑکے اور لڑکیاں میرے یہاں آئیں لیکن میں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ دماطریس! کچھ سمجھے؟۔۔۔ گذشتہ سات سالوں میں صرف تین راتیں میں نے سو کر گزاری ہیں۔ ذرا گننا کتنے عشاق بنتے ہیں جو میرے الطافِ جمال سے بہرہ ور ہو چکے ہیں؟ غالباً دو ہزار پانچ صد سے بھی زیادہ! ان کا ذکر نہیں جو دن کے روشن اوقات میں میرے پاس آیا کیے۔۔۔۔ گذشتہ سال میری وقفِ تعیش زندگی میں ایک رات ایسی بھی آئی جب میں بیس ہزار انسانوں

اجتماع میں مکمل طور پر عریاں ہو کر ناچی تھی۔ جانتی ہوں تو اس مجمع میں نہیں تھا.... میں کسی سے اپنی کوئی بات کیوں پوشیدہ رکھوں! لاتعداد عورتیں اس شہر میں ایسی ہیں جنھوں نے مجھے میرے مرمریں حمام میں برہنہ اندام دیکھا ہے اور.... متعدد مردوں نے مجھے میرے بستر رنگیں پر! ایک تو ہے جو مجھے کبھی برہنہ نہیں دیکھ پائے گا، تو صرف تو! میں تجھے ٹھکراتی ہوں.... تیرے لیے میرے پاس سوائے انکار کے کچھ نہیں تجھے کبھی نہیں معلوم ہو گا میں کیا ہوں، اور یہ کہ اپنے جمالِ رعنا کے متعلق میرے کیا احساسات ہیں، میرا طوفان آسا جذبۂ عشق کیا شے ہے! .... دماطریس! تو ایک برخود غلط انسان ہے بالکل حقیر، ظالم، بے حس اور بزدل.... حیران ہوں میری ہم جنسوں میں سے کسی نے آج تک تجھے اور بلکہ کو جوشِ حقارت میں یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ کیوں نہیں اتار دیا....؟"

دماطریس کراٹسس کی اس ضربِ گفتار سے طیش میں آ گیا اور اس نے جلدی سے کراٹسس کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر اس کے جسم کو پوری قوت سے بھینچا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ گھبرائی اور خوف اور وحشت کے آثار اس کے غازہ آلودہ چہرے پر نمودار ہوئے مگر چونکہ تجربہ کار تھی نہایت پھرتی سے اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکل گئی اور قدرے دور ہٹ کر بولی "دماطریس! یہ نہ سمجھ کہ میں تجھ سے ڈر گئی ہوں.... مجھے ایک مبتلائے محبت الہڑ دوشیزہ نہ سمجھ! تو لاکھ ابنِ اطلس کی طرح شہ زور سہی۔ اے خود غرض، تسکینِ نفس کے مریض انسان اپنی قوتِ مجہول کے بل بوتے پر مجھے خستہ و خراب کرنے کا احمقانہ خیال اپنے دل سے نکال دے!.... جانتی ہوں تو مجھے پا لینے کے لیے بیتاب ہے۔ تو میرے سراپائے جمال کے عریاں جلووں کے لیے بیقرار ہے۔ اس لیے کہ تو مجھے تمام تر خصوصیات جمال کی حامل سمجھتا ہے، بے شک۔ میں نہایت حسین و دلفریب ہوں، نہایت جمیل و دلکش ہوں مگر نہ بھول کہ میری خلوت گاہ عشرت کی شمعوں کی روشنی کے سامنے یہ پھیکی پھیکی بے کیف چاندنی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مجھے ذلیل نہ کر.... پاگل نہ بن.... سوچ اپنی کنیز کے بغیر میں اپنے ملبوسات کیسے

زیب تن کر سکوں گی؟۔ ۔ ۔ جا مجھے تنگ نہ کر مجھے نہ ستا جا.....!"

کچھ دیر ان کے درمیان مکمل خاموشی طاری رہی۔ بالآخر دماطرتیس بولا "کافی ہو چکی کراٹسس! مطمئن رہو کہ دماطرتیس جبری محبت کا قائل نہیں۔ لیکن اس میں کیا حرج ہے اگر تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو؟ تسلیم، تم اپنے غرورِ حسن سے مجبور ہو مگر یہ نہ بھولو کہ دماطرتیس کو تمہارا انکار نہیں بہت گراں ثابت ہو گا!"

کراٹسس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"آخر تو کس لیے خائف و گریزاں ہے؟" دماطرتیس نے پوچھا۔

"دماطرتیس! دراصل تو صرف دوسری عورتوں کے مذاقِ عشق کا عادی ہے۔ تو نہیں جانتا کہ تجھ سے متنفر فور طنیرہ سے محبت کرنے کی قیمت کیا ہے؟"

اس پر وہ خشمگیں اور برانگیختہ ہو کر بولا "مگر تم سے محبت کرنے کون کہتا ہے؟ میں دوسروں کی محبت سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ سے محبت کا دعویٰ کرے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تو۔ ۔ ۔ تو میرے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ ۔ ۔ ۔ اپنے آپ کو میرے سپرد کر دے اور اس کے عوض میں تجھے تمام جہان کا سونا بخش دوں۔ مصر میں بھی میرے پاس بے انداز سونا ہے۔"

"اور میرے پاس میرے بالوں ہیں۔ دماطرتیس، میں سونے سے بیزار ہوں۔ لعنت بھیجو سونے پر! البتہ مجھے تین دوسری چیزیں مطلوب ہیں۔ کہو، کیا وہ تین چیزیں تو مجھے دے سکتا ہے؟"

دماطرتیس کو دفعتہً محسوس ہوا کہ وہ عشوہ طراز عورت کوئی ناممکن الحصول اشیا مانگنے والی ہے، اس لیے وہ قدرے گھبرا کر اسے تکنے لگ گیا۔

اس کی اس قدرتی گھبراہٹ پر وہ مسکرائی پھر نہایت ادائے محبوبانہ سے بولی "مجھے ایک نقرئی آئینہ درکار ہے جس میں منعکس آنکھوں کو میری میگسار آنکھیں دیکھ سکیں...!"

"بجا۔ وہ آئینہ تمھیں ضرور ملے گا۔ دوسری چیز؟ جلدی کہو!"

"مجھے ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک شانہ مطلوب ہے جسے میں ہر روز اپنے بالوں میں اس طرح منجذب کیا کروں گی جس طرح دھوپ جلتے پانی میں جال۔۔۔"

"منظور۔ اور اس کے علاوہ؟"

"کیا مجھے میرا مطلوبہ شانہ ملے گا؟"

"یقیناً آگے کہو!"

مجھے ایک جواہر کار ہار چاہیئے جسے پہن کر میں اپنی قیام گاہ میں اپنے وطنِ مالوف کے عروسی رقصوں کا مظاہرہ تیری خاطر کیا کروں گی۔"

"بس! یہی کچھ؟" اس نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

"کیا تم میرا مطلوبہ ہار مجھے دو گے؟"

"ہاں۔ تمہاری مطلوبہ اور پسندیدہ مالا تمہیں ضرور ملے گی۔"

"میری پسندیدہ مالا! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ مگر ہاں تم مجھے اپنے مطلوبہ تحائف کی تخصیص اور انتخاب کی اجازت تو دو گے؟"

"یقیناً۔"

"قسم کھاتے ہو؟"

"قسم کھاتا ہوں۔"

"کس شئے کی؟"

"حکم دو!"

"ربۃ الفردوت کی جس کا مجسمہ تو نے بنایا!"

"مجھے اپنے ساختہ مجسمۂ الفردوت کی قسم۔۔۔۔ آخر اس قدر شدید احتیاط اور پیش بندی کا سبب؟"

"میں ڈرتی تھی لیکن اب میں مطمئن ہوں۔" وہ تن کر بولی۔ "تو ہیرم نے اپنے تحائف

چن لئے۔"

دماطریس ایک بار پھر قدرے بے چین سا ہوا۔ بہرکیف بولا "بے شک، حق انتخاب تجھے مل چکا۔ کیا نہیں؟"

"ہاں۔ مگر کیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ مجھے وہ آئینہ قبول نہ ہوگا جو تو کسی سمرنائی سوداگر یا کسی گمنام قورطنیرہ سے خرید لائے گا۔ مجھے تو وہ مخصوص آئینہ مطلوب ہے جو میری پہلی نجیث کے پاس ہے وہی نجیث جو گزشتہ ہفتے میرے چند عشاق کو ورغلا کر لے گئی۔ بھری محفل میں میرا مذاق اڑاتی رہی جیسا کہ طرائفرہ، مادُسا ریہ اور چند دوسری بے وقوف چھوکریوں نے مجھے بتایا۔ وہ اس آئینہ کی بہت قدر کرتی ہے کیونکہ وہ رعود پیس جس سے بلا معاوضہ محبت کرنے کا دائمی حق صافو کے بھائی کے پاس ہے کے یہاں سے اس کے پاس آیا۔ تو جانتا ہے نجیث ایک نامی گرامی قورطنیرہ ہے۔ وہ اس آئینہ کو نہایت بے بہا اور عظیم الشان خیال کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں وہ آئینہ تجھے کہاں ملے گا۔ ایک رات نشے کی حالت میں نجیث بک گئی کہ وہ اس آئینہ کو کہاں رکھتی ہے۔ وہ آئینہ اس کی قربان گاہ کے چبوترے کے تیسرے پتھر کے نیچے محفوظ رہتا ہے شام کو باہر جانے سے قبل وہ اسے وہاں چھپا جاتی ہے۔ شام کے وقت اس کے یہاں جا گھر اناست۔ نجیث اپنی تمام کنیزوں کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔"

"یہ نرا پاگل پن ہے تو چاہتی ہے تیرے لیے میں چوری کروں؟" دماطریس چلایا۔

"تو کیا تو مجھے نہیں چاہتا؟ . . . میں سمجھتی تھی تو اپنی قسم کا پابند رہے گا۔ اگر میں غلط سمجھی تو آ، معاملہ یہیں ختم کر دیں۔"

وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ صریحاً اس کے درپئے آزار ہے۔ وہ اسے برباد کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ دانستہ طور پر سپر انداز ہو گیا۔

"مجھے منظور ہے۔ وہی ہوگا جو تو کہتی ہے۔"

"اوہ! مجھے توقع تھی کہ تو ضرور میری بات مانے گا اگرچہ تو کسی قدر ہچکچا سا گیا۔ میں تیرے

اس تذبذب کی وجہ سمجھتی ہوں۔ واقعی یہ کوئی معمولی تحفہ نہیں ہے جس کے حصول کی خاطر میں کسی فیلسوف سے رجوع کر سکتی۔ اس کی توقع تجھی سے کی جا سکتی تھی۔ صد شکر، وہ تحفہ تو مجھے لا کر دے گا۔"

کچھ دیر اپنے مور پنکھ کو ادھر اُدھر ہلانے کے بعد وہ دفعتاً پھر جوش میں آ کر بولی "مجھے ہاتھی دانت کا عام شانہ نہیں چاہیئے جو تو بازار سے خرید لائے گا۔ مجھے تو پیشوائے اعظم کی بیوی کا وہ خاص شانہ درکار ہے جو قرطبینہ و عودپیس کے آئینہ سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ یہ شانہ ایک قدیم ملکۂ مصر کے وقت سے چلا آ رہا ہے۔ اس شانہ پر ایک ایسی لڑکی کی تصویر کندہ ہے جو اپنے سے نسبتاً بڑے نرگسی پھولوں کی پنکھڑیوں پر اس انداز سے کھڑی ہے گویا وہ اپنے آپ کو بھیگنے سے بچا رہی ہے۔ یہ نہایت خوبصورت کنگھی ہے اور میں خوش ہوں کہ وہ تو مجھے ضرور لا کر دے گا... چند وجوہ کی بنا پر مجھے پیشوائے اعظم کی زوجہ سے سخت نفرت ہے مثلاً پچھلے مہینے میں نے معبودہ افرودت کے حضور میں ایک نیلگوں نقاب پیش کیا۔ اگلے ہی روز اس نقاب کو وہ بدطینت عورت زیب تن کیے ہوئے تھی۔ نہایت جلد باز ہے وہ عورت! مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ اس خاص شانہ کی دستیابی اس کمینی عورت سے میرا انتقام ہو گا۔"

"اس شانہ کے حاصل کرنے کی ترکیب؟"

"نہایت دشوار ہے، میں جانتی ہوں۔ مگر ہاں تو نے سنا ہو گا وہ عورت مصری النسل ہے، اپنی دوسری تمام ہم وطنوں کی طرح وہ بھی سال میں صرف ایک بار اپنے بال بناتی ہے لیکن چونکہ اس کا مخصوص شانہ مجھے ملنا ہی چاہیئے اس لیے امکان غالب یہ ہے کہ وہ شانہ تو اسے مار کر ہی حاصل کر سکے گا... امید کرتی ہوں تجھے اپنی قسم ابھی یاد ہو گی اور وہ شانہ تو ہر قیمت پر میرے لیے حاصل کرے گا۔"

دماطریس نظریں جھکائے بدستور اس کے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کرائسٹس نے اپنے چہرے کو قدرے اوپر کی طرف اٹھایا اور دفعتہً بحالت عجلت کہنے لگی "دماطریس! میں نے اپنے لیے ہار کا بھی انتخاب کر لیا۔ مجھے وہ سات لڑیوں والا ہار ہے کہ دو جو الیفروڈت کے گلے میں ایک کالر کی طرح آراستہ ہے!"

"یہ سراسر زیادتی ہے" وہ بھنایا "غالباً تو اس خیال میں ہے کہ یہ ظالمانہ کھیل تو میرے ساتھ ہمیشہ کھیلتی رہے گی۔ یاد رکھ میں تجھے کچھ نہیں لا کر دوں گا۔ تجھے ایک چیز بھی نہیں ملے گی۔ نہ آئینہ نہ شانہ، نہ ہار، کچھ بھی نہیں . . . . دور ہو!"

کرائسٹس اس کے اس انداز بے زاری پہ قدرے متحیر ہوئی مگر جلد ہی محتاط ہو کر ایک نہایت محبت آمیز اور انکار شکن انداز دلربائی سے بولی "دماطریس خدارا ایسی دل شکن اور روح سوز بات مُنہ سے نہ نکال جب کہ دل ہی دل میں تو اس ہار کو ہر قیمت پہ میرے لیے حاصل کرنے کا عزم کر چکا ہے . . . . مجھے یقین کامل ہے کہ وہ تین تحائف تو مجھے ضرور لا کر دے گا اور اس کے بعد . . . . اس کے بعد تو کل شام میرے یہاں آئے گا پھر اگلی شام اور پھر اس سے اگلی شام، نہیں . . . . بلکہ ہر شام تو میرے یہاں آیا کرے گا تو جب بھی چاہے گا میں تیرے پاس ہوں گی . . . . میری تمام ہستی جمیلہ تیرے تابع ہو گی . . . . تو دیکھے گا کہ میں تیری اور صرف تیرے لیے ہوں گی . . . . بس . . . . میں تیری حسبِ پسند لباس زیب تن کروں گی . . . . تیری حسبِ منشا سنگار کروں گی . . . . تیرے حسبِ ذوق بال سنواروں گی . . . . غرضیکہ تیرے ہر تلون مزاج کے آگے سرِ تسلیم خم کروں گی . . . .

تجھے نزاکت کی تلاش ہو گی تجھے میری سیمابی بانہوں میں تمام جہاں کی نزاکتیں ملیں گی، میری بانہیں تجھے پیار کا جھولا جھلائیں گی . . . .

تجھے نشاط ہائے نادرہ کی خواہش ہو گی تجھے وہ سب کے سب مجھ سے میسر آئیں گے خواہ وہ میرے لیے تکلیف دہ اور دلخراش ہی کیوں نہ ثابت ہوں . . . .

خامشی چاہو گے تو میں پہروں گنگ رہوں گی.....
نغمہ کی آرزو کرو گے تو لاریب، تو یک گو نہ جہان نغمہ و موسیقی میں ہو گا....
محبوب من! مجھے پردیس کے گیت یاد ہیں.......
ایسے گیت جو نغمات جوئبار کی طرح سبک و شیریں ہیں.... ایسے گیت جو طوفانِ برق و باراں کی مانند گرجدار ہیں....
اور وہ معصوم و شگفتہ گیت بھی جو بچیاں اپنی پیاری ماؤں کو سناتی ہیں....
اور ان بانکے گیتوں کا تو پوچھو نہیں جنہیں گاتے وقت طوائفیں بھی پسینہ پسینہ ہو جاتی ہیں.....
وہی رنگین گیت جو ایک بار علقنطیس نے سنے تھے اور بارے شرم کے پانی پانی ہو گیا تھا.....
وہی ترغیب انگیز گیت میں آہستہ آہستہ تیرے کانوں میں انڈیلوں گی....
راتوں کو تو مجھے ناچنے کو کہے گا تو میں صبح تک ناچتی رہوں گی، چاہے گا تو ملبوسات زربفت میں آراستہ ناچوں گی، چاہے گا تو سینہ و قبا میں یا محض زیر جامہ پہنے ہوئے۔
اگر میں نے بالکل برہنہ ناچنے کا وعدہ کیا تو اس صورت میں تن کی عریانی ہی میرا لباس ہو گا۔ ہاں، میں بالکل عریاں ناچوں گی ایک بنی سنوری مقدس مورتی کی طرح....
میں فن رقص کے ہر پہلو سے واقف ہوں۔ میں جانتی ہوں اور خوب جانتی ہوں کہ...
رقص کی وجد آور گردشوں میں دست ہائے نازک کس طرح گھمائے جاتے ہیں، سیمابی باہوں کو کس طرح جنبش دی جاتی ہے، بیباک و سرکش سینہ کس طرح تھرتھرایا جاتا ہے، پتلی کمر کو کس طرح لچکایا جاتا ہے۔ اور کولہوں کو کس طرح مٹکایا جاتا ہے....
میں وہ تمام رقص جانتی جن کا مظاہرہ الفردوت نے یورتیہ اور اسطارطہ کے درباروں میں۔ مجھے وہ رقص بھی یاد ہیں جن کا مظاہرہ کرنے کی کوئی دوسری رقاصہ

آسانی سے جرأت نہیں کر سکتی ....

باور کر کہ حُسن و جمال کے معاملہ میں تیری ملکہ کی نسبت میں زیادہ امیر ہوں ....

تو دیکھے گا کہ تیری ملکہ کے یہاں ایک بھی ایسا حجرہ نہیں جو عشرت سامانیوں کے معاملہ میں میری رنگین خلوت گاہ کا مقابلہ کر سکے۔ مت پوچھ میرے عشرت کدہ میں تجھے کیسے کیسے سامان ہائے تعیش میسر آئیں گے۔ میرے یہاں کا سامانِ عیش ناقابل بیاں طور پر عجیب و غریب ہے میرے یہاں کی ہر شے اس قدر نادرِ روزگار ہے کہ کوئی ان کا مخصوص نام نہیں بتا سکتا۔ ....

سب سے فائق یہ کہ تو ایک ایسی چیز دیکھے گا جو تمام دنیا کی نفیس و دل پذیر چیزوں پر فائق ہے، یعنی تو کرائسس کو دیکھے گا جسے تو دل و جان سے چاہتا تو ہے مگر اس کے وجود کی معنویت اس کے جمال دلنشیں کی خصوصیات کو مطلق نہیں سمجھتا ...

تو نے ابھی صرف میرا رُخِ زیبا دیکھا ہے۔ تجھے کیا معلوم میں اس کے علاوہ کس قدر دلفریب و ہوش رُبا ہوں؟ کیسے کیسے عناصرِ تحیّر و استعجاب میرے وجود فائقہ میں پوشیدہ ہیں؟ تجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں؟

میری آغوش میں تو فرطِ نشاط میں بے خود ہو گا۔ میرے مرتعش، گرم و نرم جسم پر مدہوش لوٹے گا، ....

میرے شیریں دہن اور اس کے بوسوں کا تلطف بے پایاں تجھے کیا معلوم؟"

دماطرئیس کو اپنی ترغیب آمیز، تلخ و شریں گفتار کے اثر سے مغلوب ہوتے دیکھ کر اس نے اپنے ترکش ناز سے ایک پیکان اور پھینکا: "اور ایک تم ہو جو مجھے ایک ذلیل بوسیدہ آئینہ نہیں لا کر دے سکتے باوجود کہ تمہارے ہاتھ میری ان گھنی سنہری زلفوں سے متواتر و پیہم کھیلنے کے لیے بے تاب ہیں جو میں اس آئینہ کی مدد سے سنوارا کروں گی۔"

دماطرئیس نے اسے چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ بدن چرا کر لوبی بے کل:

"مطمئن رہو وہ آئینہ تجھے ضرور ملے گا۔" وہ بڑبڑایا۔

" اور وہ ہاتھی دانت کا شانہ بھی مجھے لا کر نہیں دے سکتے حالانکہ میری یہ ہاتھی دانت سے تراشی ہوئی بانہیں تیرے گلے میں اکثر حمائل ہوں گی!"

وماطریس نے چاہا وہ اس کی بانہیں پکڑے مگر وہ پیچھے ہٹ گئی اور بولی "کل"

" میں وہ بھی لا کر دوں گا" اس نے آہستہ سے کہا۔

" مجھے معلوم ہے" قورطینرہ بولی " تو وہ جواہر کا ہار بھی لائے گا جو الیفرودت کے گلے میں آویزاں ہے۔ اس کے بدلے میں تجھے میں اپنا نیم وا، صدف در بار ایسا جسم نذر کروں گی اور ساتھ ہی اپنا وہ رسیلا اور شیریں دہن بھی جو تجھے سمندر کے موتیوں سے بھی زیادہ بوسے عنایت کرے گا۔"

وماطریس نے اس پر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور یکایک وہ التجائے مجسم بن گیا۔ کرشتس مسکرائی اور اس کے بعد اس نے اپنا جنسی کشش سے معمور دہن ایک لمحہ کے لیے اس کے سپرد کر دیا۔

جب اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ بہت دور جا چکی تھی اور ایک مختصر و متحرک سایہ اس نقاب پوش قورطینرہ کے عقب میں بھاگ رہا تھا۔

وہ خود ایک مبہم انداز میں بستی کی طرف چل دیا جب کہ اس کا سر ایک ناقابلِ اظہار شرم کے بوجھ سے جھکا جاتا تھا۔

کنوارِیاں

سمندر پر ہلکی ہلکی پَو پھَٹ رہی تھی اور ہر شے پر ارغوانی رنگ چھا رہا تھا۔ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی فاروس کی چٹان پر ایستادہ منار کے مُلتہب شعلے بجھ گئے تھے۔ بنفشی لہروں پر زردی مائل ضیائیں دخترانِ آب کے بالوں سے ڈھنپے ہوئے چہروں کی طرح چمک رہی تھیں یکایک سویرا ہو گیا۔

بندرگاہ کی گودی سُنسان تھی اور شہر اسکندریہ پر کامل سکوت طاری تھا طلوعِ سحر کی اس اولین نور افشاں ساعت میں طلسمِ خواب ٹوٹ رہا تھا اور شب کی خواب آور کیفیات اپنے آخری دور میں تھیں۔ مختصر یہ کہ ہر سو خامشی ہی خامشی تھی۔

گودی پر لمبے لمبے جہاز اپنے متوازی پتوار خوابیدہ پرندوں کی طرح قطار اندر قطار پانی میں ڈالے ہوئے تھے۔ سامنے شہر کی راہگذاروں کے دورویہ مستقیم اور غیر منقطع سلسلے ویران پڑے تھے ان پہ نہ کوئی گاڑی نظر آتی تھی اور نہ گھوڑا اور نہ ہی کوئی سحر خیز غلام سکوت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اسکندریہ پر اس لمحہ ایک صدیوں سے ویران شہر کا گماں ہوتا تھا یکایک دھرتی کسی کے قدموں کی خفیف جنبشوں سے تھرتھرانے لگی دو لڑکیاں چلی آ رہی تھیں۔ ایک زرد لباس پہنے ہوئے تھی اور دوسری نیلی پوشاک!

وہ دونوں اپنے جواں جسموں پر احرامِ عصمت چست کیے ہوئے تھیں۔ ان میں سے ایک مغنیہ تھی اور دوسری رات کی نے نوازوں میں سے ایک۔

مغنیہ اپنی رفیقہ سے بلحاظِ عمر کہتر نظر آتی تھی مگر باعتبار جمال بہتر تھی اس کی نیلگوں مخمور آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اس کی دونوں پتلی پتلی بانسریاں کندھے کی ایک گل کار گرہ سے وابستہ پیچھے کو لٹک رہی تھیں۔ گل ہائے سوسن کی سرشتہ لڑیاں اس کی گول گول ٹانگوں پہ لپٹی

ہوئی اس کی نقرئی پازیبوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ با آخر وہ کہنے لگی "مرطو صیلہ! اپنی ننھی منی روح محبت کھو کر تو افسردہ نہ ہو۔ تیری رعودث کسی غیر سے محبت نہیں کر سکتی۔ شریر رفیقہ! کیا تو کبھی باور کر سکتی ہے کہ میں تیری بری اور بے وفا سہیلیوں میں سے ہوں یاد رکھ میں تیری ایسی ہم بستر بہن نہیں جو پہلے تو فورِ شوق میں تیرا نام ناخن انگشت پر کندہ کروائے مگر جب وہ ناخن بڑھ جائے تو کسی دوسرے کے ساتھ لو لگائے میرے زندہ ہوتے ہوئے تجھے میری کسی نشانی کی کیا ضرورت؟ ارے، میں تو ابھی عمرِ عروسی کو بھی نہیں پہنچ پائی۔ یاد ہے میں ابھی بہت ہی کم سن تھی جب میں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا۔ آہ، وہ ہمارا معصومہ عہدِ طفلی! وہ ہماری ماؤں کا ہمیں گود میں لیکر ایک دوسری کی طرف اچھالنا۔ وہ ہمارا ملکر پہروں حمامِ عام کے پاس گڑیاں کھیلنا۔ وہ ہمارا دیر تک ننگ دھڑنگ پھرنا۔ ہماری اصل محبت تو کہیں پانچ برس بعد جا کر شروع ہوئی تھی۔ ہے نا؟"

مرطو صیلہ نے جواب دیا "رعودث! کیا تجھے وہ دن بھی یاد ہے جب تو نے ایک تختی پر اپنا اور میرا نام لکھا تھا؟ ہماری محبت کا اصل آغاز تو اسی دن سے ہوا تھا۔ آہ، وہ دن اب کبھی واپس نہ آئے گا۔ خیر میرے لیے تو ہر روز محبت کا ایک نیا دن ہے۔ ہر روز شام کے وقت جب تو سو کر اٹھتی ہے تو میں یوں سمجھنے لگتی ہوں گویا میں نے تجھے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ میری نظر میں تو لڑکی نہیں ایک ننھی سی پری ہے۔ جو قادی کے جنگل سے بھاگی ہوئی جس کے تمام چشموں کا پانی اساطر فودیس نے پی پی کر ختم کر ڈالا — تیرا بدن شاخِ زیتون کی طرح نازک ہے اور تیری جلد آبِ جو کی طرح ملائم — ہائے میں ان گل ہائے سوسن پر نثار جو تیری ساقہائے سیمیں سے لپٹے ہوئے ہیں۔ میں ان نرگسی پھولوں پہ قربان جن کو تو اسطارطہ کی طرح بدن پر جا بجا سجائے ہوئے ہے۔ آہ! تیری ولادتِ سعید سے پیشتر تیری ماں لافانی ہستیوں سے آباد کس جنگل کے فرشِ سبزہ پہ سویا کیے؟ وہ کون سا آوارہ جل دیوتا تھا جو اس سے شبنمی گھاس پہ ہم کنار ہوا؟ جب ہم دونوں اس خوفناک افریقی

سورج کی دنیا سے کنارہ کش ہوں گی تو اے رعودث! تو مجھے اس چشمۂ آب پہ پہ چلنا جو رومانی سایوں سے جھلملاتے ہوئے بیابان میں واقع ہے جہاں ہر گنج اساطیروں اور حوران کوہ کے نقوش پا سے منقش ہے وہاں پہ تو کسی صاف چٹان پہ وہی تین الفاظ محبت لکھنا جن سے ہماری گم شدہ لوحِ محبت کی مومی سطح مزین تھی۔ آہ! ہماری وہ گم شدہ لوحِ محبت کہاں ہے جو ہمارے لیے وجۂ صد مسرت تھی؟ اے رعودث! سن! ذرا میری بات سن! ربۃ الفردوت کے کمر بند کی قسم جس پہ تمام انسانی خواہشات نوشتہ ہیں، میں اپنی تمام تر خواہشات قلب و نفس سے بیگانہ ہوں کیونکہ تو ہی میرے لیے سب کچھ ہے تو میرا خواب ہے اور تمام دنیا میری نظروں میں حقیر اور ہیچ ـــ تیرے سوا اس جہان میں میرے لیے کوئی دلچسپی نہیں کوئی کشش نہیں ـــ تو مجھ پہ نظریں ڈالتی ہے تو میں اپنے آپ کو دیکھنے لگتی ہوں، اور سوچنے لگتی ہوں کہ آخر تو نے مجھے کس وجہ سے پیار بھری نظروں سے دیکھا؟ کہاں تو کہاں میں! ـــ تیرے بال خوشۂ گندم کی طرح سنہری اور میرے بال موٹے بُنے کی طرح بھدّے، بے آب اور سیاہ ـــ تو گرانہ کے مُلعس کی طرح سپید اور میں ریتلے ساحل پہ اُگا ہوا شجر صنوبر! تو اگر میرے چہرے پہ کوئی جاذبیت دیکھتی ہے تو اے رعودث! خوش ہو کہ یہ محض تیری محبت آمیز نظروں کے طفیل ہے۔ اے رعودث! یقین کر کہ میرا کنوارپن پان دیو کے چھریرے ہونٹوں کی مانند ہے۔ جو شاخ حنا چبا رہے ہوں اور ایک تو ہے جس کی حقیقت دوشیزگی دہن معصوم کی طرح گل افروز اور لذیذ جانے کیوں تو مجھے چاہتی ہے؟ ـــ مگر ہاں، غور سے سن! اگر تو نے یہ محبت ترک کر دی اور اپنی نئی نواز بہن کی طرح سرِ عام دوسروں کی طرف مائل محبت ہوئی اور دوسرے کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی تو میں کبھی تنہا چین سے نہ مر سکوں گی۔ اور جب تو ملی البیح واپس آئے گی تو میں تجھے اپنے کمر بند سے مردہ لٹکی ہوئی ملوں گی۔

مرلو بتیلہ کے اس دردناک اور دل نگار المیۂ نغمہ کے تلتو سے رعودث کی

آنکھیں غمناک ہوگئیں مگر وہ کمسن دوشیزہ جلد ہی ہوش وحواس بجا کر کے قدرے مسکرائی اور پھر نہایت ساحرانہ انداز میں اپنی ایک ٹانگ پشتۂ سنگ پر رکھ کر بولی "مرطو! پھولوں کی لڑیاں میری ٹانگوں میں چبھنے لگی ہیں۔ انہیں اتار، پیاری مرطو، شکر ہے آج رات کا ہنگامِ رقص ختم ہوا۔"

مُغنیہ متحیرانہ انداز میں بولی "ارے ان چھچورے مردوں اور گستاخ چھوکریوں کا خیال تو مجھے بھول ہی رہا تھا۔ یاد ہے ان بدطینتوں نے تم دونوں کو کس طرح رقص کرنے پر مجبور کیا تھا؟ تو ایک باریک لباس میں تھی اور تیری بہن بالکل برہنہ ناچی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ میں نے تجھے بچا لیا ورنہ وہ تجھے بھی بے دھڑک اڑا لے جاتے۔ اف، کس قدر خوفناک تھا وہ منظر خرمستی! کیا تو نے کبھی اپنی بہن کی چیخیں سنی تھیں؟ اف! مرد کی محبت کس قدر تکلیف دہ اور کربناک شے ہے!"

رعودَش کے سامنے دو زانو ہو کر وہ ہار اتارنے لگی۔ ہار اتار چکی تو اس نے بدن پر چسپاں پھول اتارے اور بعدازاں پھولوں کی جگہوں کو بوسے دینے لگی۔ چومنے سے فارغ ہو گئی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ممنون رعودَش نے اپنی بانہیں اس کی گردن میں ڈال دیں اور اسے چومتی ہوئی بے خود ہو گئی۔

"مرطو! تجھے ان لوگوں سے حسد تو پیدا نہ ہوا ہو گا جو مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کیے! تھیا تو ان سب کے لیے کافی تھی۔ اسی لیے میں اسے وہاں چھوڑ آئی۔ پیاری مرطو! مجھے وہ لوگ پھر بھی کبھی بد نظروں سے نہ دیکھیں گے۔ اس لیے تیرا جذبۂ رقابت بیکار ہے!"

"جذبۂ رقابت؟ رعودَش بہن! میں ہر اس شے کی رقیب ہوں جو تیرے قریب آنے کی جرأت کرتی ہے۔ جانتی نہیں، میں تیرے اتارے ہوئے ملبوسات محض اس لیے پہن لیتی ہوں تاکہ انہیں واحد تیرے آشنائے جسم ہونے کا فخر حاصل نہ رہے ـــــ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ تیرے گیسوؤں میں آراستہ ہونے والے پھول تیری محبت کا دم بھرنے لگیں۔ میں ان پھولوں کو ارزاں کسبیوں کے حوالے کر دیتی ہوں تاکہ وہ ان کی بدمستیوں سے خوب مسلے جائیں میں نے آج تک تجھے کوئی تحفہ نہیں دیا کہ وہ تحفہ تجھے پا لینے کا دعویٰ کر دے گا۔ وہ چیز مجھے بری لگتی ہے

جسے تو والہانہ چھوتی ہے۔ ہر اس چیز سے مجھے ڈر لگتا ہے جسے تو غور سے تکتی ہے۔ کاش! تو اور میں کسی جیل خانہ میں مقید ہو جائیں۔ جہاں میں تجھے اپنی آغوشِ محبت میں چھپائے رکھوں اور کوئی نہ جان پائے کہ تو کہاں ہے؛ کاش میں وہ پھل بن جاؤں جسے تو شوق سے کھاتی ہے! وہ عطر بن جاؤں جو تجھے بے حد مرغوب ہے! میں تیرے مژگاں کے تلے تیرنے والی نیند بن جاؤں یا پھر مخصوص جذبۂ عشق جو تجھے ہر وقت بے چین کیے رہتا ہے۔ میں تو اس مسرت کی بھی رقیب ہوں جو تجھے مجھ سے حاصل ہے باوجودیکہ میں تجھے تمام جہان کی مسرتیں بہم پہنچانا چاہتی ہوں میرے جذباتِ رقابت کی شدت کا ذرا اندازہ تو کر، رعودتہ! مجھے تیری داشتاؤں سے سے ہرگز کوئی شکایت نہ رہے بشرطیکہ وہ مجھے بھی اس قابل بنا سکیں کہ میں تیری تمام امنگوں کی تشفی کر سکوں۔ رہا بوالہوس عشاق کا معاملہ، تو مجھے معلوم ہے تیرا کوئی عاشق نہیں کیونکہ تو کسی مرد کی خواہش کرنے سے عاری ہے۔ یہ بے درد اور سنگدل مرد!"

رعودتہ نہایت صدقِ دل سے بولی "میرے لیے تو یہی مناسب ہوگا کہ میں معبد طاموس میں پاپوس دیوتا کی مورتی کے روبرو اپنا تمام سرمایۂ عصمت و عفت پیش کر دوں اور اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاؤں مگر یہ کام میں آج صبح تک نہیں کر سکتی۔ رات کو بہت ناچنا پڑا! میرے پاؤں شل ہیں خستگی سے چور چور ہوں۔ جلد گھر واپس جانا چاہتی ہوں تاکہ تیری آغوش میں جلد از جلد خوابِ شیریں میں کھو جاؤں۔"

وہ ہنسی اور پھر کہنے لگی "برطو! آج ہمیں تھیاتو کو صاف صاف بتانا ہوگا کہ ہمارا اور اس کا تعلق ختم ہو گیا۔ وہ آئندہ ہم سے الگ دروازے کے پاس علیحدہ بستر پر سویا کرے گی۔ گذشتہ رات کے شرمناک واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد تھیاتو سے اب قطع تعلق ہی مناسب ہوگا۔ برطو! واقعی وہ نہایت خوفناک منظر تھا۔ کیا انسان واقعی اس طرح سے محبت کرتے ہیں؟ کیا یہی وہ شے ہے جسے لوگ عشق کہتے ہیں؟"

"بالکل یہی چیز!"

"لیکن وہ غلطی پر ہیں، مسٹر طو! انہیں کچھ معلوم نہیں۔"

اس پر مسٹر طو صبیلہ رعنا کی کمر میں باہیں ڈال دیں اور چند لمحوں کے لیے وہ دونوں خاموش ہو گئیں جب کہ بادِ صبحگاہی ان کے بالوں سے کھیل رہی تھی۔

اُس کے بال

"ہا ! مرطو . . . دیکھنا وہ کوئی آرہا ہے !" رعودت چلائی۔

مغنیہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو واقعی دور گودی کی سڑک پر ایک عورت تیزی سے چلی آرہی تھی۔

"میں اُسے جانتی ہوں !" مرطو بولی۔ "وہ کراسّس ہے زرد نقاب پہنے ہوئے۔"

"ارے، کیا وہ بن سنور کر نکل بھی آئی ؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتا۔ عام طور پر وہ تو دوپہر کے بعد نکلا کرتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو کافی دن ڈھلے مگر آج تو کوئی بہت ہی خاص بات ہوگی جو اس وقت چلی آئی۔ قسمت کی تو وہ دُھنی ہے جانے آج کس فتح مندی کے درپے ہے ؟"

وہ دونوں اسے آگے بڑھ کر ملیں اور ایک وقت بولیں "محترمہ کراسّس، آداب !"

"آداب۔ بھئی تم لوگ یہاں کب سے ؟"

"صحیح وقت تو یاد نہیں۔ ابھی دن تھا جب ہم آگئیں۔"

"کیا ابھی ابھی یہاں کوئی تھا ؟"

"نہیں تو۔"

"نہیں تو ؟ کیا سچ مچ ؟"

"جی ہاں۔ مگر اس استفسار کا مطلب ؟"

کراسّس جواب میں چپ رہی تو رعودت نے پوچھا "کیا آپ کسی کی تلاش میں اُدھر آئی تھیں ؟"

"ہاں شاید۔" کراسّس نے جواب دیا "مگر میرا خیال ہے اچھا ہی ہوا مجھے کوئی نہ ملا۔"

بھول کر ادھر کو مڑ پڑی۔ بس بے اختیار قدم اس طرف اٹھ آئے۔"

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ تو ہمیں بھی بتلائیے!"

"اوہ کچھ بات نہیں۔"

"ہم سے بھی راز داریاں؟"

"صبر کرو، پیاری بچیو! سارے شہر کی طرح تم لوگوں کو بھی خود بخود پتہ چل جائے گا۔"

"خوب!"

"ضد کی تو ممکن ہے نہیں دوسروں سے پہلے علم ہوجائے مگر صبح تک تو ضرور انتظار کرو۔ اس وقت میں ہرگز کچھ نہیں بتاؤں گی۔ عجیب و غریب واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ جی میں آتا ہے کہ تم لوگوں کو بتا ہی دوں مگر پھر خیال آتا ہے کہ فی الحال خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ کیا واپس نہیں چلنا؟ آؤ! آج تم لوگ میرے ساتھ سوؤ۔ میں آج اکیلی ہوں۔"

"اوہ! کرشسس، آج ہم بری طرح تھکی ہوئی ہیں، ہم گھر ہی کو واپس جا رہی تھیں سونے کے لیے۔"

"آج تو سونے کا ارادہ ترک کر دو، پیاری بچیو! آج ربۃ الفرودت کا جشنِ میلاد ہے۔ گویا آج کے روز سونا حرام ہے۔ اگر تم لوگ چاہتی ہو کہ دیوی تمام سال تمہیں خوشیاں عطا کرے اور سارا سال اپنی حفاظت میں رکھے تو آج تم دونوں بن سنور کر دیوی کے معبد میں حاضری دو۔ میرے ساتھ آؤ! آج تمہاری مشاطہ میں بنوں گی۔" — یہ کہہ کر کرشسس نے اپنی باہیں ان کی کمروں میں ڈال دیں اور ان کے نوخیز پستانوں سہلاتی ہوئی تیزی سے چل پڑی۔

اس دوران میں رعودت کے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ بول پڑی "جب ہم اکٹھی لیٹ جائیں تو آپ ہمیں اپنے دل کا حال ضرور سنائیے گا۔ آخر ہم بھی تو جانیں کہ آپ کس بات کی منتظر ہیں؟"

آج تو میں تم دونوں کو اتنی باتیں سناؤں گی کہ تم لوگ خوشی سے جھوم اٹھو گی مگر ہاں میں وہ بات نہیں بتاؤں گی جس کا علم تمہیں کل ہو گا۔۔۔۔ کل تک صبر کرو!"

"آپ خوش تر ہونے والی ہیں یا قوی تر؟"

"قوی تر"

اس پر رعودت نے آنکھیں جھپکائیں اور پھر چلائی "ہاں ہاں میں سمجھ گئی آپ ملکہ کی ہم بستر بننے والی ہیں؟"

"نہیں" کرائسس نے ہنس کر کہا "البتہ میں اس قدر قوی اور طاقتور ہونے والی ہوں جتنی خود ملکہ۔ کہو کوئی میرے لائق کام؟ کوئی خدمت جو تم دونوں کو مجھ سے مطلوب ہو؟"

"ہاں ہے!" رعودت دفعتہً فکر مند ہو کر بولی

"ہاں تو کیا چاہتی ہو تم؟"

"ایک نہایت ناممکن العمل چیز!۔۔۔۔۔ مگر اس کی توقع آپ سے۔۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

مگر طرصیلہ اس کی مدد کو فوراً ہی پہنچ گئی "بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے دیس عفسیوس میں رعودت اور مجھ الیسی نوخیز لڑکیاں آپس میں محبت کرنے لگتی ہیں تو وہ قانوناً ایک دوسرے سے شادی کر سکتی ہیں۔۔۔۔ رسم کے مطابق سب سے پہلے معبد اتھنا میں، انہیں اپنے احرامِ عصمت بھینٹ کرنے پڑتے ہیں بعد ازاں حرم عفیفو میں وہ دونوں اپنے بالوں کی لٹیں پیش کرتی ہیں اور آخر میں وانیوسس دیوتا کے حلقۂ حرم میں ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جاتا ہے۔ ان دونوں میں مردانہ صفات کی مالک لڑکی کو شوہر تصور کیا جاتا ہے۔ اور اسے ایک طلائی خنجر بمعہ ایک سفید چادر جہیز کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ شام کے وقت دولہن کو دولہا لڑکی اور نابیٔن کے سامنے ایک منقوش رتھ میں بٹھا کر مشعلوں اور نَے نوازوں کے جلو میں رخصت کر دیا جاتا۔ ان دونوں کو تمام حقوق ازدواج حاصل ہوتے ہیں، وہ

کم سن بچیاں اپنا سکیں اور انہیں اپنی پوشیدہ حیات معاشقہ کا لازمی جز دبنا سکتی ہیں۔ وہ جوڑا سماجی طور پر قابل احترام گردانا جاتا ہے۔ ان کا باقاعدہ گھر بار ہوتا ہے۔ توبہ ہے میری پیاری رعوذت کی زندگی کا سہانا خواب جو میرے خیال میں کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا کیونکہ اس دیس میں ایسی شادیوں کا رواج نہیں ہے —"

"اگر ایسا ہے تو ہم قانون بدلوا دیں گے"، کرآسس نے اعلان کیا — "اور تم دونوں کا بیاہ ہوگا۔ اور ضرور ہوگا میں اس کا بندوبست کر کے رہوں گی۔

"کیا سچ مچ؟" رعوذت خوشی سے لجاتے ہوئے بولی۔

"— اور ہاں، مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ تم دونوں میں سے شوہر کون بنے گی؟ — جانتی ہوں مرطو صیلہ میں وہ تمام مردانہ صفات ہیں جو ایک شوہر میں ہونی چاہئیں۔ رعوذت! تو خوش نصیب ہے کہ تجھے مرطو ایسی رفیقہ نصیب ہے، لاریب، ایسی ہستیاں فی زمانہ نایاب ہیں"

باتیں کرتے کرتے وہ سب کاشانہ کرآسس کے دروازہ پہ پہنچ گئیں جہاں کنیز جالا سن کا پارچہ بیٹھی بن رہی تھی۔ وہ تعظیماً اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے ہولی۔ اندر پہنچتے ہی نے نوانہ دوشیزاؤں نے اپنے کپڑے اتار پھینکے اور اس کے بعد جلدی جلدی ایک دوسری کا منہ دھلوا کر بستر پہ آلیٹیں۔

کرآسس ان دونوں کو نہ دیکھنے کے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ دراصل اس پہ ایک شدید عالم بے خودی طاری تھا۔ اس نے ہرچند چاہا کہ وہ اب گھر سے باہر کی باتیں بھول جائے مگر بے سود۔ دماطریس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن میں مسلسل گونج رہا تھا۔ اس کا یہ عالم خود فراموشی حیران کن تھا جس کے دوران میں کنیز جالا نے اس کے تمام ملبوسات اور زیورات — زعفرانی نقاب، کمر بند عبا، ہار، انگشتریاں اور چھاپیں، نقرئی ناگ اور طلائی پینیں — آہستہ آہستہ اتار بھی ڈالے مگر اسے خبر تک نہ ہوئی۔ وہ تو اس کے

نہایت طویل بال اس کے بدن پر ایک سنہری پھوہار کی طرح گرے تو وہ چونکی۔
یکایک اس نے اپنا آئینہ طلب کیا۔
جانے کیوں یہ خفقت انگیز احساس اس کے دل میں پیدا ہو گیا کہ وہ نہ حسین ہے اور نہ جمیل اور یہ کہ اس کا نیا طلب گار اس کے دامِ حسن سے نکلا جا رہا ہے باوجود اس شدید آرزو کے کہ وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ اپنے قریب، نہایت قریب رکھنا اور دیکھنا چاہتی تھی —— نہیں یہ بات یہ نہ تھی۔ وہ تو آئینے میں اپنی تمام تر رعنائی جمال کو جانچنا چاہتی تھی تاکہ اس کی تمام ناقابل فہم بے چینیاں دور ہو جائیں اور اس کا احساس خود اعتمادی قوی تر ہو جائے۔
چنانچہ آئینہ میں کر اس نے اپنے عریاں جسم کا ایک ایک عضو، ایک ایک حصۂ مقام غور سے دیکھا اور اپنے مرتعش ہاتھوں کی مشتاق انگلیوں سے سہلا دیا۔ اپنی جلد کی تابداریدی کا جائزہ لیا ایک طویل چمکار سے اس کی ملائمت کا اندازہ لگایا۔ اس کی حیات افروز گرماہٹ کی شدت کو محسوس کیا۔ اپنے مقیاس الشباب سینے کی پختگی اور اٹھان کو جانچا، جسم کی توانائی، گوشت کی چستی اور گیسوؤں کی لمبائی اور چمک کو بنظرِ تحسین دیکھا۔ برق افگن نگاہوں کی ساحرانہ قوتوں کو محسوس کیا۔ ہاں —— اس کا ذہن بدستور اظہارِ معانی کی بے پناہ صلاحیتیں اپنے اندر رکھتا تھا اور اس کا تنفس بدستور آتشیں تھا۔ ہر لحاظ سے مطمئن ہو کر اس نے اپنی سیمیں باہوں کو طویل بوسے دیئے اور نتیجتہً اس کا دل ملے جلے جذبات و احساسات کی آماجگاہ بن گیا جذبات و احساسات جو تحیر اور پندار نفس کا عکس تھے، جو بیک وقت خود اعتمادی، یقین کامل اور تذبذب و اضمحلال سے ماخوذ تھے۔
وہ دفعتہً مڑی جیسے اس مختصر لمحہ میں اسے اچانک کسی کی تلاش تھی مگر اپنے رنگین بستر پر صرف ان دو العطر کنواریوں کو پاکر جنہیں وہ اب تک بالکل بھولی رہی وہ قدرے مایوس ہوئی لیکن اس کے باوجود وہ ایک شعلہ جوالا کی طرح ان کی طرف لپکی، انہیں ایک دوسری کی گرفت سے الگ کیا اور پھر ایک بے پناہ عاشقانہ جوش کے ساتھ ان سے لپٹ گئی اور —— اس کے لانبے گھنے سنہری بال ان تینوں کے مست شباب سروں پر محیط ہو گئے۔

کتاب دوئم

جستجوئے حصول

باغات معبد

ایفرودت اسطارطہ کا معبد شہر کی فصیل کے باہر ایک گل بار اور سایہ دار سبزہ زار میں واقع تھا۔ نیل سے نکلی ہوئی آب جوئیں سارا سال اس گلپوش سبزہ زار کو سیراب کرتی تھیں۔ بطلیموس اول سے دو صدیاں قبل یہاں اس ہرے بھرے جنگل، اس اودے اودے مرغزار اور اس کی گہری جھیلوں اور شفاف چشموں کی جگہ ایک چٹیل ریگزار پایا جاتا تھا۔ ان باغات کے اشجار جنہیں بطلیموس اول کے فرمان شاہی کے مطابق لگائے گئے تھے آج نہایت تناور اور جسیم نظر آتے تھے۔ نیل کے زرخیز پانی نے چاروں طرف نرم نرم گھاس کے سدابہار وسیع و عریض مرغزار پیدا کر دیئے تھے، چشمے تالاب بن گئے تھے، غرضیکہ صناع قدرت کی فیاضیوں کے طفیل کل کی ایک معمولی تفریح گاہ آج ایک سرسبز و شاداب گلستان نظر آتی تھی۔

باغات کیا تھے ایک مکمل دیہاتی وادی تھی، نہیں بلکہ ایک مکمل جہان سنگین فصیل سے محصور، ایک مختصر مگر نہایت دلفریب کائنات جس کا مرکز کشش، جس کی روح رواں اور اصل حکمران دیوی کی مورتی تھی۔ باغات معبد کے چاروں طرف نو میل لمبا اور بتیس ۳۲ فٹ اونچا ایک ڈھلوان چبوترا تھا جسے فصیل کہنا غلطی ہوگا — یہ ایک بستی تھی چودہ سو گھروں سے آباد۔ ان گھروں میں اتنی ہی کسبیاں آباد تھیں محض ان کسبیوں کی خاطر نت نئے مختلف اقوام کے لوگ اس شبستان عشرت میں ہر روز آیا جایا کرتے تھے۔

ان گھروں کا عمارتی نقشہ ایک سا تھا۔ چونکہ دیوی سے نسبت کی وجہ سے تانبا اس

شہر کی متبرک وہات تھا اس لیے ان تمام گھروں کے دروازے تانبے کے بنے ہوئے تھے۔ ہر دروازہ پہ تانبے کی ایک تختی لگی ہوتی تھی جس پہ قورطینرہ کا نام اس کی خصوصیاتِ جمال مندرج ہوتیں، ہر تختی پہ ایک شوِ لنگ معلق ہوتا جو کھٹکھٹے کا کام دیتا تھا۔

دروازہ کے ساتھ ہی دونوں طرف ایک ایک حجرہ تھا۔ ان حجروں اور باغ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ تھا۔ داہنی جانب والا حجرہ جس کی مُرتفع مرمریں نشست پہ بیٹھ کر قورطینرہ اپنے چاہنے والوں کا انتظار کرتی "جلوہ گاہ" کہلاتا تھا۔ دوسرا حجرہ ان عافیت پسند آشفتہ مزاج انسانوں کے لیے وقف ہوتا تھا جو اپنے گھروں سے باہر سبزہ زار میں بیکار پڑے رہنے کی بجائے وہاں پر مزے سے شب بسر کرتے تھے۔ دروازہ کے آگے ایک برآمدہ تھا جو سیدھا صحن خانہ میں پہنچتا تھا۔ صحن جس میں ایک مصنوعی تالاب بھی تھا کے گرد ایک ستوں دار برآمدہ تھا۔ برآمدے سے ملحق سات رہائشی کمرے تھے اور سات کمروں کے آخر میں وہ مرمریں قربان گاہ تھی جس پہ حسن و عشق باہم ملتے ـــــ

ہر عورت اپنے وطن سے اپنے ساتھ ایک مورتی ضرور لاتی جو قربان گاہ کی زینت بنتی۔ تمام قورطینرائیں اپنی اپنی مورتیوں کو پوجتیں لکشمی، عسطورَیت، وینس (زہرہ)، عشطار، فارتیہ، بلیتا، سائیرس ـــــ یہ تھے ان کی معبود و منتخب دیوی کے چند نام جس کی پرستش چند علامتی اشیا مثلاً سرخ کنکر، مخروطی پتھر، تراشیدہ صدف کے ذریعہ کبھی کی جاتی۔ ان کسبیوں میں سے اکثر اپنے ساتھ ایسی چھوٹی چھوٹی مورتیاں لائی ہوئی تھیں جن کے بازو بے ڈول، چھاتیاں بھاری اور بھدّی اور کولہے بے ہنگم تھے۔ سبز چوبی پایوں پہ براجمان یہ مورتیاں نہایت بیباکانہ انداز میں مائل تعیش معلوم ہوتیں بہر کیف پجارنیں اُن کے قدموں میں حِنا کے پتے اور گلاب کی پنکھڑیاں ڈالتیں اور ہر دعائے مستجاب کے عوض لوبان سلگاتیں۔ مورتی اپنی پجارن کے تمام غموں کی راز دار، اس کے تمام اعمال کی عینی شاہد اور تمام نشاط ہائے شہوانی کی محرک تھی چنانچہ جب ایک قورطینرہ فوت ہوتی تو اس کی

محبوب مورتی کو اس کے نازک تابوت میں بطور محافظ گور رکھ دیا جاتا۔

ان عورتوں میں حسین ترین وہ تھیں جو ایشیائی سلطنتوں سے آئی ہوئی تھیں۔ ہر سال جہاز جو باجگذار اور دوست ممالک سے وصول شدہ خراج چرمی بوتلوں اور گانٹھوں کی شکل میں لاتے، اپنے ساتھ ایک سو ایسی کنواری لڑکیاں بھی لاتے جنھیں خادمانِ دین متبرک باغات کی خدمت کے لیے خاص طور پر منتخب کیا کرتے تھے۔ نصرانی، میسانی، فراغینی اور ترطینی لڑکیوں کے علاوہ اس درآمدہ متاعِ جمال میں اِقبطانہ اور بابل کی حسینائیں اور خلیج فارس اور گنگا کی پُرتر وادی کی دوشیزائیں شامل ہوتی تھیں۔ ان میں بعض سیمتن ہوتیں جن کے چہرے مجسموں کی طرح تراشے ہوئے نظر آتے تھے اور سینے متکبر۔ دوسری لڑکیاں جن کا روپ مٹیالا ہوتا، ناک میں طلائی چھلے پہنے ہوتیں۔ ان کے چھوٹے سیاہ بال شانوں تک بمشکل پہنچتے تھے۔ ان کے علاوہ ایسی بھی تھیں جو اور بھی زیادہ بعید ممالک سے آئی ہوئی تھیں۔ یہ سُست الوجود، پستہ قامت مخلوق جس کی زبان کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا نری زرد رُو بندریاں معلوم ہوتی تھیں۔ انکی طولانی آنکھیں ہر وقت ان کے اندرون خانہ قربان گاہوں کی طرف اشارے کرتی رہتیں۔ ان کے سخت مگر شب رنگ بال عجیب طرح سے سنورے ہوئے ہوتے وہ تمام عمر گم گشتہ راہ مویشیوں کی مانند گھبرائی گھبرائی سی نظر آتیں۔ شغلِ عیش کی تمام لطف انگیز حرکاتِ بدنی میں مشاق یہ ناریاں کسی کو اپنا منہ چومنے نہ دیتیں۔ عشق و محبت کے ہنگاموں کے درمیانی لمحاتِ فراغت میں وہ زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتیں اور ایک دوسرے سے بچگانہ چھیڑ چھاڑ کرتیں۔

باغ کے ایک گوشۂ خلوت میں سنہری بالوں والی دخترانِ نیل ریوڑ کی شکل میں جمع ہوئی تھیں اور وہیں گھاس پر دھندا کرتی تھیں۔ چند بربری ساحلی حسینائیں جن کی رانیں سڈول تھیں اور کاندھے مضبوط، اپنے بالوں کی تین لٹیں بناتی تھیں، پتوں کے ہار پہنتی تھیں اور فرصت کے اوقات کشتی بازی میں گزارتی تھیں۔ رجت دار چپٹی ناک اور کشادہ سینوں والی بناتِ سقالیہ

بہیمانہ اسالیبِ مجامعت کی عادی تھیں۔ دیو پیکر طیوطی معشوقائیں اپنے عمر رسیدہ مردوں کے سے بھورے بالوں اور بچوں کے سے نازک جسموں کی وجہ سے مصری عشاق کے لیے خاص طور پر وحشت ناک ثابت ہوتیں نگارانِ غال اپنی سرخ جلد اور بے سبب قہقہہ بازی کے لیے مشہور تھیں سبز چشم سلطیکی عورتیں بے حجابانہ کبھی باہر نہ نکلتی تھیں۔ ملیح سینہ عبرانی خواتین دن کے وقت مصروف کار ہوتی تھیں۔ وہ اپنے بال نہایت توجہ اور سلیقہ سے بنائیں مگر نگر جانے کیوں اپنے ہر وقت تھرتھرانے والے پیٹ کے بال صاف نہ کرتی تھیں نازنینانِ اسکندریہ اپنے سڈول جسموں پر نازاں تھیں کیونکہ وہ ان سے رقص اور عشق کا کام لیتی تھیں دخترانِ افریقہ جن میں سپید نقاب پوش دمیدہ والیاں، جالی دار ملبوسات کی شائق کار تھیجینز اور رنگ برنگی پوشاکوں کی شوقین حبشنیں شامل تھیں، تنادر کھجوروں کے زیر سایہ وقت گزارتی تھیں ــــ

تعداد میں وہ کل چودہ ۱۴۰۰ سو تھیں۔

ان باغات میں عورت ایک بار داخل ہو کر صرف اپنی پیری کے یوم آغاز پر ہی باہر نکلتی تھی۔ اس کی نصف کمائی معبد کو جاتی اور بقیہ نصف اس کے نان و نفقہ کی کفیل ہوتی۔ یہ عورتیں کسی کی غلام تھیں نہ لونڈی۔ وہ اپنے گھروں کی مالک تھیں۔ البتہ ہر کسی کی قدر و قیمت دوسری سے مختلف تھی۔ نسبتاً زیادہ خوش نصیب قورطینرائیں ان عورتوں کے گھر خرید لیتی تھیں جو فاقوں سے بچنے کے لیے ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتیں بدنصیب عورتیں اپنے گھر بیچ دینے کے بعد اپنی کریہہ منظر مورتیوں کے ساتھ پارک میں آ ڈیرہ جماتیں اور وہیں بقیہ زندگی کے دن گزار دیتیں۔ ان زیر آسماں ڈیرہ دارنیوں کے پاس صرف مفلس اور قلاش تاجر لوگ آتے تھے۔ اپنی انتہائی ناقدری کی صورت میں وہ بدبخت عورتیں آپس میں بٹ جاتیں اور اس کے بعد وہ کلفتوں کا مداوہ ایک دوسرے کی آغوش میں تلاش کرتیں۔ چند ایسی بھی ہوتیں جنھیں کوئی ہمدرد و غم گسار سہیلی نہ ملتی اور آخر وہ تنگ آ کر خوش حال قورطینراؤں

کے یہاں بلازمت کرلیتیں، عام رواج کے مطابق ایک گھر میں بارہ[۱۲] سے زائد خادمائیں رکھنا ممنوع تھا۔ بہرکیف اس دیارِ حسن آباد میں بائیس تورطینزائیں تھیں جن کے یہاں بارہ بارہ[۱۲] خادماؤں کا بوقلموں عملہ موجود تھا۔

اگر سوئے اتفاق سے کسی تورطینزہ کے ہاں بچہ پیدا ہو جاتا تو بچے کو پرورش کے لیے فوراً معبد بھیج دیا جاتا تاکہ وہ بڑا ہو کر اپنے معبود کی صحیح پرستش اور خدمت کر سکے۔ بچی پیدا ہوتی تو وہ لازماً دیوی کے لیے وقف متصور ہوتی۔ پیدائش کے پہلے روز ہی اسے علامتی طور پر دانیوّس کے لڑکے سے بیاہ دیا جاتا۔ پیشوائے معبد بذاتِ خود ایک چھوٹے سے طلائی چاقو سے بچی کا پردۂ بکارت چاک کرتا کیونکہ ربۃ الفردوت کے نزدیک دوشیزگی ایک عیب تھی۔ اس کے بعد بچی کو معبد کے عقب میں واقع شہرۂ آفاق دیداشیلون یعنی "جامعہ فنون المعاشقہ"[۱۳] میں داخل کر دیا جاتا۔

اس بے نظیر جامعہ کی سات جماعتوں میں کم سن بچیوں کو قول اور عمل سے فنون تعیش کی تربیت دی جاتی مثلاً انداز ہائے نگاہ، اسالیب ہم آغوشی، حرکات بدنی، اشکال لمس اور دوران مقاربت دانتوں، زبان اور ہونٹوں کے پُراسرار فن الفن —— غرضیکہ عشق کرنے کے تمام ڈھنگ عملی مظاہروں کی مدد سے سکھائے جاتے۔ طالبہ کو اپنے اولیں عملی تجربہ کے لیے وقت منتخب کرنے کی پوری آزادی تھی کیونکہ تحریک نفس کی ابتدا کو دیوی کا منشائے خاص خیال کیا جاتا تھا اور اسے آسودہ نہ کرنا معیوب تھا۔ چنانچہ جس دن کوئی طالبہ دنیائے عمل میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کرتی اسی دن چبوترے پر اسے ایک مکان دے دیا جاتا۔ ان میں سے بعض بچیاں جو بظاہر ابھی شادی نا قابل نظر آتیں حلقہ ہائے تورطینزگان میں نہایت مقبول اور ان تھک شمار ہوتی تھیں۔

دیداشیلون جو سات کلاسوں، ایک مختصر تمثیل گاہ اور مرتفع صحن پر مشتمل تھا بائیس[۲۲] ایسی رنگین روغنی تصاویر (فریسکوز) سے مزین تھا جنہیں فن معاشقہ کے جامع اسباق

کہا جا سکتا تھا۔ یہ فرسکو ز اسکندریہ کے واحد شخص کلیوجرتیس جیسے لوگ استادِ فن عپالیس کا بیٹا اور شاگرد کہتے تھے ہی زندگی کا نچوڑ تھے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک ان عظیم فرسکو ز پہ کام کرتا رہا کچھ عرصہ پیشتر ملکہ برنیس نے جو اس مشہور جامعہ کی سرپرست تھی اور اپنی تین چھوٹی بہنوں کو تحصیل علم کے لیے جامعہ میں داخل بھی کرا چکی تھی، دماطریس سے دیدا شیلون کی آرائش کے کار ناتمام کو مکمل کرنے کی فرمائش کی تھی چنانچہ اب تک دماطریس کا صرف ایک مرمریں مجسمہ جامعہ میں نصب ہوا تھا۔

ہر سال کے اختتام پہ معبد کی تمام قورطنیزاؤں کی موجودگی میں بربادی کا ایک زبردست مقابلہ ہوتا جس کے بارہ انعامات کے حصول کی خاطر وہ سب کی سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ کامیاب عورتیں معبد کے حرمِ خاص قیطیشن ـــ میں داخلہ کا وہ وقار آفریں حق حاصل کرتیں جس کا حصول ان کی زندگی کا حسین ترین خواب ہوتا تھا۔

قیطیشن کا ماحول اس وقت اس قدر پردہ راز میں رکھا گیا تھا کہ اس کی وضاحت زمانۂ حال میں ناممکن ہے۔ ہمیں صرف اس قدر علم ہے کہ یہ ایک مثلث نما احاطہ تھا جو قیطیشو دیوی کے معبد سے ملحقہ باغ میں واقع تھا اور جہاں اس دیوی کے نام پر انتہائی خوفناک عیاشانہ خرمستیوں کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ اس احاطہ کے دو طرف اٹھارہ حجرے موجود تھے جن میں اس دیارِ حسن آباد کی وہ چھتیس ۳۶ قورطنیزائیں مقیم تھیں جو صرف روسا اور امرا کے لیے مخصوص تھیں اور اس وجہ سے جمالستان اسکندریہ کی معزز ترین معشوقائیں مانی جاتی تھیں۔ مہینہ میں ایک بار جب مہِ کامل کی تابانیاں اپنے نقطہ عروج پہ ہوتیں وہ سب کی سب ہیجان خیز مشروبات کے خم پہ خم چڑھا کر معبد کے اندر جمع ہو جاتیں۔ اس وقت ان کی کمروں میں شوخ رنگی زنجیریں بندھی ہوتی تھیں۔ جشن سے پہلے ان چھتیس ۳۶ میں سب سے بڑی کو ایک نہایت اشتعال انگیز اور شباب آور شربت کا جرعہ سم آلود پلایا جاتا جس کے بعد یقینی موت کا شدید احساس اس مدہوش عورت کو ایسی خوفناک خرمستیوں پر اکساتا تاکہ تماشائی خوف سے کانپنے لگتے ـــ آن کی آن

میں اس کا کف آلود جسم اس تمام ہنگامہ فواحش اور اس تمام خرابۂ حرمتی کا مرکز بن جاتا۔ وہ کراہتی، تلملاتی، چلاتی، چیخیں مارتی، روتی گڑگڑاتی جاتی اور دوسری ننگ دھڑنگ شہوانی ہیجان سے بیکل عورتیں اس کے جسم سے لپٹتیں، اس کے عرق بدن میں اپنے بال تر کرتیں، اس کے ملتہب جسم سے اپنے جسم رگڑتیں اور اس طرح اس قریب المرگ عورت میں ایک نیا جنسی جوش، ایک نیا عیاشانہ خروش، ایک نئی نفسانی تڑپ اور ایک نئی شہوانی کیفیتِ انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ تین سال تک وہ عورتیں اس طرح زندگی گزارتیں اور بالآخر بدمستی کی شدت سے مر جاتیں۔

کثیر الاشکال الفرودت کے نام پر ان عورتوں نے اور بھی کئی ایسے حرم خانے بنا رکھے تھے جن کا درجہ احترام نسبتاً کم تھا۔ دیوی یورانیہ تک کی قربان گاہ موجود تھی جہاں جذباتی قسم کی قورطینرائیں پاکیزہ منتیں مانتی تھیں۔ دیوی عسطرونہ کا مندر ناکام محبتوں اور نامرادیوں کی یاد کو دل سے محو کرنے کے لیے مشہور تھا۔ دیوی کرائسہ کے طفیل متمول عشاق نصیب ہوتے تھے۔ تولیدس کے یہاں حاملہ ناکتخدائیں نذر و نیاز کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ کالی کا مندر بہیمانہ خواہشات کی تسکین کے لیے بہترین جگہ تھی۔ گویا یہ قربان گاہ عشق میں حرکت جارحہ کے نظریہ کی علمبردار تھی۔ اس میں کلام نہیں کہ ان خاص قربان گاہوں کی بدولت حاجت مندوں کی تمام مرادیں بر نہ آتی تھیں اس کے باوجود ان کی نگہداشت اور دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کی جاتی۔ ایک تکیہ تھی جس کی وہ سب فقیر تھیں۔ کسی کے دل کی کوئی مراد بر آجاتی تو پھول چڑھائے جاتے لیکن ناکامی کی صورت میں بعض عورتیں قربان گاہ کی بے حرمتی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔ دراصل یہ قربان گاہیں چونکہ باعتبار حرمت زیادہ بلند نہ تھیں، اس لیے ان پر پیشوا مامور نہ تھے اور نتیجۃً ان کی بے حرمتی کی مرتکب قورطینراؤں کو سزا نہ دی جا سکتی تھی۔

معبد اعلیٰ کا نظم و ضبط البتہ بالکل مختلف تھا۔

معبد اعلیٰ — عظیم معبودہ کا عظیم معبد — متبرک ترین اسطارطیون — مصر کا مقدس

تریں مرکز عبودیت —— ایک عظیم الشان عمارت تھی جو تین سو چھتیس ۳۳۶ فٹ لمبی تھی اور سطح باغ سے مرتفع۔ اس کے چاروں طرف ستر۷۰ سیڑھیاں تھیں۔ اس کے بارہ طلائی دروازوں پر ایک ایک دوزجیا لڑکی بطور دربان مامور تھی۔ یہ دو جنسی دربان عملرات کی بارہ رنگین ساعتوں میں عورت اور مرد کی تمام تر باہمی آویزشوں کا نمائندہ تھا۔ اسطارطیوں کے بڑے دروازہ کا رُخ مشرق کی بجائے شمال مغربی سمت کو تھا اور اس وجہ سے سورج کی شعاعیں اس ہمیشہ باقی رہنے والی اور تمام تر اشغال و نشاط ہائے شبلیہ کی ترجمان دیوی کے حرم خاص میں داخل نہ ہو سکتی تھیں۔ مورتی کی پشت کی جانب چھیاسی ۸۶ ارغوانی رنگ ستون تھے جن کے سہارے وہ عظیم نگارخانہ قائم تھا جو ہم جفت مرمریں مجسموں کا ایک ہوش ربا جہاں تھا —— نہیں وہ ایک جنگل تھا بہیمانہ خرمستیوں کا، ایک بیاباں تھا جنسی بدمستیوں کا جہاں انسان اور حیوان ایک بے پناہ عالمِ وجد میں آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ دیوی کے مہیب مجسمہ کے قدموں میں ان نو وفائر کے خالق کا اپنا مجسمہ تھا۔ یہ مجسمہ جنسی جذبات سے عاری ناعورتوں کے ناتمام چھوٹے چھوٹے مومی مجسموں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا تھا گویا عظیم بت تراش کا مثالی تصور حسن عشق، اس کے بے عیب ذوق نظر اور اس کا بے داغ حسن سیرت اس دلفریب پھولوں کے سے جھرمٹ میں تسکینِ مطلق تلاش کر رہا تھا۔

ملیتا

"اجنبی، پاک ہو لو۔"

"میں پاک ہو کر ہی داخل ہوں گا۔" دماطرلیس نے جواب دیا۔

نوعمر دربان لڑکی نے اپنے بال پانی میں بھگوئے اور اس کے بعد سب سے پہلے اس کے پپوٹوں کو صاف کیا اور بعد ازاں اس کے لبوں اور انگلیوں کو تاکہ اس کی نگاہ پاک، ذہن چومنے کے قابل اور ہاتھ مساس بدنی کے لائق ہو جائیں۔

اس رسمی طہارت سے فارغ ہو کر دماطرلیس ربۃ معبد الفرودت سے ملحقہ باغ میں گھس گیا۔

افق مغرب پہ سورج ڈوب رہا تھا۔ خیرہ کن تابانیوں سے مقرابہ آفتاب۔ اس اہم دن کا آفتاب تھا جس کی اولیں نیم روشن ساعتوں میں کرائسس دماطرلیس سے ملی تھی۔ اور اس کے بعد سے اب تک وہ نظاروں پہ لوٹتا چلا آ رہا تھا۔

عورت فطرتاً اس قدر سادہ واقع ہوئی ہے کہ مرد اس لطیف حقیقت کو بآسانی نہیں تسلیم کر پاتا۔ جانے وہ ایک مستقیم راہ پر پیچ موڑ کے لیے کیوں بضد رہتا ہے۔ اس راہ پر گامزن ہوتے ہی وہ خواہ مخواہ پیچیدگیوں میں الجھ جاتا ہے۔ مثلاً کرائسس جس کی روح فی الواقعہ ایک بچے کی روح کی طرح شفاف اور بے داغ تھی جانے کیوں دماطرلیس کے نزدیک ایک اچھا خاصا مافوق الطبیعاتی مسئلہ بن گئی۔ اس سے رخصت ہو کر جب وہ اپنے گھر کی طرف روانہ تو وہ اپنے آپ کو خوابی دنیا میں محسوس کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات کی بھرمار تھی۔ سوالات جن میں سے ایک کا بھی جواب اسے نہیں سوجھ رہا تھا۔ آخر اُسے ان تین تحائف کا کیا کرنا تھا؟ وہ نہ تو چرایا ہوا ایک مشہور

عالم آئینہ استعمال کر سکتی تھی نہ ایک معقول عورت کا شانہ بازار میں بھیج سکتی تھی اور نہ دیوی کا ہار زیب گلو کر سکتی تھی؟ وہ اگر ان تحائف کو صرف چھپائے رکھنا چاہتی تھی تو اس صورت میں بھی راز فاش ہونے کا خطرہ تھا۔ کیا وہ انہیں ایک بار حاصل کرنے کے بعد برباد کر دینا چاہتی تھی؟

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عورت کو مخفی اشیا خواہ وہ کتنی ہی نایاب کیوں نہ ہوں، خوشی نہیں بخشتیں۔ علاوہ اس کے انتہائی مسرت رکن واقعات بھی عورت کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتے جب تک کہ ان کا تمام دنیا کو علم نہ ہو جائے۔ جانے اسے کس طرح معلوم ہو گیا، جانے اس کی چشم باطن نے کس طرح بھانپ لیا کہ اس کی خاطر وہ ہر سہ جرائم کے ارتکاب پر رضا مند ہو جائے گا؟ — اس میں شک نہیں کہ اگر وہ چاہتا تو اسے اغوا کروا سکتا تھا۔ اسے اپنے قدموں پر ڈال سکتا تھا اور اس صورت میں جو سلوک چاہتا اس سے روا رکھتا — ایک داشتہ، ایک بیوی، نہیں وہ اسے اپنی لونڈی بنا کر رکھ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تو اسے قتل کروا دیتا گزشتہ انقلابات کی وجہ سے شہری آبادی قتل کی واردات کی اس قدر زیادہ عادی ہو چکی تھی کہ ان کے نزدیک ایک قرطبیہ کا قتل تو بالکل ہی کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ کراسٹس ان حقائق سے غالباً غافل نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس نے جسارت کی کہ وہ . . . . ؟

وہ جوں جوں کراسٹس کے متعلق سوچتا گیا توں توں اس کا دل ملول و مضمحل ہونے کی بجائے یک گونہ انبساط سے سرشار ہونے لگا۔ اس نے کراسٹس نے اپنے اظہار مدعا اور اس کے حصول کے لیے نہایت اچھوتے پن سے کام لیا تھا اور اس کی مخصوص طرز ادا فقط اسی کا حصہ تھی کیونکہ اس کی جگہ اس ایسی۔ نہیں بلکہ اس سے حسین تر عورتیں اپنے آپ کو پیش کرنے کے لیے وہی فرسودہ طریق اختیار کرتیں جو مرد کو عموماً ناپسند ہوتا ہے کراسٹس کی فرمائشوں کے کیا کہنے! اس نے محبت مانگی اور نہ سونا اور نہ ہی جواہرات بلکہ ان کی بجائے تین سنگین جرائم کے ارتکاب کی فرمائش کی اور اس طرح وہ اس کے دل، اس کے دماغ، اس

کی روح بلکہ اس کی پوری ہستی پر محیط ہو گئی۔ اس نے اس بے مثال حسینہ کو مصر کے تمام خزانے دینا چاہے تھے مگر وہ ۔۔۔ وہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کے بظاہر حسین و دل فریب پیشکش کی حقیقت سے آگاہ تھی، وہ ۔۔۔ وہ بڑی حد تک دوالوال دے دیتا چہ جائیکہ مصر کی تمام دولت اس پر نچھاور کرتا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ اس کے عامیانہ طرزِ اطاعت سے اس قدر دل برداشتہ ہو جاتا کہ اُسے حاصل کئے بغیر ہی اپنی راہ پر لگ جاتا۔ تین سنگین جرائم کے ارتکاب کا مطالبہ بلاشبہ ایک نہایت غیر معمولی فیس تھی لیکن وہ اس معاوضہ کی ہر لحاظ سے مستحق تھی۔ اب تو وہ اس معاوضۂ حسن کی اور بھی زیادہ مستحق تھی جب کہ وہ اس کی ادائیگی کے لیے نہ صرف یہ کہ کوشاں تھا بلکہ اپنی زندگی کی بازی لگا چکا تھا۔

اسی دن یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں اس کا ارادہ متزلزل نہ ہو جائے وہ سیدھا بخیتؔ کے یہاں پہنچا۔ تمام گھر سونا پڑا تھا، چنانچہ وہ بتائی ہوئی جگہ سے آئینہ چرا کے سیدھا باغات معبد کی طرف ہو لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بخیتؔ کے یہاں سے سیدھا کرنسٹس کے دوسرے شکار کی طرف چلا جائے گا۔ لیکن وہ احتیاطاً رُک گیا طاؤنی ۔۔۔ پیشوائے اعظم کی بیوی ایک نہایت دلفریب اور نازک بدن عورت تھی، دماطریس کو خطرہ تھا کہ اسے دیکھ کر اس کا دل پسیج جائے گا۔ طبیعت خواہ مخواہ مائل تعیش ہو جائے گی۔ اس لیے وہ اس کے پاس جانے سے پہلے معبد سے ملحقہ حسن آباد چبوترے کی طرف نکل آیا۔

قوطنیزایس اپنی اپنی جلوہ گاہوں میں اس طرح سج دھج کر بیٹھی تھیں جس طرح بلوری صندوقوں میں پھول۔ ان کے حسب نصب، ان کی نسل اور ان کی عمروں کے تضاد ان کی وضع قطع اور ملبوسات کے باہمی اختلاف میں بھی نمایاں تھا۔ ان میں سب سے زیادہ خوبصورت کسی نامعلوم رواج کے مطابق صرف اپنے بیضوی چہروں کے سوا سر سے پاؤں تک نفیس اُدنی پوشاکوں میں ملبوس تھیں۔ دوسری اس قدر مہین نقاب اپنے اوپر ڈالے ہوئے تھیں جن سے مقصود ہی بدن کی پر اسرار رعنائیوں کو نمایاں کرنا تھا۔ ان کی

نقاب بردوش، دلفریب رعنائیاں مسکن پانی میں نظر آنے والے سایہ دار گوشوں اور ہری ہری ریشمی گھاس کے قطعات کی مانند تھیں۔ وہ عورتیں جن کی تمام ترکشش اور جاذبیت کا دارومدار فقط شباب تھا وہ کمر تک برہنہ نہایت دلبرانہ انداز سے تن کر بیٹھی تھی تاکہ دیکھنے والا ان کے سینوں کی دلپذیر پختگی اور باغیانہ اٹھان کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ لیکن وہ جو تجربہ کار اور جہاندیدہ تھیں اور سمجھتی تھیں کہ ایک عورت کا چہرہ اس کے بدن کی نسبت جلد پژمردہ ہو جاتا ہے بالکل عریاں بیٹھی تھیں۔

دماطریس ٹہلتا ہوا ان کے سامنے سے گذر رہا تھا اور مطلق کسی قسم کی بیزاری محسوس نہ کر رہا تھا۔ عورت کے عریاں جلوے اس کے دل میں ہمیشہ جذبات تحسین بپا کر دیتے تھے آج نہ تو بھی ہوئی جوانیاں اس کے دل میں جذبۂ تنفر پیدا کر رہی تھیں اور نہ کمسن معشوقاؤں کی ناپختہ عشوہ طرازیاں اُسے کوفت پہنچا رہی تھیں۔ آج شام تو کوئی سی عورت بھی اسے مسحور کر سکتی تھی بشرطیکہ وہ خاموشی پسند ہو اور بستر عیش پر کوئی ایسی حرکت نہ کرنے والی ہو جو نادرا تکلف پر مبنی ہو۔ چنانچہ آج وہ اس عورت سے یہ بات تک بھی نہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آیا وہ واقعی حسین ہے ؟ بلکہ اگر وہ واقعی کریہہ منظر ہو گی تو اور بھی بہتر بات ہو گی جب کہ آج جمال کامل کا محض تصوّر ہی اس کی نفسانی خواہشات کو ختم کرنے کے لیے کافی ثابت ہو رہا تھا۔ کسی جاندار حسُن کے نقش سے پیدا ہونے والا اضطراب اس کے معاملہ میں ایک ایسا نفسانی انتشار تھا جس کا تعلق خاص طور پر اس کے دماغ سے ہوتا تھا اور جو اس کے معمولی جنسی ہیجان کے لیے قاتل ثابت ہوتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کس طرح ایک دفعہ ایک کافر جمال عورت کی آغوش میں تمام رات بیکار پڑا رہا تھا اور اپنی اس بے حسی پر حد درجہ نادم ہوا تھا۔ جانے کیوں وہ جمال تاباں کی تاب نہ لا سکتا تھا؟ چنانچہ اس رات کے بعد اس نے ہمیشہ کم خوبصورت عورتوں کو اپنے لیے چُنا۔

"دوست! مجھے بھول گئے کیا؟" کسی نے پکارا۔

وہ مڑا گر سر ہلا کر جلدی سے آگے بڑھ گیا کیونکہ وہ ایک ہی عورت سے دوبار محبت کرنے کا قائل نہ تھا۔ صرف یہی ایک اصول تھا جس پر وہ باغات معبد میں کاربند رہتا تھا۔ ایک مرد کے پاس پہلی دفعہ آنے والی ہر عورت اپنے اندر یک گونہ کشش دوشیزگی رکھتی ہے مگر دوسری مرتبہ وہ ہرگز ہرگز کوئی ادائے تحیر پیش نہیں کر سکتی۔ چنانچہ دماطریس کو ایک ہی عورت سے دوسری رات بسر کرنا گوارا نہ تھا۔ رہا ازدواجی امنگوں کو آسودہ و مطمئن کرنے کا سوال تو اس کے لیے ملکہ عالیہ کا وجود کافی تھا۔ چنانچہ دوسری عورتوں میں سے وہ ہر رات ایک نئی رفیقۂ عیاشی کے لیے تلاش کرتا تھا۔

"قلوتارئین!"

"ناتھیلین!"

"فلانگو!"

"منائیزا!"

"کرو بائیل!"

"عیوسہ!"

ہر نو رطینرہ نے اپنا اپنا نام پکارا جب وہ ان کے سامنے سے گذرا۔ ان میں سے بعض نے اپنی آتشیں طبیعت کا ذکر کیا اور دوسریوں نے اپنی ان تھک صلاحیتوں سے لطف اندوزی کی پیشکش۔ مگر دماطریس نے کسی کی بات پر توجہ نہ کی اور اپنی دھن میں بڑھتا گیا۔ حسب عادت آج بھی وہ کسی کو اندھا دھند چن لینا چاہتا تھا لیکن جب ایک کمسن لڑکی نے اچانک اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تو گویا آج عیش کا ارادہ ہی نہیں!" تو وہ اس غیر متوقع اور غیر رسمی طرز سلام و دعا سے چونک گیا اور دفعتہً رک کر بولا "دروازہ کھولو! مجھے تم پسند ہو۔"

نیلی پوش لڑکی یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑی اور فوراً ہی اپنے دروازہ کے شونگی

کھٹکھٹے کو ہلانے لگی۔ جلد ہی ایک معمر خادمہ اندر سے نکلی۔
"غورغہ!" لڑکی بولی۔ "مہمان آیا ہے۔ جلدی سے قورطبینی شراب اور کیک لاؤ ـــ اور ہاں مہمان کے لیے بستر سجاؤ!"
اس کے بعد وہ دماطریس سے مخاطب ہوئی۔ "کسی شباب اور مشروب کی ضرورت؟"
دماطریس زیرِ لب مسکرایا اور بولا "نہیں۔ مگر کیا تمہارے پاس ہیں؟"
"رکھنے پڑتے ہیں۔ دھندا جو کرنا ٹھہرا۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ کی توقع سے زیادہ لوگ ان مشروبات کے عادی ہیں۔ خیر چھوڑیئے اس قصہ کو ـــ آیئے! تشریف لایئے میرے ساتھ! سیڑھیوں کا خیال رکھیں۔ ان میں سے ایک شکستہ ہے۔ آپ حجرہ میں فروکش ہوں میں ابھی حاضرِ خدمت ہوتی ہوں!"
یہ حجرہ بالکل ہی ایک مبتدی قورطبیرہ کا معلوم ہوتا تھا۔ اس میں ایک کشادہ پلنگ، ایک تکیہ اور چند کرسیاں پڑی تھیں البتہ اس کے دریچے میں سے باغات معبد، سمندر اور بندرگاہِ اسکندریہ کا منظر خوب بھلا معلوم ہوتا تھا۔ بیکار کھڑے کھڑے اس نے فاصلہ پر نظر آنے والے شہر کو دیکھنا شروع کر دیا۔

بندرگاہ کے عقب میں ڈوبتے سورج کے مناظر ـــ ساحلی شہروں کا بے مثال حسن سکونِ افلاک اور سمندر کی ارغوانی کیفیاتِ اضطراب ـــ انہیں دیکھ کر وہ کون سی مائل فغاں روح ہے جو خاموشیوں میں ڈوب نہیں جاتی۔ وہ کون سے مائل رفتار قدم ہیں جو رک نہیں جاتے؟ وہ کون سا شغلِ عیش ہے جو سناٹے میں نہیں آجاتا اور وہ کونسی آوازیں ہیں جو خود بخود واصلِ سکوت نہیں ہو جاتیں؟ ـــ دماطریس گم سُم محو نظارہ تھا۔ آغوشِ سمندر میں محوِ استغراق آفتاب میں سے ایک شعلہ آسا موجِ نور پھوٹ پھوٹ کر بیابانِ لبِ سمندر کے خمیدہ ساحل پہ محیط ہو رہا تھا افق تا افق ارغوانی نور کی

تھرتھراتی ہوئی ضیا پاشیاں بحیرۂ روم میں ایک رنگین تلاطم پیدا کر رہی تھیں۔ اس پُرشکوہ نور اور جھیل مرالمس کی سبزی مائل بلوری سطح کے درمیان نظر آنے والے شہر پر منعکس رنگینیاں کھیل رہی تھیں۔ شہر کے متنوع الاشکال ہیں ہزار مکانات افق مغرب کی آہستہ آہستہ ماند پڑتی ہوئی شعاع ریزیوں کے زیر اثر تیزی سے ایک دوسرے میں گھل مل رہے تھے۔ تب چشم زدن میں سورج ڈوب گیا اور اس کے ساتھ ہی تعطرِ شب کی اوّلیں دلآویز لہر دوشِ ہوا پر سوار ہو کر ایک لرزاں لبادۂ حجاب کی طرح دنیا پر چھا گئی ——

"یہ رہیں! انجیریں اور کیک، شہد اور شراب۔۔۔ اور ایک عدد عورت! آپ انجیر ضرور کھائیں جب تک کہ وہ سامنے پڑے ہوں۔ البتہ جب وہ ختم ہو جائیں تو عورت۔۔۔۔۔!"

لڑکی واپس آگئی تھی اور اب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ بالآخر لڑکی نے اُسے بٹھایا اور بعد ازاں اس کی رانوں پر بیٹھ کر اپنے سنہری بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سنوارنے لگی تاکہ ان میں پیوستہ گلاب کا پھول کہیں گر نہ جائے۔

اپنی سالہا سال کی تجربہ کاری کے باوجود وہ دنگ ہو گیا۔ وہ بالکل ننگی تھی۔ بھاری بھرکم لباس کے نیچے سے ایک ایسا جسم اس کے سامنے نکل آیا تھا جو اس قدر نازک اور ناپختہ تھا کہ اس کا دل جذباتِ ترحم سے لبریز ہو گیا گویا ایک فوجی سردار کے سامنے یکایک ایک بچھڑی آکھڑی ہوئی تھی جس پر وہ اپنا بوجھ نہ ڈالنا چاہتا تھا۔

"اری تو عورت نہیں ہو!"

"کیا واقعی؟ ہر دو دیویوں کی قسم! مجھے بتلایئے میں کیا ہوں؟ نخستانِ تھریس کی عورت؟ ایک ذلیل پیشہ قلی؟ یا پھر کوئی معمر فلسفی؟"

"تمہاری عمر؟"

"ساڑھے دس گیارہ۔ ہاں میں گیارہ برس کی ہوں میں ان باغات ہی میں پیدا ہوئی

میری ماں مالینریئن ہے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں کمسن ہوں تو کیا میں اپنی ماں کو بلواؤں؟ وہ بہت حسین وجمیل ہے۔"

"کیا ویدا اشیلون سے تم نکل آئی ہو؟"

"نہیں میں ابھی چھٹی میں ہوں اگلے سال فارغ ہوں گی۔ گویا ابھی کافی مدت باقی ہے۔"

"بیزار آچکی ہوگی؟"

"بیزار؟ اف پناہ طور پر۔ کاش آپ جانتے وہ استانیاں کس قدر سخت ہیں؟ ایک ایک سبق کو بار بار پڑھاتی ہیں۔ بعض سبق تو بلبل بلبل مرتبہ یاد کرنے پڑتے ہیں ——— محض بیکار باتیں جن کی مرد کبھی آرزو نہیں کرتے۔ خواہ مخواہ خستہ خراب ہونا پڑتا ہے.... میں تو تنگ آچکی ——— بالکل تنگ، ہاں، مجھے ایک انجیر دیجیے! اوہ نہیں ——— وہ کچی ہے۔ دوسری! آج میں آپ کو انجیر کھانے کا ایک نیا ڈھنگ بتاتی ہوں۔ دیکھیے!"

"مجھے یہ ڈھنگ معلوم ہے، بیکار زحمت نہ کرا خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ بہر کیف اس میں شک نہیں کہ تم ایک ہونہار طالبہ ہو۔"

"اوہ، ذرہ نوازی کا شکریہ! معبودِ برحق کی قسم، سب کچھ خود ہی سیکھا ہے۔ رہیں وہ معلمات تو ان کی بابت کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت اپنے آپ کو حد درجہ لائق اور ماہر سمجھتی ہیں حالانکہ آج تک انھوں نے کوئی نیا اسلوبِ محبت اختراع نہیں کیا۔"

"کافی عشاق سے واسطہ پڑچکا ہوگا تمہارا؟"

"جی ہاں، کافی سے مگر سب کے سب بڈھے کھوسٹ تھے۔ کیا کروں، کم بخت نوجوان کچھ اس قدر زیادہ احمق واقع ہوئے ہیں کہ کمسن نوخیزوں کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے وہ تو تلاش کرتے ہیں چالیس سالہ عورتوں کو۔ کم بخت نازک اندام حسیناؤں کی بجائے بھینسوں پہ مرتے ہیں خدا نہ کرے میں اس عمر تک جیوں۔ اس عمر میں کم از کم میں تو کسی کے سامنے برہنہ نہ ہو سکوں گی خوش ہوں کہ میں ابھی جوان ہوں ——— ذرا میرے قریب

ہو جیسے کہ میں آپ کو چوم لوں!۔۔۔ مجھے آپ سے محبت ہے!"

اس مرحلہ پران دونوں کی گفتگو کسی قدر نرم ہونے کی بجائے یکایک ناشائستہ رُخ اختیار کر گئی اور دماطریس کو جلد ہی محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کم سن لڑکی کے متعلق خواہ مخواہ پس وپیش سے کام لے رہا ہے جب کہ لڑکی کا ہر انداز، اس کی ہر ادا بے حد ماہرانہ تھی۔

غالباً یہ سوچتے ہوئے کہ وہ اس البیلے جوان کی خواہش نفس کو خاطر خواہ آسودہ کرنے کے لیے ناکافی ہے وہ دفعتہً بھڑک اٹھی اور اس نے اپنی پھرتیلی انگلیوں کی کوروں سے ملسی حرکات کا ایک اس قدر شدید اور حیرت انگیز سلسلہ شروع کیا کہ دماطریس حیران وششدر رہ گیا۔ ایک برق تھی جو اس کے مشتعل شدہ جسم پر یہاں، وہاں — نہیں بلکہ ہر جگہ لہرا رہی تھی اور جسے وہ انتہائی کوشش کے باوجود پکڑ نہ سکتا تھا۔ وہ اب مائل کرم ہوتی تو اگلے لمحہ وہ انکار مجسم نظر آتی۔ کبھی ادھر کو پھسلتی کبھی ادھر کو پلٹتی وہ ایک مزاحمت تھی بے پایاں، ایک سپردگی تھی بیکنار لیکن آدھ گھنٹے کی طویل کشمکش کے بعد دماطریس نے اس کے شعلہ آسا جسم کو قابو میں لیا۔

کچھ دیر بعد وہ اس کی آغوش سے نکل کر بستر سے نیچے کودپڑی قریب ہی شہد کا پیالہ پڑا تھا۔ اس میں ایک انگلی ڈبو کر اس نے اپنے ہونٹوں پہ ملی اور اس کے بعد ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے دماطریس پر جھکی اور پھر اپنے عاشق کو بے تحاشہ چومنے لگی جب کہ چند آوارہ زلفیں اس کے گالوں پہ رقص کناں تھیں۔ دماطریس ہنسا اور پھر کہنیوں کے بل پر اپنا جسم اٹھا کر بولا۔

"تمہارا نام؟"

"ملیتا۔۔۔ کیا آپ نے دروازہ پر نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

آپ نے میرے حجرے کی دیواریں ہی دیکھی ہوتیں جن پہ جگہ جگہ میرا نام لکھا ہے۔ عنقریب ہی ان پہ نیا روغن کروانے والی ہوں۔"

سر اٹھا کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو واقعی دیواریں طرح طرح کی عبارتوں سے

بھرپور تھیں۔

"خاصی عجیب و غریب عبارات معلوم ہوتی ہیں۔ کیا میں انہیں پڑھ لوں؟"

"جیسی آپ کی مرضی۔ میری کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں!"

دیواروں پہ جگہ جگہ عامیانہ تصاویر کے ساتھ ساتھ ملیتا کا نام متعدد مردوں کے ناموں کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ ہر دیوار بیہودہ، فحش اور مضحکہ خیز کلمات کا اشتہا معلوم ہوتی تھی۔ کچھ عشاق نے اپنی جواں مردی کی ڈینگیں مار رکھی تھیں اور کچھ نے اس نوخیز قورطیزہ کی لطیف خصوصیات کے متعلق اپنا اپنا خیال ظاہر کیا ہوا تھا۔ دماطریس کی نظروں میں تذلیل حسن کا اس سے بدتر مظاہرہ نہ ہو سکتا تھا۔

"یہ کیا ہے؟ یہ کیا لکھا ہے ذرا بتانا!"

"کیا؟ کہاں؟ آپ کو کیا ہو گیا؟"

"یہاں ــــ یہ، یہ نام کس نے لکھا ہے؟" دماطریس نے اشارہ کرتے ہوئے عبارت پڑھی۔

"ملیتا ــــ کراتس

کراتیس ــــ ملیتا"

"اوہ! یہ نام تو میں نے لکھے ہیں۔"

"لیکن یہ کراتس کون ہے؟"

"میری ایک بہترین دوست!"

"میں کہتا ہوں، میں نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ تمہاری دوست ہے یا نہیں۔ . . میں یہ پوچھتا ہوں یہ کراتس کون ہے؟ سنا ہے یہاں بہت سی کراتسیں ہیں۔"

"مگر میری کراتس ان سب میں حسین ترین ہے۔ کراتس غلیلہ والی؟"

"کیا تو اسے جانتی ہے؟ اس کے متعلق مجھے کچھ بتلا! وہ کہاں سے آئی ہے؟ اس کا دل پسند

عاشق کون ہے؟ اس کے متعلق مجھے سب باتیں بتا!" — یہ کہہ کر وہ کوچ پر بیٹھ گیا اور ملیتا دوبارہ اس کی گود میں آ بیٹھی۔

"آپ تو اس کے عاشق زار معلوم ہوتے ہیں؟"

"میری عاشقی کا قصہ چھوڑ دو! تم اس کا ذکر کرو!"

"اس کے متعلق مجھے زیادہ علم نہیں ہے۔ وہ میرے یہاں صرف دوبارہ آئی ہے۔ مناسب نہ تھا کہ میں اس کے خاندان کے بارے میں سوالات کرتی۔ مجھے تو یہی خوشی تھی کہ وہ میرے یہاں تشریف لائی ہیں۔ بھلا بیکار باتوں میں وقت کیوں گنواتی!"

"وہ ہے کیسی؟ میرا مطلب ہے اس کا جسم؟"

"ایک کنواری کا سا۔ آخر آپ مجھ سے کیا اگلوانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کے تمام اعضائے بدنی کا ذکر کروں؟ کیا یہی کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ وہ ایک عورت ہے، وہ کرسٹس ہے یعنی ایک حقیقی عورت! مجھے جب بھی اس کا خیال آتا ہے میں کسی سے لپٹ جانا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر ملیتا نے اپنی بانہیں دماطریس کے گلے میں حمائل کر دیں۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ تو اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی — کچھ بھی تو نہیں؟" دماطریس نے بضد پوچھا۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ غلیلن ہے، اس کی عمر بیس سال ہے اور وہ باغاتِ معبد کے نواح میں شمال کی جانب محلہ نصرانیاں میں مقیم ہے اور بس . . .!"

"اس کی بود و باش کیسی ہے؟ وہ کس چیز کی شائق ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ وہ اپنی ہم جنسوں کی متوالی ہے؟ تیرے پاس تو وہ اکثر آتی ہو گی؟ کیا وہ نری عورت باز تو نہیں؟"

"اوہ، بالکل نہیں۔ جب وہ میرے یہاں پہلی مرتبہ آئی تو اس کے ساتھ ہی اس کا ایک عاشق بھی تھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ آئی تو تنہا تھی۔ جاتے وقت وہ پھر آنے کا وعدہ کر گئی۔"

"کیا باغات میں اس کی کوئی اور دوست نہیں ؟"

"ہاں ہے۔ ایک اور غلیلہ والی۔ شمارش جو بہت غریب ہے۔"

"وہ کہاں رہتی ہے ؟ میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ تقریباً ایک سال سے جنگل میں ڈیرہ لگائے ہوئے ہے۔ بیچاری کو گھر بیچ دینا پڑا مگر میں جانتی ہوں وہ کہاں ہے۔ میں آپ کو وہاں لے جاؤں گی۔ ذرا مجھے میرے موزے پکڑا دیجئے ——!"

دماطریس نے اس کے زرکار موزے اٹھائے اور ایک اطاعت منداور ممنون عاشق کی طرح ملیتا کے نازک پاؤں میں ڈال دیئے اور پھر ملیتا کو اس کا مختصر سا لباس پکڑا دیا۔ وہ لباس زیب تن کر چکی تو دونوں جلدی سے باہر نکل گئے ——

وہ کافی دیر چلتے رہے۔ نہایت وسیع مرغزار تھا۔ راستہ میں جگہ جگہ درختوں کے نیچے لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ملیتا ان میں سے چند کو جانتی تھی۔ چنانچہ اس سے مانوس قرطینر اؤں نے اسے نہایت تپاک سے سلام کیا۔ راستہ میں ایک جگہ ملیتا ایک قربان گاہ کے سامنے رک گئی قریب ہی سے اس نے تین پھول توڑے اور نہایت احتیاط ادب کے ساتھ سنگِ قربان گاہ پر رکھ دیے۔

رات ابھی پوری طرح تاریک نہیں ہوئی تھی۔ موسم گرما کی روشنی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ غروب آفتاب کے بعد بھی کافی دیر تک ارض وسما پر محیط رہتی ہے۔ چنانچہ تارے ابھی ماند ماند سے تھے اور درختوں کی ٹہنیوں کے سائے نہایت پھیکے پھیکے۔

"اوہ" ملیتا چونک کر بولی "وہ رہی میری اماں !"

باریک ململ کے دھاریدار کرتے میں ملبوس ایک عورت ٹہلتی ہوئی ان کی طرف چلی آرہی تھی۔ اپنی بچی کو دیکھتے وہ ان کی طرف بھاگی اور بالآخر اسے گود میں اٹھا کر والہانہ چومتی ہوئی کہنے لگی "میری ننھی بچی! میری پیاری بچی! تو کہاں جا رہی ہے ؟"

"اماں! میں انہیں شمارش کے پاس سے جا رہی ہوں" ملیتا نے وماطریس کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا "مگر آپ کہاں؟"

"بیٹی! قورینہ کے بچہ ہوا ہے۔ اس سے مل کر آ رہی ہوں۔ اسی کے پاس کھانا کھایا"

"کیا ہے بچہ؟"

"جڑواں بچیاں۔ جانِ من! مومی گڑیوں ایسی۔ تو بھی انہیں جلدی سے دیکھ آ۔ قورینہ تجھے دکھا دے گی"

"خوب! ہے نا؟ دو ننھی قورطینیہ ایئیں! کیا نام رکھا ہے ان کا؟"

"دونوں فستاتش کہلائیں گی۔ کیونکہ وہ ربۃ الفرودت کی شام جشن کو پیدا ہوئیں بفضلِ الفرودت دونوں بہت خوبصورت نکلیں گی"

بچی کو گود سے اتار کر وہ دماطریس سے مخاطب ہوئی "کہیے جناب کیسی ہے میری بیٹی۔ ہے نا باعثِ ناز میرے لیے؟"

"تم دونوں ایک دوسرے کے لیے قابلِ ناز ہو" وہ نہایت متانت آمیز لہجہ میں بولا۔

اس کے بعد سختہ کار قورطینیہ ان دونوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنی راہ پر ہولی اور وہ دونوں اپنی راہ پر چلتے کہ ملیتا یکایک چلائی "وہ رہی شمارش!"

شمارش دو درختوں کے درمیاں ایک جھاڑی کے پاس چوکڑی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے نیچے ایک سرخ لبادہ جو غالباً اس کا واحد دن کا لباس تھا بچھا ہوا تھا کیونکہ اس وقت جبکہ آشفتہ سر مردوں کی آمد آمد تھی وہ بالکل برہنہ بیٹھی تھی۔ دماطریس نے اسے بنظرِ غائر دیکھا ——

شمارش میں نازک اندام، سیاہ فام عورتوں کی وہ مخصوص چمپئی جھلک موجود تھی جو اس کے باطن میں ہر وقت فروزاں رہنے والے شعلہ نفس کی آئینہ دار تھی۔ اس کے مدور گوشۂ لب، بیباک آنکھیں اور نیلگوں سرمئی پپوٹے سب مل کر شمارش کے باطن

کی بے پناہ آتش نفس اور ظاہر کی خستگی کا پتہ دیتے تھے۔ وہ اپنا سب کچھ فروخت کر چکی تھی۔ اپنی کنگھیاں اور پنیں بلکہ اپنے مرچنے تک جس کی وجہ سے اس کے تمام بال بُری طرح بگڑے ہوئے تھے اور ان کی بدحالی کے سبب وہ خواہ مخواہ ایک حد درجہ بدسلیقہ اور حیا باختہ عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک بکرا طلائی زنجیر کے ذریعہ درخت سے بندھا ہُوا تھا۔ یہ زنجیر وہی تھی جو کبھی چار لڑیوں والے ہار کی شکل میں اس کے گلے اور سینے کی زینت ہوا کرتا تھا۔

"شمارس! اٹھو! یہ رہے ایک صاحب جو تم سے باتیں کرنا چاہتے ہیں" ملیتا نے کہا۔

شوخ چشم ہیودن نے نظر اٹھا کر دماطرَیس کو دیکھا تو وہ آگے کو بڑھا۔

"کیا تم کراٹسس کو جانتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کیا اس سے اکثر ملاقات ہوتی ہے؟"

"ہاں"

"کچھ اس کے متعلق بتلاؤ گی؟"

"نہیں"

"کیوں نہیں؟ آخر کیوں نہیں؟"

"نہیں!"

ملیتا حیرت زدہ ہو کر بولی "پیاری شمارس! ان سے بات کرو! گھبراؤ نہیں۔ ان پر بھروسہ کرو! وہ اسے چاہتے ہیں! وہ اس کے خیر خواہ ہیں"

"دیکھ رہی ہوں کہ وہ اس کے چاہنے والوں میں سے ہے" شمارس نے تنک مزاجی سے جواب دیا "لیکن اگر وہ واقعی اس کا شیدائی ہے یقیناً وہ اس کا بدخواہ ہے میں اس سے ہرگز کوئی بات نہ کروں گی!"

یہ معاندانہ بات سن کر دماطرَیس کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر وہ عمداً چپ رہا۔

"ذرا اپنا ہاتھ دکھلائیو!" ہیودن بولی "ذرا دیکھوں میں غلطی پر تو نہیں؟"

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ اس کی ہتھیلی کو چاندنی میں نہایت غور سے دیکھنے لگی۔ بلیتا بھی اشتیاقاً جھکی مگر ہاتھ کے پراسرار خطوط کو وہ کیا سمجھ سکتی؟ بہر کیف وہ تقدیر کی قائل تھی۔

"تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟" دماطریس نے پوچھا۔

"مجھے بہت کچھ نظر آرہا ہے مگر میں بتلاؤں میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ کیا تم میرے شکر گزار ہو گے؟ میری باتوں پر یقین کرنا! ___ سنو! اولاً مجھے تمہارے ہاتھ پر خوش بختی کے آثار نظر آتے ہیں مگر دور خوش بختی بیت گیا، گزر چکا ___ دوئم مجھے تمہارے ہاتھ پر محبت کے آثار نظر آتے ہیں مگر سب کے سب آثار خون میں ڈوبے ہوئے ہیں!"

"اپنے خون میں ___؟"

"ایک عورت کے خون میں۔ اور پھر ایک اور عورت کے خون میں ___ اور پھر تمہارے اپنے خون میں کچھ عرصہ بعد"

دماطریس نے جواب میں اپنے کاندھے سکیڑے اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو بلیتا دیوانہ وار بھاگی جا رہی تھی ___

"وہ ڈر گئی" شمارس نے کہا "حالانکہ ان باتوں کا اس کی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ خیر جو ہوتا ہے، ہونے دو، جبکہ کوئی انسان ان حالات کو روک نہیں سکتا تمہاری تقدیر تمہاری پیدائش سے قبل ہی طے ہو چکی تھی۔ اب جاؤ! میں مزید کچھ نہ کہوں گی ___"

اور اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا ___

محبت اور موت

"ایک عورت کا خون، ایک اور عورت کا خون اور پھر تمہارا اپنا خون مگر عرصہ بعد" —— یہ تھے وہ الفاظ جو اس کے ذہن میں بار بار گونج رہے تھے۔ وہ ان الفاظ کو بھول جانا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ ان کی لغویت کا قائل نہ تھا۔ وہ حیران تھا کہ باشعور لوگ دوسروں کی غیب دانیوں پر کیونکر ایمان لے آتے ہیں؟ ہاتھ کی لکیروں اور حرکات نجوم کو انسان کی زندگی کے نشیب و فراز سے بھلا کیا واسطہ؟ عجیب بات تھی کہ تقدیر پرستی سے اس قدر نفرت اور گریز کے باوجود وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ دراصل وہ خطوط اسے بے حد منفرد معلوم ہوتے تھے مگر اس انفرادیت کی غرض و غایت؟ شمارس کی پیشینگوئیاں رہ رہ کر اس کے دماغ میں چبھ رہی تھیں ——

ہو نہ ہو —— آخر کار اس نے سوچنا شروع کیا —— اس کی تمام زندگی واقعی اس کے ہاتھ پر اَمٹ اور پراسرار خطوط کی شکل میں نوشتہ تھی اس کی ہتھیلی کے اوپر کی طرف ایک ہلال بنا ہوا تھا۔ اس ہلال کے سرے انگلیوں کی طرف ختم ہوتے تھے۔ ہلال کے نیچے ایک چکور سی بنی ہوئی تھی۔ اس چکور کے اندر دو سرخ دھبے تھے۔ ایک دوسری لکیر کلائی کی طرف آ رہی تھی۔ ایک اور لکیر اس کے انگوٹھے کی بنیاد کا احاطہ کیے ہوئے تھی —— اس نے ان تمام لکیروں کو غور سے دیکھا مگر انہیں اپنے لیے حد درجہ ناقابل فہم پا کر بہت ملول ہو گیا اور بالآخر اس نے اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے اور چاہا کہ کسی طرح وہ اپنے تیز اور تند خیالات کی دلخراش رو کو بدل دے ——

کرائسس، کرائسس، کرائسس! یہ نام اس کے اندر ایک بخار کی طرح سوزاں تھا۔

ہاں، وہ وقت دور نہیں تھا جب وہ کرائسس کو شلم، یونان اور روم کی کسی ایسی خلوت ناک جگہ پر اڑا لے جائے گا جہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہ ہوگا —— وہاں، وہ کرائسس کے

طوفاں آسا التہاب نفس کو بجھا کر رکھ دے گا — اسے پوری طرح رام کرے گا — اسے اپنے بازوؤں میں خوب خوب بھینچے گا۔ یہی تھی اس کی طلب عشق کی منزلِ مقصود جہاں پہونچنے کے لئے اسے فوراً، گامزن ہونا تھا۔ فوراً ایک دم ———

وہ تین تحائف میں سے ایک حاصل کر چکا تھا۔ ہے باقی دو — شانہ اور ہار —— وہ انہیں عنقریب حاصل کرنے والا تھا — پہلے شانہ!! اس نے سوچا اور اپنے قدم تیز کر دے۔ ہر شام غروبِ آفتاب کے بعد پیشوائے اعظم کی بیوی بیابانِ الفرودت کے پار ایک مرمریں چوکی پر سے روزانہ سمندر کی وسعتوں کا نظارہ کرتی تھی۔ دماطرؔیس کو معلوم تھا وہ عورت بھی اس کی فدائی تھی اور ایک دفعہ اسے بتا چکی تھی کہ اسے جب کبھی اس کی ضرورت محسوس ہو تو وہ اسے اس مخصوص مرمریں نشست پر اپنی منتظر پائے گا۔ چنانچہ اس دعوت آمیز یقین دہانی کے پیشِ نظر وہ سمندر کی طرف چلدیا۔

طاؔوتی مصری النسل تھی۔ آج وہ ایک سبز رنگ ارغوانی لبادہ بغیر کمر بند کے پہنے ہوئے تھی سوائے ان دو ستارہ نما پھولوں کے جن کا مقصد اثمارِ شباب کی کافرانہ اٹھان کو نمایاں کرنا تھا لبادہ پر کسی قسم کی زرکاری نہیں کی ہوئی تھی۔ ہلکی پھلکی عبائے ململ گھٹنوں تک پھیلی ہوئی تھی اس کے مختصر مگر مدور پیروں میں نیلے چمڑے کے تسمہ دار سلیپر تھے اس کی جلد سیاہی مائل، ہونٹ بھرے بھرے، کاندھے نازک، بدن چھریرا اور لچک دار اور بار سینہ سے تھکا تھکا معلوم ہوتا منہ کھولے وہ اس وقت خوابوں کی دنیا میں گم سم تھی —

دماطرؔیس چپکے سے اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر اس پر جھکا — طاؔوتی کا انگ انگ اسے دعوت تلطف دے رہا تھا۔ اس لیے کہ ——— اس کی عبائے ململ کا دامن کھوں تک وا تھا۔

باوجودیکہ دماطرؔیس کا ہاتھ عبا میں داخل ہو کر اس کے سینے کی مدور اٹھانوں سے کھیلنے لگ گیا مگر طاؔوتی تھی کہ بدستور سو رہی تھی۔ اس میں کلام نہیں کہ طاؔوتی کے خواب کی نوعیت

آہستہ آہستہ بدل رہی تھی لیکن اس لطف آگیں خواب کی حد اختتام ابھی دور تھی۔

دفعتہً اس کے نیم وا ہونٹوں کے درمیان سلسلۂ تنفس تیز ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی منہ سے چند طویل مگر ناقابل فہم کلمات نکلنے لگے اس کے بعد اس کا نتیاں سر پیچھے کو ڈھلک گیا۔ اس ادائے لطف کش پر دماطرِیس نے اپنا گرم شدہ ہاتھ عبا میں سے باہر کھینچ لیا اور اسے سمندر کی جانب سے آنے والی خنک ہوائیں لہرانے لگا۔

کہر آلود بنفشئی ڈھلوانوں کے خاتمہ پر رات کے بیکراں دھندلکے میں دائم سائم سمندر موجزن تھا۔ تاروں کی چھاؤں میں سینۂ محبوب کی طرح افتاں وخیزاں سمندر ایک ایسی لطیف یاد سے مشابہہ تھا۔ جو صدیوں پہلے کے عہدِ زریں کی طرح قدیم ہونے کے باوجود دل و دماغ کو آج بھی لبھاتی ہے۔ ہاں آج سے صدیوں بعد بھی جب دنیائے قریب الاختتام ہوگی تو چند بچی کھچی ہستیاں اپنی موت سے قبل چلائیں گی ”اے سینۂ محبوب! اے بحر ناپیدا کنار! کاش تمہارے اسرار باطن کو ہم پاکر رخصت ہوتیں!“

رات بڑھی چاند نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنا جام خونرنگ سطح بحر پر انڈیلنا شروع کردیا۔ دور ارض و سما کے درمیان معلق نظر آنے والی شفاف فضا ایک سرخ موج نور کی شکل میں زرفشاں سطح بحر پر اس طرح ناچنے لگی تھی جس طرح دوران شب مدور پستانوں پر ہیجانِ لمس جو اپنے دست خالق کی پسپائی کے بعد بھی جاری وساری رہتا ہے۔

طاؤتی بدستور سوئی رہی ـــــ سر کو ڈھلکائے ہوئے، عبائے ململ میں اپنے نیم عریاں بدن کو چراتے ہوئے۔

افق پر نمودار مہتاب کی زرفشانیاں سطح سمندر سے پھسل پھسل کر اب اس محوخواب حسینہ کی طرف آرہی تھیں۔ گویا اس کی قاتل تابانیاں اب کسی کے بے حرکت شعلۂ بدن سے کھیل رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ چاندنی تیز ہونے لگی اور اس نوخیز مصری کے جسم کو منور کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ طاؤتی کی زلفیں بھی ایک ایک کرکے نمایاں ہونا شروع ہوئیں اور ان

کے ساتھ ہی زلفوں میں الجھا ہوا شانہ ـــ شاہی شانہ ـــ جو کراٹسس نے مانگا تھا اندھیرے میں سے ابھرا اور چشم زدن میں وہ ہاتھی دانت کا شانہ ماہتاب کی لرزاں شعاعوں میں نہا رہا تھا۔

اس نازک مرحلے پر دماطریس نے طاؤنی کا سنح روشن اپنے مرتعش ہاتھوں میں لے لیا۔ اس پر طاؤنی کی آنکھیں فوراً کھل گئیں اور پھر عالم حیرت میں کھل کھل کر بند ہونے لگیں۔

"دماطریس! دماطریس!" وہ چلائی "یہ تم ہو؟ تم؟ آہ تم میرے پاس؟" ـــ یہ کہہ کر وہ اس سے لپٹ گئی، اور اس کی آواز میں خوشی کی گھنٹیاں بجنے لگیں "کیا واقعی یہ تم ہو؟ یہ چاند آج کیسے نکل آیا؟ دماطریس کیا وہ ہاتھ تمہارے تھے جو مجھے خوابِ مدہوش سے جگا رہے تھے؟ تم، تم، میرے پاس؟ اے ابن معبودہ من! میری تاریک راتوں کے منور چاند، میرے سرتاج، میرے مالک!"

دماطریس نے جواب میں قدرے پیچھے ہٹنا چاہا مگر وہ جلد ہی پھر اس سے جا لپٹی۔

"ڈر رہے ہو؟ اس ساعت دزدیدہ و نایاب میں گھبرا رہے ہو؟ آخر کیوں؟ تمہارے لیے تو میں وہ نہیں ہوں جس کے قریب آنے سے سب ڈرتے ہیں۔ معبد الفرودت کے پیشوا اعظم کی باجبروت اور با اختیار بیگم تمہارے سامنے کمزور اور بے اختیار ہے۔ اے دماطریس! میرے رتبہ و مقام کو بھول جا۔ عاشق و محبوب کی آغوش میں عورت کے رتبہ و مقام کے کیا معنی؟ تیرے لیے تو میں پیشوائے اعظم کی بیوی نہیں ہوں۔ میں تو ایک عورت ہوں تمہاری عاشق و شیدائی ـــ جس کی آرزوئے وصال اس کے معمور جذبات سینہ سے چھلکی پڑتی ہے۔"

دماطریس خاموش رہا ـــ

"سن!" وہ کہتی رہی "مجھے معلوم ہے تجھے کون مرغوب ہے۔ مگر میں تو نہ تیری

داشتہ بننا چاہتی ہوں اور نہ تیری ملکہ کی رقیب۔ دماطرلیس! تو مجھے جو چاہے سمجھ مگر خدارا مجھ سے دور نہ ہو! سمجھ لے کہ میں تیرے لیے ایک غلام بیدام ہوں جسے مرد ایک لمحے کے لیے حاصل کرتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے بھول جاتا ہے۔ سمجھ لے کہ میں ایک ذلیل و بدبخت کسبی ہوں جو سراپا ہے ایک شرمناک ہنگامہ خرمستی کی لذت کی متلاشی ہے۔ آخر میں کون جو اپنے آپ کو ان بدکار عورتوں سے بلند و بالا سمجھوں؟ مقدس دیوتاؤں کی قسم! میں ہرگز ان رذیل فاحشاؤں سے مختلف نہیں، مجھ میں ان سے بہتر کوئی جنسی کشش نہیں! مگر ہاں، ایک تو ہے حسن مجسم، ایک تو ہے دیوتاؤں کے خصائل نائفہ کا حامل ــــ!"

پہلے کس طرح خاموش اور سنجیدہ رہ دماطرلیس نے ایک تیز نظر طائفی پر ڈالی اور بالآخر بولا۔ اے بدبخت اور ذلیل عورت! بتا، وہ کون سی قوت ہے جو دیوتاؤں سے مجھے حاصل ہے؟"

"عشق!"

"یا موت؟"

"کیا مطلب؟ وہ چونک کر چلائی "موت؟ کیا مطلب؟ کیا تم مجھے موت بخشنے آئے ہو؟ اتنی جلدی کیوں؟ زندگی کے ساٹھ سال گزر جائیں تو میں موت کے متعلق سوچوں گی۔ لیکن آج کی رات موت کے ذکر پر دردسے تمہارا کیا مطلب؟"

"موت مگر آج ہی رات!"

"آج ہی رات؟ آہ نہیں۔ کون کہتا ہے؟ میں کیوں مروں؟ جواب دو! اے بے درد دماطرلیس، بول! اے ستم گر، میری خطا؟ کچھ تو بتا!"

"تمہیں سزائے موت ہو چکی۔"

"کس نے دی؟"

"تمہاری تقدیر نے!"

"تجھے کیسے علم ہوا؟"

"اس لیے کہ میری تقدیر تمہاری تقدیر سے وابستہ ہے۔"

"کیا ابھی مر جانا ہی میری تقدیر میں لکھا ہے؟"

"ہاں، تمہاری قسمت میں اسی جگہ میرے ہاتھ سے مر جانا لکھا ہے۔ اسی جگہ، آج ہی رات!" اس نے طاؤنی کی کلائی پکڑ کر کہا۔

"دماطریس!" ـــ وہ فرطِ وحشت میں جھلا کر بولی: "اگر میری قسمت میں یہی رکھا ہے تو لبیک! میں نہیں روؤں گی، میں نہیں چلاؤں گی، میں کسی کو مدد کے لیے نہیں پکاروں گی، البتہ مجھے کچھ کہنے دو!" ـــ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی، پھر اپنی عرق آلود جبیں سے پسینہ پونچھ کر بولی: "اگر موت کو آنا ہی ہے اور آنا بھی تمہاری وجہ سے اور تمہارے ہاتھوں سے ہے تو لبیک! میں اس موت کو خوش آمدید کہتی ہوں ـــ مجھے تمہارے ہاتھوں سے آئی ہوئی موت منظور ہے مجھے وہ موت دل سے قبول ہے مگر ہاں ذرا ٹھہرو، رک جاؤ میری بات سنو!"

"سناؤ!"

طاؤنی نے دماطریس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گلوگیر آواز میں کہا۔ اے کہ تو جو میرا مالک و سرتاج ہے۔ اے کہ تو جو اپنے اندر تمام خدایانِ ارض کے خصائل رکھتا ہے۔ اے کہ تو قلبِ معشوق میں زندگی کی اوّلیں موجِ بیداری پیدا کرتا ہے۔ اے کہ تو جو ایک سرچشمۂ کیف و نشاط ہے، اپنا دستِ لطف و کرم بڑھا اور مجھے وہ سب کچھ بخش دے جس کا میں آج تک خواب دیکھا کی۔ پہلے مجھے محبت کا نشاطِ بے پایاں بخش اور پھر موت کی شیریں نیند مجھ پہ طاری کر!"

باوجود اس کے کہ دماطریس کی آنکھوں میں اب بھی کوئی خاص کیفیت اس کے مائل بہ کرم ہونے کا پتہ نہ دیتی تھی مگر اس کا بدستور خاموش رہنا خود اس کو کسی ہنگامہ خیز عمل کی تمہید نظر آتا تھا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے مردانہ جاذبتوں سے بھرپور چہرے کی ہیبت بدلنا شروع ہو گئی اور تھوڑی سی دیر میں وہ حسن کا حسین متوالا نظر آنے لگا ـــ سراپا التہابِ عشق بن کر

اس نے سراپا التجا طاؤنی کی طرف دیکھا جو بالکل خاموش کھڑی تھی۔ اس خامشی کے باوجود طاؤنی کے ہونٹ اس طرح کھلے تھے گویا وہ کبھی پھر باہم نہ ملیں گے۔ اس کی ہر سانس ایک سرمدی گیت معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ اس کی آغوش محبت میں آئے بغیر ہی عشق کی کیف انگیز لذتوں سے بہرہ ور ہو رہی تھی۔

لمحاتِ موت کی آغوش میں طاؤنی اپنی زندگی کی عظیم ترین فتح حاصل کر رہی تھی —
ایک ہی جھٹکے میں اس نے اپنا لبادہ چاک کر ڈالا اور اس کا ایک گیند بنا کر پرے پھینک دیا اس کے بعد وہ ایک سوگ وار ہنسی ہنسی۔ اس کے لچکیلے جسم میں ایک ایسا کھچاؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا جو ایک بے پناہ احساس نشاط سے ماخوذ تھا اور بے شک کہ وہ احساس نشاط حد درجہ والم دسائم معلوم ہوتا تھا۔

متالم و فکر مند عاشق کو عمل محبت کی نسبت عمل موت کی طرف زیادہ مائل دیکھ کر طاؤنی تڑپ کر بولی "آہ! مجھے مار ڈال، مجھے مار ڈال، اے دماطریس! مجھے مار ڈال۔ ہچکچاتے کیوں ہو؟"
یہ سن کر دماطریس طاؤنی سے فوراً الگ ہو گیا اور اسے آخری بار نہایت محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

طاؤنی کی آنکھوں میں یک گونہ روشنی تھی اطمینان اور تسکین کے نشے میں ڈوبی ہوئی، وہ بے حد مسرور نظر آ رہی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ اس کے نفس کی بے عیب کیفیت آسودگیٔ نفس میں ڈوبنے لگتا دماطریس نے اس کے سرشتہ بالوں میں سے ایک لمبی چمکدار طلائی پن نکالی اور پھر اس پتلی سلاخ کو پوری قوت کے ساتھ اس کے بائیں پستان کے نیچے گھونپ دیا —

چاندنی

محبت کی خاطر طاؤنی اسے شانہ تو کیا اپنے تمام بال تک برضا و رغبت پیش کر دیتی لیکن جانے کیوں دماطریس نے شانہ مانگنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ دراصل کرتیسس نے طاؤنی کے بالوں میں ہیرے کی طرح چمکنے والے قدیم شانے کا مطالبہ کر کے ایک عہد سنگین جرم کے ارتکاب کی فرمائش کی تھی۔ اس لیے اس نے بھی خون ریزی مناسب سمجھی۔ یہ درست ہے کہ اگر وہ چاہتا تو اپنے دل کو یوں سمجھا سکتا تھا کہ حالتِ جنوں میں کھائی ہوئی قسموں کو کسی اخلاقی تامل کے بغیر نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور پھر قسم بھی وہ جس کا تعلق ایک بے خطا عورت کی زندگی کو ختم کرنے سے تھا۔ لیکن دماطریس کے نزدیک ایسا استدلال اب قابلِ اعتنا نہ تھا۔ اور وہ کسی قیمت پر ارتکابِ جرم کے ارادہ سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جس مہم سے نبرد آزما تھا وہ بے حد اچھوتی اور ولولہ انگیز تھی اور اس مرحلہ پر مہم کے تشدد آمیز پہلوؤں سے فرار اور اجتناب اس کے لیے محال تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی خفیف سی لغزشِ پا سے اور اس کے تذبذب و تامل کے سبب اس عجیب و غریب سازش کی کوئی اہم کڑی نظر انداز ہو جانے سے مہم کی کامیابی کا تمام حسن غارت نہ ہو جائے۔ گناہ و ثواب کا تصور اب اس کے نزدیک اس سانحہ کو پوری زندگی کے لیے ایک مہیب اور مسلسل عذاب بنا دینے کے مترادف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ستدرہ ناحق اس کے ہاتھوں قتل ہوئی لیکن وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس قتل کے بغیر شاید اس کی کامیابی بے مزہ معلوم ہوتی۔ غرضیکہ غم و مسرت کے ملے جلے جذبات میں غلطاں و پیچاں دماطریس نے آخر کار مردہ کسندرہ طاؤنی کے سرشتہ بالوں سے شانہ نکالا اور اسے اپنے شلوکہ کی اندرونی جیب میں رکھ کر وہاں سے چل دیا تاکہ کرتیسس کے فرمان کے بقیہ حصے کی تکمیل کرے۔ ابھی اس الفردوست کا ہار چرانا تھا۔

معبد میں بڑے دروازے کے راستہ داخل ہونا قرین مصلحت نہ تھا باوجودیکہ معبد کی بارہ عدد دوزوجیا پہرہ دارنیاں بغیر کسی تامّل کے اسے اندر جانے کی اجازت دے دیتیں۔ قاعدہ تھا کہ راہبان معبد کی عدم موجودگی میں کسی اجنبی کو معبد میں نہ جانے دیا جاتا تھا۔ اس نے سوچا کہ جب وہ حرمِ خاص میں داخل ہونے کے لیے ایک مخصوص مخفی دروازہ سے واقف ہے تمام دروازوں کا رُخ کرنے کی حماقت کیوں کی جائے۔ چنانچہ وہ بیابان کے اس ویران حصے میں داخل ہوا جہاں معبد کے راہبان اعلیٰ کو دفن کیا جاتا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر مقبرے گننا شروع کیے اور اس طرح جب ساتویں مقبرے کے پاس پہنچا تو اس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ احتیاطاً اس نے دروازہ اندر سے مقفّل کر دیا۔

بڑی مشکل کے بعد اس نے قبر کی بالائی سِل اٹھائی۔ سِل اٹھ گئی تو اسے نیچے کو جانے والی چند مرمریں سیڑھیاں نظر آئیں۔ چنانچہ وہ ان کے ذریعہ نیچے اتر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سیڑھیوں کے خاتمہ پر آدمی ایک سرنگ نما راستہ پر پہنچ جاتا تھا اور اس ساٹھ قدم لمبی سرنگ کو عبور کرنے کے بعد وہ سیڑھیاں آتی تھیں جن کے ذریعہ آدمی معبد میں داخل ہوتا تھا۔

اب وہ دبے دبے قدموں سے سرنگ جس کی خنک فضا اس کے بدن میں کپکپی پیدا کر رہی تھی، چند ہی منٹوں میں یہ راستہ طے ہو گیا اور بالآخر وہ سیڑھیاں چڑھ کر معبد کے چور دروازہ میں سے دیوی کے حرم خاص میں داخل ہو گیا۔

حرم کے اندر مکمل خاموشی اور تاریکی تھی مگر باہر رات درخشندہ و تابندہ تھی۔ حرم کی سنگین خنکی اس کے تن بدن میں سرایت کر رہی تھی اور اسے آنکھیں تک جھپکنا مشکل ہو رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی تاریکی الگ اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔ اس بے پناہ حالتِ اضطرار میں اس نے خواہ مخواہ اپنی پیشانی پونچھنا شروع کر دی گویا وہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ وہ حالتِ خواب میں نہیں تھا بلکہ جاگ رہا تھا آخرکار بہت کوشش کے بعد اس نے اپنی نظریں اوپر کو اٹھائیں۔

ماہتاب کی روز فشاں چاندنی میں دیوی گلابی پتھر کے چبوترے پہ ایستادہ تھی۔ وہ برہنہ اندام مورتی ایک لطیف ہیجان جنسی میں مدہوش نظر آتی تھی۔ اس کا رنگ روپ ایک زندہ عورت سے مشابہہ تھا۔ ایک ہاتھ میں شونگی دستہ والا آئینہ لیے دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا ہفت تار ہار سنوار رہی تھی۔ جواہر کا ہار کا بڑا گوہر جو بیضوی اور سپید تھا اس کے پستانوں کے درمیان اس طرح آویزاں تھا جس طرح دُو گرل بادلوں میں ہلال۔ وہ موتی صحیح معنوں میں مقدس تھا کیوں کہ وہ صدفِ اندو بیَن میں مقیم قطرات آب سے پیدا ہوا تھا۔

دماطریس پر جلد ہی ایک ناقابل بیاں عالم عبودیت طاری ہوگیا۔ اسے اس طرح محسوس ہونے لگا گویا الیفرودِت فی الحقیقت اس کے سامنے زندہ موجود ہے۔ اسے احساس ہی نہیں رہا کہ وہ مورتی تو اس کی اپنی تخلیق تھی۔ یہ عالم خود فراموشی دراصل نتیجہ تھا اس خلیج کا جو اس کے ماضی اور حال کے درمیان پیدا ہو چکی تھی۔

دماطریس نے بالآخر اپنے بازو پھیلائے اور انداز سرگوشی میں کچھ اس طرح گنگنانا شروع کیا جس طرح فراعینی رسومات معبد میں دیوی سے مخاطب ہوا جاتا تھا۔

ایک تابناک، مافوق الفطرت غیر محسوس، پاک اور شفاف عالم رو رہا تھا جو دیوی کے سنگین مجسمہ پر پھیل رہا تھا۔ ڈرتے ہوئے کہ کہیں اس کی نظریں پگھل جائیں اس نے نہایت عاجزانہ طور پر اپنی بیتاب نگاہیں مورتی پر مرکوز کر دیں۔ اس کے بعد وہ آہستہ سے مورتی کے قریب ہوا اور اس کے پاؤں کی انگلیوں کو چھوا تاکہ مورتی کی موجودگی کا اسے پوری طرح اطمینان ہو جائے۔

مورتی کو چھونا تھا کہ ایک ناقابل ضبط مقناطیسی قوت کے زیر اثر وہ پایۂ مجسمہ پر چڑھ گیا۔ اور اس کے بعد اس نے مورتی کے کاندھوں کو سہلانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی مورتی کی آنکھوں کو تکنے لگا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ کانپا، پھر بے ہوش سا ہونے لگا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ بلکہ خوشی سے مسکرانے لگا۔ اس کے ہاتھ خود بخود مورتی کی عریاں بانہوں پہ پھرنے لگے۔ بعد ازاں کمر

میں حائل ہو گئے، مورتی کے ایک ایک عضو کا طول ماپنے لگے۔ بالآخر جب اس کے مرتعش ہاتھ دیوی کے شکم کے مدور ابھار سے محظوظ ہو چکے تو دماطریس نے دیوی کے آئینے میں جھانکا اس کے جواہر کار ہار کو چھوا، پھر اسے اتارا، چاندنی میں لہرایا مگر فوراً ہی گھبرا کر اسے واپس رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے دیوی کے ہاتھوں، اس کی گول گردن اس کے سینہ اور اس کے نیم وا مرمریں دہن کو فرطِ عقیدت میں چوما۔ اس طویل اظہار بندگی اور عجز و نیاز کے بعد وہ مورتی کی پوتر باہوں کا سہارا لے کر چبوترے کے کنارے سے دیوی کے قابلِ پرستش سر کو دیکھنے لگا —

مخصوص مشرقی انداز میں سرشتہ بال دیوی کی جبیں پر جھکے جھکے جاتے تھے، نیم وا لامبی لامبی آنکھوں میں ایک دلگداز تبسم کھیل رہا تھا۔ اور نیم وا ہونٹوں پر انتظار بوسہ کی کیفیت نمودار تھی۔

مورتی کے تابناک سینہ پر ہار کی لڑیوں کو آہستہ سے درست کرنے کے بعد دماطریس کچھ پیچھے ہٹا۔ اور ایک بار پھر اظہار عجز و نیاز میں محو ہو گیا۔

اس عالمِ بے خودی میں اچانک اسے اپنا وہ مقصد یاد آیا جس کی خاطر وہ معبد میں آیا تھا ہاں اسے تو ایک بہت بڑا کام کرنا تھا اور وہ الٹا انہماک عبودیت میں کھویا جا رہا تھا۔

اس لمحہ اسے کرائسس یاد آئی مگر یہ یاد اس کے ذہن میں ایک کثیف واہمہ کی طرح وارد ہوئی۔

آن کی آن میں دماطریس نے فوطنیرہ کرائسس کے حسن کے تمام مبہم پہلوؤں کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ ہاں وہاں اس کے ہونٹ گداز اور پتلے، بال گھنے سنہری اور چال مستانہ تھی۔ مگر اس کے ہاتھ؛ وہ غالباً لمبے لمبے اور غیر دلکش تھے بالکل غیر دلکش۔ دماطریس محسوس کرنے لگا کہ اس کی حالت اس مرد سے ہو بہو ملتی جلتی تھی جو صبح کے وقت اپنی آغوش میں اپنی محبوب ترین معشوقہ کی بجائے کسی رذیل کسبی کو پاکر سر پیٹ لیتا ہے

اور نہیں سمجھ پاتا کہ گذشتہ شام وہ کیسے دھوکا کھا گیا ظاہر تھا کہ وہ بھی ایک ہنگامی جنون کے باعث ایک وقتی خلفشار بدنی کے سبب ایک مرض کا شکار ہو گیا تھا اور اب وہ اپنے آپ کو اس مرض سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اگرچہ دماغ میں کسی قدر اثرِ جنوں اب بھی باقی تھا۔

وہ کافی دیر دیوار سے ٹیک لگائے دیوی کے مجسمہ کے سامنے کھڑا رہا۔ بام معبد کے چوکور سوراخ سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی معبودہ الفرودت کو مرکزِ تجلیات بنائے ہوئے تھی۔ دماطریس چاہتا تھا کہ وہ اس عالم پر انوار میں دیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے اور کھو جائے اسی نفسیاتی تگ و دو میں ساری رات بیت گئی جوں ہی پو پھٹی سحر کی روح آویز رنگینیاں مجسمہ پر منعکس ہونا شروع ہو گئیں اور اس کے بعد روپہلی دھوپ۔

دماطریس سرتاپا جذبات عبوریت میں ڈوبا ہوا مورتی کے سامنے کھڑا رہا۔ اُسے متعلق خبر نہ تھی کہ وہ اپنے شلوکہ میں نقرئی آئینہ اور ہاتھی دانت کا شانہ چھپائے ہوئے ہے۔

دفعتہً معبد کے پائیں باغ میں پرندوں نے اپنی نغمہ سنجیاں شروع کیں۔ معبد کی بیرونی دیواروں کے آس پاس ہم کلام عورتوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں طلوع صبح کے اثر سے خوابیدہ ارض و سما جاگنے لگے اور شب بیدار دماطریس کا دل خود بخود خوشی سے جھومنے لگا۔

جب معبد کی بیرونی سیڑھیوں پر چند قدموں کی آہٹ دماطریس کے کانوں تک پہنچی تو سورج کافی بلند ہو چکا کیونکہ بام معبد کا سایہ اپنی جگہ سے مفقود ہو چکا تھا۔ عنقریب ہی دیوی الفرودت کے حضور میں قربانیاں پیش ہونے والی تھیں اور جلوس کی شکل میں بہت سی عورتوں کو رسم حلف ادا کرنی تھی۔ آج عظیم معبودہ الفرودت کے جشنِ نشاط کا پہلا دن تھا۔

دماطریس نے وہاں سے فوراً بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔

مجسمہ سے ملحقہ چبوترے کے عقب میں ایک ایسا کنج تھا جس کا علم یا تو بُت تراش کو تھا یا راہب اعلیٰ کو جو وہاں چھپ کر بولتا تھا تو حلف اٹھانے والی دوشیزہ کو اس

طرح معلوم ہوتا تھا گویا خود دیوی اس سے مخاطب ہے اور تلقینِ نشاط کر رہی ہے۔ دماطر بس اسی مخفی گوشہ میں چھپ گیا۔

اسی اثنا میں باب معبد کے دو بڑے کواڑ کھلے اور عازمِ حلف عورتوں کا جلوس اندر داخل ہوا۔

دعوت

آدھی رات کے قریب دروازہ پر تین دستکیں ہوئیں اور کرائسس کی آنکھ کھل گئی۔ دو عدد عفیفہ دوشیزاؤں کو اپنے پہلو میں ڈالے وہ دن بھر سوتی رہی تھی۔ رعودت تیس پر وہ تمام وقت اپنی گوہر تاب ران رکھے رہی، اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ مرطو صیلہ آنکھیں باہوں میں چھپائے پہلو کے بل اس کی چھاتی پر دراز تھی۔

نہایت آہستگی اور صفائی کے ساتھ کرائسس نے خود کو ان سے الگ کیا۔ اٹھی اور بستر پر تین قدم چل کر نیچے اتر آئی۔ خواب گاہ سے ملحقہ دالان میں کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے، جالا؟ کون آیا ہے؟"

"نقراط آپ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے آپ فارغ نہیں۔"

"بکواس کی تم نے ابجنت میں تو بالکل فارغ ہوں۔ آجاؤ نقراط! میں اپنی خواب گاہ میں ہوں —" یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر واپس چلی گئی۔

ایک لمحہ کے لیے نقراط دہلیز پر رکا مبادا اس کا فوراً کمرے میں گھس آنا نازیبا حرکت سمجھی جائے۔ دونوں لڑکیوں نے اپنی خواب آلود آنکھیں کھولنا شروع کیں گویا انہیں غفلتِ خواب سے فوراً باہر آنا ناگوار محسوس ہو رہا تھا

"بیٹھ جاؤ" کرائسس نے کہا۔ "تمہارے ساتھ ناز و نخرہ کیسا؟ معلوم ہے تم میری خاطر نہیں آئے۔ کیسے آنا ہوا آخر؟"

اپنے وقت کا نامور فلسفی نقراط بیس سال سے بخیت کے عشق میں مبتلا چلا آ رہا تھا۔ اس کے عشق میں پاسِ وفا کی بجائے آرام طلبی کا عنصر زیادہ غالب تھا۔ اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے اور سپید تھے۔ داڑھی دمِ سنجنیر کی طرز پر نوک دار تھی۔ مونچھیں بالائی ہونٹ پہ ختم ہو

جاتی تھیں۔ آج وہ ایک دھاریدار اُونی لباس پہنے ہوئے تھا۔

"میں جناب کو بخیتؔ کے ہاں کل ہونے والی ضیافت میں شمولیت کی دعوت دینے حاضر ہوا ہوں۔ اس کے بعد محفل تفریح ہو گی۔ ہم کل سات ہوں گے۔ ضرور آنا!"

"محفل تفریح؟ یہ جشن کس کے اعزاز میں؟"

بخیتؔ اپنی حسین ترین کنیز الفردوسہ کو آزاد کر رہی ہے۔ رقاصائیں اور نے نواز لڑکیاں آئیں گی۔ میرا خیال ہے جناب کی دونوں سہیلیاں بھی جشن میں حصہ لیں گی۔ اب جبکہ جشنِ رقص و سرود کی پیش مشق جاری ہے ان دونوں کو یہاں نہ ہونا چاہیئے۔"

"اوہ! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" رعودتؔ چلائی۔ "ہم تو بھول ہی چکی تھیں۔ مرٹو! اٹھو! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

لیکن کرنسس احتجاجاً بولی۔ "ابھی نہیں، نقراط! تم بہت مکار ہو۔ بہانے سے میری دونوں معشوقاؤں کو لے جا رہے ہو۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں تمہیں اندر آنے کی اجازت نہ دیتی — لو دیکھنا! کم بخت تیار بھی ہو گئیں!"

"ہماری پوشاک بہت سیدھی سادی ہے۔ پھر ہم خوبصورت بھی نہیں جو بناؤ سنگار میں وقت لگائیں۔" رعودتؔ بولی۔

"معبد میں تم لوگ ملو گی؟"

"جی ہاں، ضرور! ہم کل صبح اپنے ساتھ فاختائیں بھی لائیں گی۔ آج تو آپ ہمیں اپنی جیب خاص سے ایک عدد درخمہ مرحمت فرما دیں ورنہ ہم فاختائیں نہ خرید سکیں گی۔ بہر کیف کل آپ سے ملاقات ضرور ہو گی۔" — یہ کہہ کر وہ دونوں وہاں سے بھاگ گئیں۔

فلسفی نقراط بہت دیر تک اس دروازہ کو تکتا رہا جس کے عقب میں وہ دونوں رُو پوش ہو گئی تھیں۔

"بھئی، تمہاری زندگی کے طور طریق بھی نرالے ہیں!"

"کیا فرمایا؟"

ایک نہیں، دَو دَو! پھر لطف کی بات یہ ہے کہ جانے کس گندھے نالے سے تم انہیں اٹھا لائی ہو۔ کتنی عجیب مثال قائم کی ہے! ہمارے لیے اب اس دنیا میں باقی ہی کیا رکھا ہے۔ تم سب نے معشوق بازی شروع کر دی ہے۔ گویا ہمارے پاس آتی ہو تو بالکل سرد ہو کر آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ میرا خیال ہے اگر یہ سلسلہ کچھ عرصہ جاری رہا تو ہم مردوں کو بھانڈوں کے یہاں لازماً جانا پڑے گا۔"

"ایسا نہیں ہے۔" کرائسس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ "نقراط کم از کم تمہیں ایسی بے ہودہ اور لغو باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔ لوگ نری بکواس پر اتر آئے ہیں۔ حیران ہوں نقراط ایسا مفکر اور مدبر بھی معاملہ کی اصل اہمیت کو نہیں سمجھ رہا خواہ مخواہ تقابل جاہلانہ شروع کر دیا ہے۔"

"میں کہتا ہوں تم میں اور ایک حسن پرست میں فرق ہی کیا رہ گیا ہے؟"

"یہ فرق کا سوال نہیں۔ دونوں معاملات میں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کچھ آیا خیال شریف میں؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم غلط ہو لیکن تمہارے دلائل سنے بغیر میں تمہارا قائل نہیں ہو سکتا۔"

"اوہ! نہایت زود فہم بات ہے۔ سنو، غور سے سنو!... تسکین نفس کے لیے عورت سے بہتر کوئی ذریعہ اس دنیا میں نہیں۔ عورت کا بے مثال اور حیرت انگیز سراپا قدرت نے بنایا ہی محبت کے لیے ہے۔ یہ صرف عورت ہی جانتی ہے کہ محبت کس طرح کی جاتی ہے اور محبت کروانا بھی عورت پر ختم ہے ثابت ہوا کہ بہترین جوڑا عورتوں کا ہی ہو سکتا ہے۔ اگر دو میں سے ایک عورت ہے تو گویا لطف نشاط آدھا رہ گیا اور اگر دو میں سے ایک بھی عورت نہیں تو بس بے بہرہ غرق سمجھیے! اچھا! جناب کے پلے پڑا؟"

"جانی تم تو افلاطون کے کان کترنے لگی!"

"نقراط صاحب! عظیم ہستیاں ہر لحاظ سے اور ہر اعتبار سے عظیم نہیں ہوتیں۔ یہ تو گویا ناممکنات میں سے ہے کہ فانی انسان دیوتاؤں پر تفوق حاصل کرنے لگیں ــــ فلاتث کو تجارت کی ابجد بھی معلوم نہیں تھی۔ اسقاقلیس فن مصوری سے بے بہرہ تھا۔ افلاطون فن عاشقہ سے نابلد محض ــــ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے تمام تابعین ــــ فلسفہ دان، شعراء، خطیب ــــ رموزِ حسن و عشق سے ناواقف ہیں۔ مانا کہ وہ سب کے سب عظیم فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں مگر محبت کرنا کسی ایک کو بھی نہیں آتا۔ نقراط! بس تم میری بات مان لو کہ میں جو کہتی ہوں سچ ہے۔"

فلسفی نقراط اس پر بہت جزبز ہوا۔ مگر پھر بھی ضبط کر کے بولا "تمہاری راست گوئی میں کلام نہیں مگر تمہاری بے ادبیوں کو دور سے سلام! جانِ من سچ بات کہنا بُرا نہیں بشرطیکہ شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ میں تو سرسری طور پہ ایک بات احتجاجاً کہہ رہا تھا اور تم ہو کہ رنجیدہ ہو کر بزرگان علم و فن کی تضحیک پر اتر آئی ــــ"

وہ چند لمحے خاموش رہا اور پھر نہایت دانشورانہ لہجہ میں بولا "مجھے تسلیم ہے دو عورتوں کا ملاپ ایک حد درجہ سحر انگیز شے ہے بشرطیکہ دونوں اپنی تمام تر خصوصیات نسوانیت قائم رکھ سکیں۔ لاریب! عورتوں کے عملِ اختلاط کی نوعیت بے حد غیر معمولی ہے کیونکہ دو عورتوں کا باہمی اندازِ بوس و کنار سطحی اور اس سے حاصل ہونے والا کیف و سرور بیحد لطیف ہوتا ہے۔ ان کی ہم آغوشیوں میں تشدد ناپید ہوتا ہے وہ ایک دوسرے کے جسموں پر مچلتی ہیں اور اس طرح ایک بے پایاں کیف حاصل کرتی ہیں۔ ان کی شبِ زفاف کی معراج خوں ریزی پر نہیں ختم ہوتی بلکہ اس شب عروسی کی ابتدا سے انتہا تک ایک دائم و سائم حالت دوشیزگی قائم رہتی ہے۔"

نقراط نے مزید کہا "انسانی محبت حیوانی طریق مقاربت سے صرف دو چیزوں میں

مختلف ہے۔ مساس اور بوسہ! اور یہ دونوں چیزیں عورت کی فطرتِ لطیف میں ودیعت ہیں۔ فنِ معانقہ اور بوسہ بازی کو عورتوں نے ہی معراجِ کمال پر پہنچایا ہے۔"

"آفریں نقراط! آفریں! یہ اندازِ بیاں صرف تمہارا ہی حصہ ہے۔ مگر اب کچھ ہمارے خلاف بھی کہو!"

"اگر اپنے خلاف ہی کچھ سننے پر مُصر ہو تو سنو! تم ایسی عورتوں کی تعداد اب ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔ ان گنت عورتیں اب اپنی ہم جنسوں سے کسبِ تلذذ کرنے لگی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ دن دور نہیں جب تم اور تمہاری ساری قوم ہم آشفتہ سر مردوں سے بے نیاز ہو جائے گی اور کبھی بھول کر بھی ہماری ضرورت محسوس نہ کرے گی۔ اس متوقع رقابت کی بنا پر میں سب باتیں کہہ رہا ہوں۔"

اس مرحلہ پر نقراط نے محسوس کیا کہ بات بہت بڑھ گئی ہے چنانچہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "تو کیا نجیتؔ سے کہہ دوں کہ جناب تشریف لا رہی ہیں؟"

یقیناً۔ "میں ضرور حاضر ہوں گی!"

نقراطؔ نے اس پر آسس کو تعظیماً چوما اور پھر "سب بخیر" کہہ کر باہر نکل گیا۔

جب وہ چلا گیا تو جانے کیوں کر آسس بھڑک سی اٹھی۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ آپ ہی آپ چلانے لگی "نجیتؔ... نجیتؔ... نقراط اس کے یہاں سے آیا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ وہاں کیا ہو گیا ہے؟ کیا آئینہ ابھی نجیت کے پاس ہی ہے۔ اے کاش! دماطریس مجھے بھول نہ گیا ہو! اگر اب تک اس نے وہ... وہ... کام نہیں کر ڈالا تو اب وہ اسے ہرگز نہیں کر سکے گا۔ اور... اور... گویا میں لٹ جاؤں گی۔ برباد ہو جاؤں گی... لیکن نہیں وہ ضرور اپنا کام کر چکا ہو گا۔ لیکن مجھے کیسے معلوم ہو کہ وہ واقعی اپنا کام... میرا کہا ہوا کام کر چکا؟ نجیتؔ کے پاس ایک نہیں اور بھی بہت سے آئینے ہیں۔ میں کس طرح جان سکوں گی کہ وہ خاص آئینہ چرایا جا چکا... جالاؔ! جالاؔ!"

کنیز فوراً حاضر ہو گئی۔

"ذرا شطرنج کے استخوانی پانسے لانا۔ ذرا دیکھوں میری قسمت میں کیا ہے؟"

استخوانی پانسے آ گئے تو اس نے وہ ہوا میں پھینکے۔

"جالا! اری دیکھو! پانسے الفرودہ رُو گرے ہیں!"

الفرودہ روئی کا مطلب تھا چاروں پانسے مختلف پہلوؤں پر گرے تھے۔ کھیل کا یہ بہت ہی نادر انداز مانا جاتا تھا کیونکہ یہ انداز منتیس ۲ میں ایک بار بمشکل نصیب ہوتا تھا۔

جواب میں جالا نے بہت سرد مہری کا ثبوت دیا۔ "آپ نے کیا بات مانگی تھی؟"

"اوہ!" کرائسس نہایت افسردہ ہو کر بولی۔ "میں کچھ مانگنا تو بھول ہی گئی۔ میرے ذہن میں ایک بات تھی ضرور مگر عین وقت پر بھول گئی۔ کیا کچھ نہ مانگنا بری بات تو نہیں؟"

"غالباً نہیں۔ آپ پانسے ایک بار پھر اُچھالیں!"

کرائسس نے ایک بار پھر پانسے پھینکے۔

"میڈا تھرو! کیا خیال ہے تمہارا؟"

"کچھ عرض نہیں کر سکتی۔ پانسوں کا یہ انداز افتاد یعنی میڈو تھرو برا بھی ہے اور اچھا بھی۔ آپ ایک پھر قسمت آزمائیں صرف ایک بار اور پانسہ پھینکیں!"

تیسری بار کرائسس نے ایک پانسہ پھینکا جوں ہی وہ گرا اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"شیلوس کا اِکّہ؟"

جالا بھی گھبرا گئی۔ مگر عمداً چپ رہی کرائسس اپنے بستر پہ جا گری اور ہاتھوں میں سر دے کر زار و قطار رونے لگی۔ پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "تو نے مجھے پانسے بار بار پھینکنے کو کیوں کہا تھا؟ مجھے یقین ہے پانسوں کا پہلا انداز ہی اہم تھا۔"

"اگر آپ نے کچھ مانگا تھا تو پہلا انداز ہی اہم تھا۔ اگر نہیں تو نہیں — آپ ہی بتلائیں!" جالا بولی۔ "خیر کچھ بھی ہو، پانسے بیکار شے ہیں۔ میں اس یونانی کھیل کی قائل نہیں۔ میں ایک اور طرح

قسمت دیکھوں گی؟

آنسو ختم گئے تو وہ اٹھی اور تیزی سے، کمرے کو عبور کر کے ایک دوسرے کمرے میں پہنچی وہاں ایک صندوقچی پڑی تھی۔ جس میں سے اس نے تینتیس ۳۳ بلّوری چھلے نکالے اور میز پر رکھ دیئے۔ اس کے بعد اس نے ایک ہیرے کی قلم سے ایک دندانِ فیل کی ساختہ تختی پر عبرانی زبان کے ۳۳ حروف تہجی لکھے۔ فال نکالنے کا یہ طریقہ اس نے اپنے وطن مالوف غلیلہ میں سیکھا تھا۔

مجھے اس طریقہ فال پر یقین ہے، یہ ہرگز غلط نہیں ہو سکتا۔ اپنے لبادہ کو میں اٹھاتا ہیں اسے بطور تھیلا استعمال کروں گی۔" یہ کہہ کر کراسّس نے بلوری چھلے اس کے دامن میں ایک ایک کر کے ڈالنے شروع کیے اور ساتھ ہی وہ ایک عبرانی منتر پڑھنے لگی۔

منتر پڑھ چکی تو اس نے کہنا شروع کیا۔ "کیا میں الفروّت والا ہار پہنوں گی؟ . . . کیا میں الفروّت والا ہار پہنوں گی؟ کیا میں . . . ." اور ساتھ ہی اس نے چھلے باہر نکالنا شروع کر دیئے۔ اس نے بمشکل دسواں چھلا ابھی چھوا بھی نہ تھا کہ وہ تڑاخ سے ٹوٹ گیا اور کراسّس خوشی سے جھوم اٹھی۔ "ہاں! میں الفروّت والا ہار ضرور پہنوں گی!"

کرائسس کا گلاب

جلوس کیا تھا ایک سیلاب رنگ و بُو تھا —

ہاتھوں میں گلدستے اور سُرخ پا فاختایئں پکڑے، باریک نیلے نقابوں میں ملبوس، بے بہا زیورات میں آراستہ قرطبیرایئں سر جھکائے خراماں خراماں قربان گاہ کی طرف چلی آ رہی تھیں ان کے آگے سر سے پاؤں تک سیاہ رنگ کا مکلف جبہ پہنے ایک عمر رسیدہ عامل عشائے ربانی چلا آ رہا تھا۔

وہ سب کی سب گنگنا رہی تھیں۔ یہ مترنم گنگناہٹ سمندر کی طرح سبک سار، بادِ دوپہر کی طرح گریہ آمیز اور مترائے دہن سے نکلنے والی سانس کی طرح بے چین تھی۔ سب سے اگلی دو قرطبیراؤں کے ہاتھوں میں بربط تھے جو دور سے درخت کی نازک ٹہنیوں سی درانتیاں معلوم ہوتے تھے۔

ان میں سے ایک آگے بڑھی اور گویا ہوئی "اے محبوبہ بسائیرس اطر القرہ تیرے حضور میں اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا ایک نیلگوں نقاب پیش کرتی ہے تاکہ تیرا لطف و کرم جاری رہے"

دوسری نے کہا "اے معبودۂ زرتاج! ماؤسارہ یہ تیرے قدموں پر عشق پیچاں کے پھولوں کے ہار اور ایک گلدستۂ نرگس نثار کرتی ہے۔ یہ سب کے سب پھول اس نے ایک ہنگامہ خرمستی کے دوران میں پہن رکھے تھے۔ ان کے خمار آلود عطر میں وہ تیرا نام متواتر پکارتی رہی — اے ربۃ فتح و نصرت! اس منفعتِ عشق کو قبول فرما!"

ایک اور بولی "اے شاطرہ زرکار! طائمہ تیری خدمتِ قدس میں اپنا وہ مار آسا ہار پیش کرتی ہے جو آج تک اس کی عریاں بانہوں کی زینت رہا۔ تو اس ہار کو زینتِ گلو بنا!"

مرطوب میلہ اور رعودث ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھیں ”یہ رہیں دو سمر نائی فاختائیں!
ان کے بال و پر لمس زدہ حصہ بدن کی طرح سپید اور ان کے پیر لب ہائے بوسہ رسیدہ
کی طرح لال ہیں —— اے ربہ تمناتناس! ان فاختاؤں کو ہمارے باہم پیوستہ ہاتھوں سے
قبول فرما!“

ان کے ایک نوخیز نورطنیرہ سامنے آئی ”اے روح الفرودت! میرا ہدیہ دوشیزگی
اس خون آلودہ قبا کی شکل میں قبول فرما۔ میں فاروس والی فشاش ہوں جس نے گذشتہ رات
اپنے آپ کو تیرے لیے وقف کر دیا۔“

ایک دوسری ”اے منبع فیض وکرم عیسطر وفہ! ڈورتھیا تیرے سامنے منتظر کرم
کھڑی ہے۔ یا تو اس کے دل سے عبرڈس کی پھونکی ہوئی ہوائے نفس نکال دے یا سرد مہر
عبرڈس کی آنکھوں میں شعلۂ نفس پیدا کر دے۔ ڈورتھیا تیری خدمت میں تیری دل پسند شاخ
حنا پیش کرتی ہے۔!“

ایک اور ”اے ربہ دل نواز، اے پافیہ! میں ہوں فلستان! ساٹھ نقرئی دراخم حلقز
ہیں۔۔۔ منوائے خلوتانیز کے بخشے ہوئے معاوضہ حسن میں سے میرے پاس صرف
یہی رقم بچی ہے گر قبول افتد زہے عز و شرف! فلستان! پھر حاضر خدمت ہو گی بشرطیکہ
تو نے اسے خلوتانیز ایسے اور دریا دل عاشق عطا فرمائے“

قربان گاہ کے سامنے اب صرف ایک شرمیلی بچی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ
میں پھولوں کا معمولی سا ہار تھا جو حامل عشائے ربانی کو پسند نہ آیا تھا اور اسی وجہ سے
وہ اب رنجیدہ نظر آرہا تھا۔

بالآخر وہ بچی بولی ”اے زر فشاں ادلیبہ! میرے پاس نقرئی سکے نہیں جو میں
تیرے حضور میں پیش کروں، غریب ہوں، مسکین ہوں مگر تیری نام لیوا ہوں۔ وہ کون
سی شے ہے، جو تیرے پاس نہیں۔ اور میں تجھے پیش کر سکوں۔ یہ رہے چند ہرے اور

زرد سرشتہ پھول تیرے قدموں کی زینت کے لیے اوراب ہیں۔۔۔۔"

اپنا فقرہ مکمل کیے بغیر اس نے جلدی جلدی اپنی عبا کے بکسوئے کھول دیئے۔ عبا آن کی آن میں زمین پہ آرہی اور وہ مجسم برہنگی بن گئی ــ "اور اب یہ رہی میں ــ تیری اور فقط تیری ـــ اے معبودۂ من! میں تیرے حضور میں دعا مانگتی ہوں کہ تو مجھے ایک نورطینرہ بنادے تاکہ میں اپنی زندگی باغاتِ معبد میں بسر کرسکوں میں ایک نورطینرہ کی موت مرنے کی آرزو مند ہوں۔ قسم کھاتی ہوں کہ میں تمام عمر عشق ومحبت کے سوا کسی دوسری شے کی خواہش نہ کروں گی۔ میری حیات کا مقصدِ اعلیٰ عشق سے عشق کرنا ہوگا۔ میں تمام دنیا سے کنارہ کش ہو کر تیرے مقدس قدموں میں جائے امان ڈھونڈتی ہوں ــــــ"

اس پر پیشوائے اعظم نے اس کے نرم و نازک جسم پہ عطریات چھڑکے اور اس کے بعد اُسے طرالفرہ کا نذر کیا ہوا نقاب پہنایا۔

رسوماتِ قربانی قریب الاختتام تھیں اور تمام نورطینرائیں واپس مڑنے ہی والی تھیں کہ ایک اور عورت بابِ معبد سے اندر آتی دکھائی دی۔ وہ خلافِ معمول تہی دست تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوی کے حضور میں اپنا سرمایۂ حسن بطور ہدیۂ عقیدت پیش کرے گی۔

وہ ایک منفرد جمال کی حامل تھی۔ اس کے گھنے سنہری بال دو حصوں میں منقسم تھے جس سے اس کی پیشانی جھکی جھکی باقی تھی۔ گندھے ہوئے بالوں کا یہ دلفریب سلسلہ کانوں کو محیط کرتا ہوا پشتِ گردن پہ ایک ہفت تو عقاص بن گیا تھا۔ اس کی ناک ستواں اور نازک تھی۔ اس کے مسی آلودہ لبوں کے مدور گوشوں پہ گاہے گاہے لرزنے والی سوراخ ہائے بینی نمایاں تھے۔ اس کا لچکیلا خطِ بدنی گام گام پہ لہراتا تھا اور اس کا ہر قدم اثمارِ شباب کی حیات آفریں اور آویزش، بل کھاتی ہوئی نازک کمر اور زانا کولھوں کی دم بدم جنبش سے متاثر تھا۔

اس کی آنکھیں غیر معمولی تھیں ــ پلکوں اور پپوٹوں کے بارِ لطیف سے بند بند سی

نیلی گہری عمیق اور تابناک، پرنم اور خستہ آتش و آب سے معمور، انداز نگاہ دختران آب کے ترنم کی طرح سحر انگیز۔

پیشوائے اعظم اس کی طرف متوجہ ہوا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ کیا کہتی ہے؟

بالآخر وہ بولی۔ "اے کرشنبیہ! کرشنس۔ تیری حقیر پرستار تجھ سے بصد عجز مخاطب ہے۔ — قبول فرما ان ناچیز تحائف کو جو وہ تیرے قدموں میں پیش کرنے والی ہے۔ سن، غور کر، کرم کر اور شاباش دے اسے جو تیرے نقش قدم پر گامزن ہے۔ جو تیرے نام کی پجارن ہے اور محض تیری پرستش و تقلید کے لیے زندہ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ طلائی انگشتریوں سے مزین ہاتھ جوڑ کر تعظیماً جھکی —

نغمہ حمد پھر مبہم انداز میں شروع ہوا۔ کسی نے بربط چھیڑا اور اس کی سرمدی لہریں پروہت کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے برتن میں سلگنے والے لوبان کے دھوئیں سے مل مل کر مورتی کا طواف کرنے لگیں۔

وہ تن کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس نے اپنے کمربند سے آویزاں کانسی کے آئینہ کو پیش کیا۔

"اے اسطارطۂ شب! اے کہ تو جو بیتاب ہاتھوں اور تشنہ نشاط ہونٹوں کو باہم ملانے والی ہے! اسے کہ تو جس کا نشانِ امتیاز شام کی زرد مٹی پر نقش پائے خزاں ہے کرشنس تجھے اپنا آئینہ نذر کرتی ہے وہی آئینہ جس نے اس کی مژگاں کے تلے گاہے نیند کی شبنم کا نزول اور گاہے ولولۂ نفس کو مچلتے دیکھا ہے۔ وہی آئینہ جس نے اس کی آنکھوں میں آسودگیٔ نفس کی شبنمی جھلک دیکھی ہے۔ وہی آئینہ جس نے اس کی زلفوں کو کشمکشِ بوس و کنار سے کنپٹیوں پر پیدا ہونے والے پسینہ میں ڈوبے دیکھا ہے۔ اے ہمارے جسموں اور ہونٹوں کو باہم ملانے والی قوت بے پایاں کی مالک معبودہ! ناچیز بندی کا آئینہ قبول فرما۔"

پیشوائے معبد نے آئینہ کو مورتی کے قدموں میں رکھ دیا تو کرشنس نے اپنے

سنہری بالوں سے وہ شانہ نکالا جو دیوی کے نام نامی سے منسوب دھات تانبہ کا بنا ہوا تھا۔

"اے صبح خونرنگ اور کف آلود قہقہۂ بحر سے پیدا شدہ اندرین! یہ شانہ تیری نذر!"

"اے زہرۂ بے حجاب! اے مجسمۂ گوہریں! اے بخشندۂ دردہائے شیریں و دل گداز! اے قہرمان! یہ شانہ جو بارہا میری آوارگی پسند زلفوں سے الجھا ہے۔ اپنے نم آلود بالوں کے لیے قبول فرما!"

یہ کہہ کر اس نے شانہ پیشوائے معبد کے حوالے کر دیا اور اس کے بعد سر جھکا کر اپنا زمرد میں ہار اتارنے لگی۔ ہار اتار چکی تو گویا ہوئی "اے حاطیرہ! اے کہ تو جو عارضِ دوشیزہ سے آبِ حیا اڑاتی ہے۔ اے کہ تو جس کے دم قدم سے ایک باحیا کنواری لڑکی فوراً خندۂ بیباک پہ اتر آتی ہے اسے کہ تو جس کی خاطر صنفِ نازک اپنی متاعِ عصمت بیچنے سے دریغ نہیں کرتی۔ اے کہ تو جسے شرمیلی ادائیں ناپسند ہیں۔ مہربان ہو اور ازراہ نوازش یہ ہار پسند فرما! — یہ ہار نہیں ایک گرانقدر معاوضۂ حسن ہے۔ جو کرائسس نے ایک ایسے عاشق سے وصول کیا جس کا اسے اب نام تک یاد نہیں — اس ہار کا ہر زمرد اس بوسۂ شیریں کا آئینہ دار ہے جو تیرے نام پرومنِ کرائسس پہ ثبت ہوا۔"

وہ ایک بار پھر تعظیماً جھکی اور اس کے بعد اس نے اپنا ہار پیشوائے معبد کو دے دیا۔

قبل اس کے کہ معبد سے باہر جانے کے لیے اس کے قدم اٹھنے لگتے عالم عشائے ربانی نے اسے روکا اور پوچھا "ان بے بہا ہدایائے عقیدت کے عوض تو نے مقدس دیوی سے کیا مانگا؟"

وہ ہنسی اور پھر اپنے سر کو ایک خفیف جنبش دیکر بولی "مجھے کچھ نہیں چاہیئے تھا۔"

کرائسس کا متکبرانہ جواب سن کر پیشوائے معبد سناٹے میں آگیا۔

وہ خرامِ ناز سے آہستہ آہستہ جلوس کے آگے سے گزر رہی تھی کہ اس کی نظر اچانک پھولوں کی ایک ٹوکری پر پڑی اور وہ ایک لمحہ کے لیے رک گئی اور پھر ایک نہایت ساحرانہ ادا کے ساتھ اس نے ایک گلاب کا پھول اٹھایا، سونگھا اور پھر اس کی ڈنڈی کو منہ میں لے کر معبد سے باہر

نکل گئی۔

جلوس کی تمام عورتیں بھی ایک ایک کرکے اس کے پیچھے ہولیں اور باب معبد کواڑ بند کر دیئے گئے

پایۂ مجسمہ میں بنے ہوئے مخفی گوشے میں تنہا کھڑے دماطریس نے اس عظیم منظر کا ہر رخ دیکھا اور اس کا ہر لفظ سنا۔ جب وہ منظر اختتام پذیر ہو گیا تو اس کے بعد بہت دیر تک وہ سناٹے میں آیا رہا۔ ایک بار پھر اس کی قوت ارادہ متزلزل ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر ہیجان نفس اس پر غالب آرہا تھا۔ اسکا خیال تھا وہ کل والے خبطِ عشق اور جنون آشفتگی سے مکمل طور پر آزاد ہو چکا ہے اور پھر کبھی اس اجنبی عورت کو دیکھ کر بے چین نہیں ہو گا مگر یہ تمام خیالات وقت آنے پر بالکل خام ثابت ہوئے۔

عورت، اے عورت، تو کہاں ہے، اگر تو محبت کی متلاشی ہے تو سامنے آکر ایک بار اپنا جلوۂ حسن دکھا۔ کرائسس کو حرم معبد میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کے جذبات ایک دم بھڑک اٹھے تھے۔ یہ خلفشار اس قدر تند اور شدید تھا کہ اس کی تمام تر قوتِ انضباط جواب دے گئی اور وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ وہ اب اپنے آپ کو کسی فاتح انسان کے رتھ میں جتا ہوا ایک وحشی محسوس کر رہا تھا۔ اس دردناک حالت اضطراب سے اب تو فرار بھی ایک واہمہ معلوم ہوتا تھا۔ کم بخت نہیں جانتی تھی وہ کیا کر رہی تھی؟ کیا ستم ڈھا رہی تھی! اسے کیا معلوم کہ اس کی ساحرانہ ادائیں کیسے لوٹ رہی تھیں؟ آہ! وہ بیچارا صید ہوس!

اس نے جب اسے فاصلے پر خراماں خراماں آتے دیکھا تو وہ ریشمیں قبا میں ملبوس تھی جو اس نے گودی پر ملاقات کے وقت پہن رکھی تھی۔ وہی پہلے کی سی مستانہ چال تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ حرم معبد میں دماطریس کی موجودگی سے آگاہ تھی۔ حیرت تھی کہ دماطریس جو چند لمحے پیشتر اس کے خیال تک سے متنفر تھا اب اسے دوبارہ دیکھ لینے کے بعد فوراً اس کے قدموں میں دیدۂ و دل بچھا دینا چاہتا تھا۔ جب کرائسس نے اپنے کمربند سے آئینہ نکالا اور

اسے پیشوائے معبد کو دینے سے پہلے ایک بار اس میں جھانکا تو اس کی آنکھوں میں ایک خیرہ کن چمک پیدا ہوئی اور جب اس نے تانبا کا شانہ اپنے بالوں سے نکالنے کے لیے اپنی باہیں شرآبیت بنات فیوس کی طرح اوپر کو اٹھایئں تو اس کا دلفریب خط بدنی قبا کے نیچے دفعتہً متحرک ہوا اور اس کی بغلوں کے نم آلود گڑھوں میں آفتابی شعاعیں لہرایئں۔ اسی طرح جب اس نے اپنے زمردیں ہار کو اتارنے کے لیے سامنے قبا کو کھولا تو دماطریس نے چاہا کہ وہ اس عریانی پوش قبا کو سر سے اتار کر دور پھینک دے اور پھر اس کے نازک اندام کو گل ہائے بوسہ سے سرفراز کر دے مگر اسی اثنا میں کہ آتسس نے بولنا شروع کر دیا تھا۔

چنانچہ وہ بول رہی تھی اور اس کی گفتار کا ہر لفظ دماطریس کے دل میں درد بن کر سما رہا تھا۔ وہ مسرور و بے خود ہوئی جا رہی تھی۔ اپنے سراپائے حسن کو گہوارہ شہوانیات سمجھ کر اس کا سراپا مرمریں مجسمہ کی مانند تھا۔ اس کے سنہری بال امواج زرتار کی طرح لہرا رہے تھے وہ اس کا اپنے اس دروازہ کا ذکر کرنا جو ہر راہ گیر کیلئے وا تھا۔ وہ اس کا اپنے اس جسم کے گن گانا جو ہر بوالہوس کو دعوت عام دیتا ہے، ـــــ اور تو اور اس نے اس آگ اور جلن کا بھی فخر سے ذکر کیا جو کمسن لڑکے اس کے تن بدن میں لگاتے تھے اور جس کے اثر سے اس کے رخسار انگاروں کی مانند دہکنے لگتے تھے۔ دورانِ خطاب اس نے اپنی آنکھوں کی ساحرانہ جنسی کشش کی تعریف کی اور اپنے لب ہائے لعلیں کی اطاعت شعاری کو سراہا۔ جو اس کی خاطر ہر رات بکتے تھے اور اپنے ان گیسوؤں کو دادِ تحسین دی جو بدذوق ہاتھوں میں بھی بخوشی لہراتے تھے۔ اور اپنی اس نفاستِ حسن کی شان میں قصیدہ خواں ہوئی جو دوسروں کی بے رحم پامالی کے باوجود اپنی جگہ پہ ایک چٹان کی طرح قائم تھی۔ حیرت تھی کہ آتسس اپنی اس تمام ارزانیٔ حسن، اپنے اس واضح ہرجائی پن اور عوامی مقبولیت کے باوجود دماطریس کو قابل قبول تھی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اسے فوراً پکڑے اور اسے کسی ایسے گوشۂ خلوت میں مقید کر دے جہاں وہ کافرادا حسینہ صرف اس کے لیے وقف

ہو جائے۔ چنانچہ جب کرسٹمس نے اس امید پر کہ اسے ایک بے بہا ہار عنقریب ملنے والا ہے اپنا زمردیں ہار دیوی کی نذر کر دیا تو وہ نہایت مطمئن ہو کر شہر کی طرف رُخ موڑنے ہی والی تھی کہ دماطریس کا تمام ولولۂ نفس، اس کا تمام ارادۂ عیش آن کی آن میں گلاب کا وہ پھول بن گیا جو کرسٹمس نے ایک گلدستہ میں سے چرایا تھا اور اب اس کی ڈنڈی کو منہ میں لیے چبا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد حرم معبد میں دماطریس کے سوا کوئی نہ تھا۔

باہر جانے سے پیشتر اس نے مجسمہ الفرودت کو ایک بار پھر دیکھا تو وہ کانپ سا گیا جیسے اس کے باطن کی گہرائیوں سے عنقریب ایک طوفان اٹھنے والا تھا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ وہ طوفان اٹھے اور اسے سمیٹ کر وہاں سے لے جائے مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ کرسٹمس کو پا لینے کی زبردست خواہش کو بدستور اپنے اندر موجزن پاتا تھا۔

آخر وہ نازک لمحہ بھی آ ہی گیا جب وہ بغیر کسی تاسف و توقف کے پایۂ مجسمہ پر چڑھا اور اس کے لرزاں ہاتھوں نے سچے موتیوں کے ہار کو الفرودت کے گلے سے اتار کر اس کی جیب میں رکھ دیا۔

حکایتِ بربط

شہر کو جانے والی سڑک پر کراٹسس کو پکڑ لینے کے خیال سے وہ نہایت تیزی سے چل رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اسے دیر ہو گئی تو اس کا ارادہ ایک بار پھر بدل جائے گا۔ یعنی کراٹسس سے محبت کی جگہ نفرت لے لیگی۔ چنانچہ وہ بھاگا جا رہا تھا آنکھیں بند کیے ہوئے کیوں کہ جہاں شاہراہ تپنے لگی تھی وہاں سورج کی روشنی بھی بہت خیرہ کن تھی۔ اس طرح اندھا دھند چلتے چلتے اس کی ٹکر چار سیاہ فام حلقہ بگوش خدام سے ہو گئی جو ایک جلوس کے آگے آگے تھے۔ ادھر ٹکر ہوئی ادھر کسی نے مترنم آواز میں کہا: "محبوب من! میں کس قدر خوش قسمت ہوں کہ تم نظر آئے!"

اس نے سر اٹھایا تو اس کی نظر معاً ملکہ برنیس پر پڑی جو اپنی کہنیوں کے بل پالکی میں بیٹھی تھی۔

"رک جاؤ" اس نے پالکی برداروں کو حکم دیا اور ساتھ ہی اس نے اپنے بازو اپنے عاشق کے لیے آگے کو بڑھائے۔

دماطرتس اگرچہ بے حد دل برداشتہ سا تھا مگر انکار نہ کر سکا اور طوعاً و کرہاً پالکی میں چڑھ گیا۔

فرط مسرت سے پاگل ملکہ گدگدے تکیوں سے بھرپور پالکی کے ایک گوشہ میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ پالکی کیا تھی ایک مکمل استراحت خانہ تھا جسے چوبیس غلام اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ بارہ عورتیں نہایت آسانی کے ساتھ اس کے نیلے اور نرم غالیچے پر لیٹ سکتی تھیں غالیچہ پر جگہ جگہ تکیے قرینے سے سجے ہوئے تھے پالکی کی چھت بہت اونچی تھی اور اسے پنکھے سے بمشکل چھوا جا سکتا تھا۔ وہ عرض میں کم مگر طول میں زیادہ تھی۔ اگلی طرف سے بالکل بند مگر بقیہ سہ اطراف پر زردی مائل زربفت چمکیلے پردے آویزاں تھے۔ پشت کی دیوار پر صندلی رنگ کا ایک ریشمیں پردہ لٹک رہا تھا دیوار کے بالائی حصے پر مصر کا قومی نشان یعنی عقاب پر پھیلائے ہوئے جلوہ گر تھا۔ عقاب کے نیچے اسطارطہ کا امتیازی نشان

نقش کیا ہوا تھا۔ ایک گوشے میں چاندی اور ہاتھی دانت کا بنا ہُوا چراغ تھا جس کی لو سورج کی روشنی کی طرح کا ہے مدھم گا ہے تیز ہوتی رہتی تھی۔ اس وقت ملکہ دو بادکشں بردار ایرانی لونڈیوں کے درمیان بیٹھی تھی۔

بُت تراش کو آنکھ کے اشارے سے اپنے قریب بلا کر وہ آہستہ سے بولی "میرے محبوب! میں بہت خوش ہوں!"

اس کے بعد ملکہ نے اس کے گال کو پیار سے تھپک کر کہا "میں تو تمھیں ہی دیکھ رہی تھی، پیارے! جانے دو دن تم کہاں غائب رہے؟ سچ مانو، اگر آج بھی تم نہ ملتے تو میں غمِ فراق میں جان دے دیتی۔ اس پالکی میں اپنے آپ کو تنہا پا کر میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ ہم لوگ جب نیس پل پر سے گذر رہے تھے تو میں نے اپنے تمام ہیرے اور جواہرات پانی میں پھینکوا دیئے اور بیکار اُن دائروں کو تکا کی جو ان کے گرنے سے پانی میں بنتے اور ختم ہو جاتے تھے۔ اب میرے پاس نہ انگشتریاں ہیں اور نہ ہار۔ اب تم پاس ہو تو گویا میری حالت ایک فقیر کی سی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اس کی طرف پلٹی اور اس کا منہ چومنے لگی۔ اس کے بعد ملکہ نے لطیف سرگوشیاں شروع کر دیں۔ ملکہ کو اس طرح دفعتہً مائل بہ جنوں ہوتے دیکھ کر دونوں کنیزیں قدرے شرما گئیں اور انھوں نے فوراً اپنی آنکھیں بند اور کانوں میں انگلیاں دے لیں گویا نہ تو وہ کچھ دیکھ رہی تھیں اور نہ کچھ سن رہی تھیں۔

لیکن ایک دماطریس تھا جو بت بنا ہوا نہ تو کچھ منہ سے کہہ رہا تھا اور نہ ملکہ کی باتیں سنتا معلوم ہو رہا تھا وہ حد درجہ ملول و مضطرب تھا۔ سوائے اس سرخ مسکراہٹ کے جو ملکہ کے دہن پر رقصاں تھی دماطریس کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔

"محبوبِ من! تیرے فراق میں تمام رات میں اشکبار رہی۔ میری سیج یخ بستہ معلوم ہوتی

تھی۔ اچانک جاگی تو میری بانہوں نے تمہیں اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر تم کہیں ہوتے تو ملتے ـــ صبح کو بھی تمہارا انتظار رہا۔ طلوعِ ماہتاب کے ساتھ ہی تم ایسے غائب ہوئے کہ میرے غلام شہر میں جگہ جگہ تمہیں بے سود ڈھونڈا کئے۔ وہ ناکام و نامراد واپس آئے تو میں نے انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ تم باغاتِ معبد میں بھی نہ تھے۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم ان اجنبی عورتوں کے یہاں بالکل نہیں گئے کیا تم حرمِ معبد میں تو نہیں رہے؟ یقیناً رات تم نے وہیں بسر کی ہوگی اس لیے کہ مجھ سے زیادہ تم اس مجسمہ کو چاہتے ہو حالانکہ اس میں میرے ہی جمال کا پرتو ہے۔ کیا نہیں؟ مورتی کی آنکھیں، اس کا دہن، اس کا سینہ ـــ سب کے سب میرے ہی تو ہیں مگر تم ہو کہ اس پر فدا ہو ـــ مجھ پر نہیں۔ یہ شاید اس لیے کہ میں تم پہ فدا ہوں اور تمہاری جدائی میرے لیے دلدوز اور روح سوز ہے۔ میں جانتی ہوں میری آشفتہ سری سے تم بیزار ہو اور اسی لیے میری بجائے تم اپنے تخلیق کردہ مجسموں کے متعلق سوچتے رہتے ہو۔ گویا میں اتنی حسین نہیں ہوں جتنی تمہاری مورتیاں ہیں ـــ تسلیم میں ان کی طرح نازک نہیں ہوں مگر داد دو کہ اس کے باوجود کوشاں ہوں کہ اپنی ہر رعنائی و جمال کو تمہارے اور صرف تمہارے لیے وقف کر دوں اور تمہاری ہر ادائے مزاحمت، تمہارے ہر لفظ انکار کو اپنا نوشتۂ تقدیر سمجھ کر اپنے دلِ حزیں کو تسلی دوں۔۔۔ عجیب میرے عاشق ہو کہ اپنی جانثار اور شیدائی ملکہ سے کسی شے کے خواہاں نہیں ہو۔ تمہیں مصر کی بادشاہت تک قبول کرنے سے انکار ہے۔۔۔ تمہیں یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی تمہیں اپنے من مندر کا دیوتا بنا کر تمہاری دن رات پوجا کرے۔ گویا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہاری مزید آرزو کروں۔۔۔۔"

اپنے پیروں کو سمیٹ کر وہ قدرے اور زیادہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

"اے محبوب دلفگار! تو میرے محل میں کم از کم آیا تو کر! پھر دیکھ میں تیرے لیے کیا نہیں کر سکتی؟ اگر تو میری خاطر نہیں آ سکتا تو بتا، میرے محل میں وہ کون ہے جو تجھے پسند

ہے؛ مرغوب ہے؛ بتا کس کی ادائے ناز میں تجھے جاذبیت محسوس ہوتی ہے؛ وہ خوش نصیب کنیز یقیناً میری ہمدرد ہوگی اور تیری دل نوازی کے قرینہ پہ نازاں —"

مت بھول کہ میری محل سرا میں ایک سے ایک بڑھ کر حسین عورتیں ہیں! محل کے شاہی زچہ خانے میں تجھے بارہ ایسی دوشیزائیں ملیں گی جنھوں نے آج تک مرد کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ وہ سب کی سب تیری داشتائیں بننے پر فخر محسوس کریں گی، بشرطیکہ تو ان سے فراغت پا کر میرے پاس بھی چند لمحے گزار جایا کرے۔ قصرِ شاہی میں میرے پاس وہ وہ عورتیں ہیں جن کے جنسی تجربات باغات معبد کی نورطیزاؤں سے زیادہ قیمتی اور رنگین ہیں، حکم دو اور میری ایک ہزار لونڈیاں تیرے قدموں میں سربسجود ہوں گی۔ تو جسے چاہے اپنا لینا۔ میں تیری منتخبہ حسینہ ناز کو ملبوساتِ زربفت پہنا کر تیرے سامنے پیش کروں گی!"

" مگر نہیں تو جس قدر حسین و جمیل ہے اسی قدر سنگدل بھی ہے۔ تو اس دنیا میں کسی کو نہیں چاہتا۔ تو صرف دوسروں کو اپنے اوپر مرتے اور مٹتے دیکھنا چاہتا ہے، تو فقط اس کا طلب گار ہے جو تیری آنکھوں میں شعلۂ نفس بھڑکا سکے۔ مانا کہ میں نے بارہا تجھ سے کیفِ نشاط حاصل کیا ہے۔ مگر کیا اس یک طرفہ عشق بازی میں تیری حیثیت اس چوپائے کی سی نہیں رہی جس کا ہم دودھ دوہتے ہیں تو وہ دوسری طرف دیکھتا رہتا ہے؛ تو سراپا خود بیں ہے۔ !... اے بیتاب و مضطرب نوجوان! تجھے کیوں دوسروں کی محبت متاثر نہیں کر پاتی؛ سن غور سے سن کہ ملکہ برنیس تیرے بغیر مر جائے گی۔ تیری سرد مہریاں اسے برباد کر ڈالیں گی۔

اگر تیرا یہ بے دردانہ رویہ جاری رہا تو مت بھول کہ ملکہ کے محل سرا میں حبشہ کے قوی ہیکل اور دیو آسا جوان بھی ہیں جن کی آغوش میں پہنچ کر ملکہ تیرے نرم و نازک جسم کو بھول جائے گی۔ بجا کہ ان گرانڈیل جوانوں کا شہوانی جوش و خروش ملکہ کے لیے ایک نیا تجربہ ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس تجربہ کے بعد ملکہ تیرے قابل بھی نہ رہے۔

کیونکہ تیرے ذہن لطف یار کی بجائے بلکہ کسی کو دوسرے کا ذہن کیف مرغوب ہو گا۔ پھر تو تیری جدائی بھی اس کے لیے وجہِ اضطراب نہ ہو گی ——اف! وہ دن نہایت منحوس ہو گا اور میں تو اس دن کے طلوع سے پہلے ہی تجھے دریا میں پھینکوا دوں گی عین ہی ان جواہرات کی طرح جو میں نے آج تجھے اپنے پاس نہ پا کر دریا بُرد کر دیے —— آہ! میں ملکۂ مصر ہوں نا اکبر!"

اس طویل اظہارِ آشفتگی کے بعد ملکہ دماطریس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ دماطریس بدستور گم سم تھا اور کوئی بات اس کے متاثر ہونے کا پتہ نہ دیتی تھی۔ ملکہ اس کی اس روح سوز بے حسی پر بھڑک اٹھی "کچھ سمجھے میری باتیں؟"

اس سوال پر وہ چونکا اور جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پھر نہایت اطمینان بخش لہجہ میں بولا "ملکہ! مجھے ابھی ابھی ایک حکایت یاد آئی ہے۔ لو سنو!"

ملکہ ہمہ تن گوش ہو گئی تو وہ ایک پیشہ ور داستان گو کی طرح کہنے لگا "ایک دفعہ کا ذکر ہے تھریس میں سوائے خونخوار درندوں اور چند وحشت زدہ انسانوں کے کوئی نہ رہتا تھا"

"تھریس میں؟"

"ہاں تھریس میں مگر اس سے بہت پہلے جب تمہارے آبا و اجداد نے اسے فتح کر کے اسے ایک نو آبادی قرار دیا، وہاں درندے اور چند انسان بستے تھے۔ یہ درندے اور حیوانات دیکھنے میں بہت خوبصورت تھے۔ مثلاً ببر تھے بھورے بالوں والے، شیر تھے شامی شیروں کی طرح دھاریدار، ریچھ تھے شب رنگ . . . ."

رہے انسان تو وہ سب کے سب پستہ قد تھے چپٹی ناک والے یہ انسان عموماً حیوانات کی کھال کے بوسیدہ لباس پہنتے تھے، سنگین غاروں میں رہتے تھے اور ان کی گذر اوقات شکار پر تھی چنانچہ جنگل میں خون ہی خون نظر آتا تھا ——"

"ایسے خون آشام ملک میں بھلا دیوتا کیسے رہ سکتے تھے؟ ایک ایک کر کے سب وہاں سے بھاگ گئے اور اسی طرح کئی سال بیت گئے اور اچانک ایک روز ایک آدمی جو وضع قطع سے کسی مہذب قوم کا فرد معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ کہستانی وحشیوں کا سا چرمی لباس پہنے ہوئے نہ تھا۔ وہاں آکر آباد ہو گیا۔ وہ بلا کا بربط نواز بھی تھا چنانچہ چاندنی راتوں میں جب وہ بربط کے تاروں کو چھیڑتا تو ایسی سحر انگیز موسیقی پیدا ہوتی جو نغمات جوئبار سے زیادہ شیریں اور بادِ نسیم کی سرسراہٹ سے زیادہ روح افزا ہوتی وہ بربط نوازی کیا کرتا۔ بیابان تھرتھر میں ایک جادو پھیلاتا۔ درندے اور پرندے مسحور ہونے لگتے خاص طور پر شیروں کو تو اس کی موسیقی اس قدر من بھاتی کہ وہ اس کے دوست بن گئے۔ آتے تو اپنے ساتھ طرح طرح کے لذیذ جنگلی پھل لاتے اور موسیقی کی فرمائش کرتے چنانچہ وہ بھی انہیں ہرگز مایوس نہ کرتا اور اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا حتیٰ کہ وہ اس یک رنگ زندگی سے بیزار ہو گیا اور اس کی موسیقی میں پہلے کا سا اثر باقی نہ رہا۔ آخر کار وہ نوبت بھی آگئی کہ جب اس نے بربط نوازی بالکل بند کر دی نتیجۃً تمام کا تمام جنگل اداس ہو گیا مگر اس سے مانوس حیوانات کی محبت میں فرق نہ آیا۔ وہ بدستور لذیذ پھل اس کے لیے لاتے رہے۔ حیوانی قلوب کا یہ خاصہ جو ٹھہرا کہ ایک بار مانوس ہو کر کبھی بے رُخی نہیں برتتے!"

"ایک دن وہ افسردہ روح بربط نواز اپنے دروازے پر کھڑا ساکن و ساکت درختوں کے عقب میں سورج کو غروب ہوتے دیکھ رہا تھا کہ ایک شیرنی وہاں آنکلی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں وہ نغمۂ بربط کی فرمائش نہ کر بیٹھے وہ نہایت بے رخی سے اپنی قیام گاہ میں گھس گیا۔ شیرنی نے بھی اس کی بے رخی کا جواب بے رخی سے دیا اور نہایت ناز سے وہاں سے گزر گئی —"

"بربط نواز شیرنی کی اس بے رخی پر بہت حیران ہوا اور بالآخر اسے آواز دینے

پر مجبور ہو گیا۔"

"شیرین واپس آ گئی تو وہ بولا "تم نے بربط نوازی کی فرمائش کیوں نہیں کی؟ جانتی ہو میں کون ہوں؟"

"تم عمار فیس!"

"کیا تجھے میری موسیقی پسند نہیں؟"

"نہیں!"

"اوہ! کتنی بدقسمتی ہے ایک میں ہوں کہ آج صرف تیرے لیے اپنے خاموش بربط کو چھیڑنا چاہتا ہوں اور ایک تو ہے کہ سراپا غرور، سراپا تکبر! ایسا معلوم ہوتا ہے تو مجھے خوب سمجھتی ہے۔ بہرکیف تو ذرا ٹھہر! میرے نغمات بربط سن! فقط ایک ساعت کے لیے پھر تو جو مانگے گی میں دوں گا!"

"یہ بات ہے؟" شیرین نے جواب دیا "مگر پہلے مجھے اپنا مطالبہ پیش کرنے دو!"

"ہاں، کہو!"

"میں چاہتی ہوں کہ تو میرے لیے شہر میں رہنے والے انسانوں کا تازہ گوشت لا۔ میں چاہتی ہوں کہ تو اس انسان کو میری خاطر اپنے ہاتھ سے قتل کر جو تجھے سب سے پہلے شہر کے راستہ پر ملے۔ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ تو ان تمام جانوروں کو میرے قدموں پر لا ڈالے جو تیرے دیوتاؤں کی خاطر قربانی کے لیے وقف ہیں۔"

شیرین کا مطالبہ سن کر بربط نواز نہ صرف یہ کہ خوش ہوا بلکہ اس نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس کے غیر معمولی مطالبہ کو ضرور پورا کرے گا۔ اس کے بعد وہ مکمل ایک گھنٹہ تک اس کو بربط سناتا رہا۔ جب وہ چلی گئی تو اس نے اپنی بربط توڑ ڈالی اور اس کے ساتھ ہی وہ خود زندہ درگور ہو گیا۔"

ملکہ نے ایک طویل آہ بھری اور پھر بولی "مجھے تمہاری تمثیلات خاک

سمجھ نہیں آ رہیں۔ مجھے تو صاف صاف لفظوں میں بتاؤ کہ اس داستان کے سنانے سے تمہارا اصل مقصد کیا ہے؟"

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے یہ داستان سنائی اس لیے نہیں کہ تم کچھ سمجھنے بھی لگو — میں نے فقط تمہارے برانگیختہ جذبات کو آسودہ کرنا چاہا تھا اور بس! مجھے کافی دیر ہو گئی۔ اب جاتا ہوں۔ الوداع، اے برنیس!"

اور وہ رونے لگی —

اسے ایک بچے کی طرح نرم اور گداز بستر پہ لٹا کر دماطریس نے اس پہ ایک نہایت حزن و ملال میں ڈوبی ہوئی نظر ڈالی اور پھر نہایت ہمدردانہ انداز میں اس کی اشکبار آنکھوں کو چوم لیا۔

اس سے پیشتر کہ وہ اس کے اِس مختصر مگر محبت آمیز سلوک کا شکریہ ادا کرتی وہ رواں رواں پالکی کا پردہ اٹھا کر باہر کود چکا تھا۔

آمد آمد

بختیشہ بتیس سال سے متواتر قورطیزہ چلی آرہی تھی۔ مختلف اندازوں کے مطابق وہ اب چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس عرصہ عمر میں اس کے کردار جمال نے متعدد رنگ بدلے تھے۔ کئی سال سے اس کی والدہ اس کے گھر کی منتظم و مہتمم تھی۔ تمام معاملات میں اسی کے مشوروں پر عمل ہوتا تھا۔ اس نے اپنی نامور بیٹی بختیشہ کو انصرام و کفایت کے ایسے گر سکھا رکھے تھے جن کی مدد سے وہ کافی دولت جمع کر چکی تھی۔ اب جب کہ اس کا حسن و جمال انحطاط پذیر تھا اور اس کے بستر عیش کی دلچسپیاں عنقا ہوئی جا رہی تھیں وہ اپنے دل کی حسرتیں اپنی دولت کے آزادانہ تصرف سے پوری کرتی۔ مگر اس کا انداز تصرف کبھی دور اندیشی سے مبرا نہ ہوتا۔

مثلاً دوسری قورطیزاؤں کے برعکس جنہوں نے نیلام گاہ سے لونڈیاں اور غلام خرید خرید کر اپنے آپ کو اقتصادی طور پر تباہ و برباد کر لیا تھا۔ بختیشہ گذشتہ دس سال سے صرف ایک حبشن پر اکتفا کیے ہوئے تھی مستقبل پہ نظریں جمائے وہ اس سیاہ فام کنیز سے ہر سال ایک بچہ جنواتی اور اس طرح آہستہ آہستہ اس کے پاس بڑھتے بڑھتے ایک بہت بڑا عملہ ہو گیا۔ یہی عملہ مستقبل میں اسے مزید دولت پیدا کر کے دینے والا تھا۔ "والد" کے انتخاب سے متعلق بختیشہ کی حد درجہ احتیاط کے نتیجہ میں حبشی کنیز اب تک سات نہایت حسین و جمیل لڑکیاں پیدا کر چکی تھی ان بچیوں کے علاوہ اس سے تین لڑکے بھی پیدا ہو چکے تھے۔ جنہیں بختیشہ نے پیدا ہوتے ہی مروا ڈالا کیونکہ عورتوں والے گھر میں مرد ملازمین کی موجودگی عشاق کے دل میں خواہ مخواہ دبا جذباتِ رقابت پیدا کر دینے کا موجب بنتی تھی ان سات حبشی نژاد بیٹیوں کو اس نے

سات ستاروں کے نام دے رکھے تھے اور ان ناموں کو ان سب کی انفرادی صفاتِ و عادات سے مناسبت تھی۔ مثلاً

—— جیلوتپ دن کے وقت خدمت بجا لاتی تھی۔

—— بیلائی رات کو کام کرتی تھی۔

—— ایفرودسیہ اپنی مالکہ کا بستر کیا کرتی تھی۔

—— حرمیون لین دین کے معاملات طے کرتی تھی اور رقص و نغمہ باورچن تھی۔

—— دمیدہ امورِ خانہ داری مثلاً حساب کتاب سنبھالے ہوئی تھی اور ارتیاث فرائض دربانی پہ مامور تھی۔

ان سب میں سب سے زیادہ حسین ایفرودسیہ تھی اور اس وجہ سے وہ بخیث کی چہیتی کنیز تھی اکثر بخیث کے چاہنے والوں کا دل اس پہ آجاتا تو وہ ان کا دل لبھانے سے گریز نہ کرتی بخیث کے فرمان کے مطابق ایفرودسیہ کو ہر طرح کی غلامانہ مشقت معاف تھی تاکہ اس کی بانہوں کی نزاکت اور ہاتھوں کی ملائمت محفوظ رہے۔ بخیث کی خاص عنایت کے طفیل اسے برہنہ سر پھرنے کی بھی اجازت تھی چنانچہ اس کو اس طرح ننگے سر گھومتے دیکھ کر دوسرے خواہ مخواہ اسے ایک آزاد عورت سمجھ لیتے حالانکہ دراصل وہ آج رات آزاد کی جارہی تھی اور اس آزادی کی قیمت ۳۵ میناسیاں قرار پائی تھی جو جیرنیامی ایک جہاز ساز ادا کر رہا تھا۔

اپنی ان سات تربیت یافتہ اور کشیدہ قامت کنیزوں پہ بخیث اس قدر نازاں تھی کہ وہ کبھی ان کے بغیر باہر نہ جاتی خواہ پیچھے گھر سونا ہی کیوں نہ رہ جائے دماطریس نے بخیث کی اس کوتاہ اندیشی اور حماقت سے فائدہ اٹھایا تھا یہ اور بات تھی کہ بخیث کو اپنی اس بدبختی کا ابھی تک علم نہ ہوا تھا ضیافت جشن جس میں کہ اُسے بھی مدعو تھی، کے گوناں گوں کاموں میں وہ بے حد مشغول و منہمک تھی۔

اس کے یہاں سب سے پہلے کرائسس پہنچی۔ وہ آج سبز رنگ کا ایک ایسا لبادہ زیب تن کئے ہوئے تھی جس پر سینے کی جگہ شگفتہ پھول کڑھے ہوئے تھے قبل اس کے کہ وہ دروازہ پر دستک دیتی کنیز ارتیاآث نے دروازہ کھول دیا۔ یونانی رواج کے مطابق وہ کرائسس کو ایک ملحقہ کمرے میں لے گئی جہاں پر سب سے پہلے اس نے کرائسس کے سرخ پاپوش اتارے اور پھر پیروں کو سہلانے کے بعد آہستہ آہستہ دھویا۔ اس کے بعد اس نے لبادہ کو ادھر ادھر سرکا کر بدن پر جگہ جگہ عطر لگایا کیونکہ عام رواج کے مطابق مدعوئین کو ضیافت گاہ میں جانے سے قبل بناؤ سنگار کے معاملہ میں ہر طرح کی سہولت دی جاتی تھی چنانچہ ارتیاث نے کرائسس کو جہاں بال سنوارنے کے لیے شانہ اور پنیں دیں وہاں لبوں اور رخساروں کے لیے خشک اور نم آلود حسن افزا مرکبات بھی دیئے۔

بناؤ سنگار سے فارغ ہو کر کرائسس نے پوچھا "سائے کہاں ہیں؟"

سایوں سے مراد عموماً مہمانِ اعلیٰ کے سوا تمام دوسرے مدعوئین ضیافت ہوتی تھی مہمان جس کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا اپنے ساتھ کسی بھی دوسرے مرد یا عورت کو لا سکتا تھا جب کہ دوسروں کے لیے اپنے ساتھ صرف گدگدے تکیے لانا ضروری ہوتا۔ دوران ضیافت انتہائی شائستگی بھی ان پر واجب ہوتی تھی۔

ارتیاآث مودب ہو کر بولی "حضرت نقراط نے فلدماس اور اس کی اطالوی محبوبہ فسطینہ کو بلایا ہے۔ انھوں نے طائسن اور فراسیلاس اور آپ کی دوست سیسو سائیڈس والی کو بھی مدعو کیا ہے۔"

اسی اثنا میں سیسو کی آواز آئی "بد کرائسس!"

"پیاری سیسو!"

اور دونوں آپس میں بغل گیر ہو کر ایک دوسرے کو چومنے لگیں۔ ملاقات کے اس دلپذیر حسنِ اتفاق پر دونوں خوشی میں جھومنے لگیں۔

"مجھے ڈر تھا کہیں دیر نہ ہو جائے!" سیسو بولی "کم بخت عزختاش مجھے روکے رہا۔"
"کیا کہا؟ عزختاش اب بھی!"
"ہاں، وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ جب بھی میں کسی دعوت پر جاتی وہ سمجھ لیتا ہے ہر مہمان مجھ سے محظوظ ہو گا۔ چنانچہ وہ جوش حسد میں پیشگی انتقام پر اتر آتا ہے اور بیکار اپنا اور میرا وقت ضائع کرتا ہے۔ کاش! وہ مجھے سمجھ سکتا۔ اسے کیا معلوم کہ سیسو اپنے پرستارانِ حسن کو دھوکا نہیں دیتی؟ اسے کیا معلوم کہ میں آئے دن عشاق نہیں بدلا کرتی ـــ۔"
"بچے کا کیا ہوا؟ کوئی آثار تو نظر نہیں آتا۔"
"نہ ہی نظر آئے تو اچھا ہے۔ مگر ابھی تو تیسرا ہی مہینہ ہے۔ آج کل وہ چمگادڑ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ مجھے ابھی ستانا شروع نہیں کیا۔ ذرا پانچ چھ ہفتے ٹھہر جاؤ! اس کے بعد میں ناچنا شروع کروں گی اور اس موئے پاجی کا قافیہ تنگ کر کے رکھ دوں گی۔ خواہ مخواہ دُنیا میں آنے پر مجبور ہو جائے گا۔"
"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو سیسو!" کریسس نے ہاں میں ہاں ملائی "اپنے جسم کو ہرگز خراب نہ ہونے دینا چاہیے۔ ابھی کل ہی میری ملاقات تلمیتش سے ہوئی۔ تم تو اسے جانتی ہی ہو گی؟ وہی جو گذشتہ تین سال سے بباسطس کے ایک سوداگر اجناس کے پاس ہے۔ جانتی ہو ملتے ہی پہلی بات اس نے کیا کی؟ ـــ کریسس! ذرا میری چھاتیاں تو دیکھنا! کاش تجھے میری چھاتیوں کی حالت معلوم ہوتی! ـــ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعی اپنی چھاتیاں مجھے دکھانے پر مصر ہے۔ چنانچہ میں نے وہ دیکھیں۔ جانِ من کچھ نہ پوچھو! چھاتیاں کیا تھیں تھیلے تھے تھیلے! تم تو جانتی ہی ہو اس کا سینہ کس قدر حسین و دلکش تھا۔ سیسو! اب تم اپنی خیر مناؤ۔ یاد رکھو! ایک نوخیز کا سینہ اس کے ہار سے زیادہ قیمتی شے ہے۔"
وہ باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے بناؤ سنگار میں بھی مشغول تھیں، بن سنور چکیں

تو وہ ضیافت گاہ میں داخل ہوئیں۔ جہاں بخیتیؔ ان کی منتظر کھڑی تھی۔ وہ آج ایک ایسا سینہ بند لبادہ پہنے ہوئی تھی جس کا زرکار کالر اس کی ٹھوڑی کو مَس کر رہا تھا۔

"اے محبانِ دل نواز! آفرین نقراطؔ پر جو آج شام تم دونوں سہیلیوں کو یک جا کرنے میں کامیاب ہوا!"

"ہم بے حد خوش ہیں کہ ہمارے اس ملاپ کے لیے اس نے تمہارا دولت کدہ منتخب لیا،" کرِائسسؔ نے جواب دیا اور کچھ دیر خاموش رہ کر نہایت طنز آمیز انداز میں بولی: "کہو، ڈُرا کلیسؔ کیسا ہے؟"

ڈُرا کلیسؔ بخیتؔ کا ایک متمول نوجوان عاشق تھا جو بالآخر اسے دغا دے کر ایک حسینۂ سسلی سے لو لگا بیٹھا تھا۔

"میں۔۔۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا،" بخیتؔ نے نہایت بیباکی سے کہا۔

"واقعی؟"

"ہاں بھئی، واقعی۔ میں نے سنا ہے آج کل وہ محض انتقاماً اپنی شادی کی فکر میں ہے۔ لیکن یاد رکھو شادی کے بعد وہ پھر میری طرف رُخ کرے گا۔ وہ میرا دیوانہ ہے!"

اگرچہ کرِائسسؔ نے سوال تو یہ پوچھا تھا کہ اس عاشق ڈرا کلیس کیسا ہے مگر دراصل وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ کہو، تمہارا آئینہ کہاں ہے؟ — وہ تو خیر ہوئی جو بخیتؔ کی آنکھ سے اس کی آنکھ نہ ملی ورنہ اس کی آنکھوں کی بے پناہ کیفیت اضطراب دیکھ کر بخیتؔ کو خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ ہو جاتا۔ بہر کیف ظاہر تھا کہ کرِائسسؔ کو اپنے سوال کا صحیح جواب پانے میں ابھی دیر تھی۔ چنانچہ وہ دل ہی دل میں نہایت بے صبری سے کسی موزوں تر لمحہ کا انتظار کرنے لگی۔

وہ پھر کوئی بات کرنے ہی والی تھی کہ اتنے میں فلدؔماس، فسطینہؔ اور نقراطؔ نمودار ہوئے اور بخیتؔ ان کی پذیرائی کے لیے آگے کو بڑھی۔ شاعر فلدؔماس کو اس کی مرصع قبا پر

سب نے جھوم جھوم کر داد دی اور اس کی رومن معشوقہ کو اس کی مہین عبا پر ! اسکندریہ کے آدابِ مجلس سے بے خبر اس رومن حسینہ نے مہین عبا زیب تن کر کے اپنے آپ کو خواتینِ ہیلنا کی ہم رتبہ ثابت کرنا چاہا تھا مگر اسے کیا معلوم کہ ضیافتوں کے موقع پر ایسا لباس پہن کر آنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر نیم عریاں لباس فقط پیشہ ور رقاصاؤں کے لیے مخصوص تھا۔ بہرکیف بخیتث نے اس فحش غلطی پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ ایک عالی ظرف خاتون کی طرح اس سے کمال شفقت کے ساتھ پیش آئی اور بہت دیر تک اس کے سیاہ بالوں کی تعریف میں رطب اللسان رہی۔

وہ سب مل کر بیٹھے ہی لگے تھے کہ اتنے میں ساتویں مہمان بھی تشریف لے آئے وہ تھا طائمن، نوجوان کھلنڈرا جس کے قول اور فعل میں نظم و ضبط کا فقدان ہی قدرت کا عطیہ خیال کیا جاتا تھا۔ فلسفیوں کے اقوال زریں میں اپنی روز افزوں عیش طلبیوں کے لیے جواز ڈھونڈ لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔

”میں کسی کو اپنے ساتھ لایا ہوں“ وہ ہنستا ہوا بولا۔

”کون ہے وہ ؟“ بخیتث نے پوچھا۔

”وہ ہے دیموٹ منداس والی“

”دیموا ! تو — تو دیمو کو ساتھ لایا ہے ؟ اس ۔ ۔ ۔ اس بازاری چھوکری کو ! ۔ ۔ ۔ وہ جو ایک انجیر کے عوض دوسرے کی ہو جاتی ہے تو اسے ساتھ لایا ہے میرے یہاں !“

”درست ہے ! آپ بجا فرماتی ہیں ! ۔ ۔ ۔ اب بھول جائیے میری اس حماقت کو ! وہ تو محض اتفاق سے راستہ میں مل گئی۔ بے چاری نے ایک وقت کا کھانا مانگا تھا میں نے کہا چلو، ساتھ لیے چلتا ہوں، بخیتث کے ہاں کھانے کی کیا کمی۔ لیکن اگر وہ جناب کو پسند نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں“

”طائمن ! تو بالکل ہی ایک ناقابلِ فہم ہستی ہے !“ بخیتث چلائی۔

اور اس نے جیلوپ کو بلا کر کہا: "ذرا اپنی بہن سے جا کر کہو کہ دروازے پہ جو چھوکری کھڑی ہے وہ اسے مار کر بھگا دے۔ جاؤ!"

یہ کہہ کر اس نے رُخ موڑا اور سب پہ ایک نظر ڈالی۔

"فراسیلاس نہیں آیا کیا؟" اس نے پوچھا۔

وہ اپنا سوال بمشکل تمام کر پائی تھی کہ ایک پستہ قد، بدشکل انسان جس کی پیشانی آنکھیں اور داڑھی سب کی سب بھوری تھیں مسکراتا ہوا بولا: "جناب! بندہ حاضر ہے۔"

ضیافت

فراسیلاؔس اپنے وقت کا ایک نامور قلم کار مانا جاتا تھا۔ اگرچہ کوئی بھی وثوق کے ساتھ یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ آیا وہ حقیقی معنوں میں ایک فلسفہ دان ہے یا عالمِ صرف ونحو، مورخ یا ماہر علم الاصنام! کیونکہ مختلف مضامین کے مطالعہ میں اس کا ذوق وشوق وسیع ہونے کے باوجود دبیہ پا ثابت نہ ہوتا تھا۔ اسے کبھی کوئی رسالہ لکھنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ وہ آج تک کوئی ڈرامہ بھی نہ لکھ پایا تھا۔ اس کے اسلوبِ نگارش پر تکلفِ بیجا، ریا اور ابہام کا رنگ غالب معلوم ہوتا تھا۔ مفکروں کے نزدیک وہ ایک شاعر تھا۔ شاعر لوگ اسے ایک تارک الدنیا سمجھتے تھے اور سماج اسے ایک عظیم ہستی قرار دیتا تھا۔

"تو آیئے! ہم لوگ اب بیٹھ جائیں!" بخیثؔ بولی اور اس کے بعد وہ اپنے عاشق نقراؔط کے پہلو میں ضیافت کی میز کے سرے پر ایک تکیہ کا سہارا لیکر بیٹھ گئی۔ اس کی دائیں جانب فلدماؔس، فسطینہؔ اور فراسیلاؔس بیٹھ گئے اور بائیں طرف نقراؔط اور سیسیوؔ، کرؔاسس اور طائمن جلوہ افروز ہو گئے۔ ہر مہماں ریشمیں تکیئے کے سہارے ترچھے انداز میں دراز تھا۔ سب کے سروں پر پھولوں کے ہار لپٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک خادمہ سرخ گلاب اور نیل کنول گلدستے لے آئی۔ گویا دورِ ضیافت شروع ہو گیا تھا۔

طائمن محسوس کر رہا تھا کہ اس کی شوخی کے باعث سب خواتین اس سے خائف ہیں یہی وجہ تھی کہ اسے ان میں سے کسی کو مخاطب کرنے کی جرات نہ ہوئی مگر چونکہ وہ محفل کی بذلہ سنجیوں میں برابر کا شریک ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ سب سے پہلے بہت پر متانت لہجہ میں فلدماؔس سے مخاطب ہوا۔ "سنا ہے آپ اِستروؔ کے نہایت گہرے دوست ہیں اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فلدِماؔس صاحب! کیا وہ فی الواقعہ ایک دانائے

راز فلسفی ہے یا محض ایک بے ذوق و بے بصیرت مؤلف! میں نے اس کے بارے میں دونوں قسم کی رائیں سنی ہیں؟"

"سچ تو یہ ہے کہ میں چونکہ سِتسرو کا دوست ہوں، اس لیے آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا؟" فلدماس نے کہا۔ "میں یہاں اس کی خوبیوں سے واقف ہوں وہاں اس کے نقائص بھی جانتا ہوں۔ بہتر ہوگا آپ یہ سوال فراسیلاس سے کریں جس نے سِتسرو کو بہت کم پڑھا ہے اور اس وجہ سے اس کا فیصلہ بے عیب ہوگا۔"

"فراسیلاس! کیا خیال ہے تمہارا؟"

"وہ ایک قابلِ ستائش مصنف ہے۔" پستہ قد آدمی نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟"

"طائمن! ایک مصنف کسی نہ کسی وجہ سے اسی طرح قابلِ ستائش ہوتا ہے جس طرح تمام مناظرِ ارض اور تمام ارواحِ آدم! میرے نزدیک ایک نہایت یک رنگ منظرِ دشت اور منظرِ بحر میں امتیاز کرنا محال ہے یہ تو خیر بہت دور کی بات رہی، میں تو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ مقالۂ سِسرو، نظمِ پندآر اور مکتوبِ کراٹسس میں سے بلحاظِ ادبی اہمیت میں کس کو ترجیح دوں گا مجھے لاکھ علم سہی کہ ہماری حسین و جمیل دوست محترمہ کراٹسس کا اسلوبِ نگارش نہایت قابلِ داد ہے.... کتاب بند کر دینے کے بعد میرے لیے تو صرف وہ ایک سطر حاصلِ کتاب ہوتی ہے جو مجھے مائل بہ فکر کر دے۔ چنانچہ آج تک میں نے جتنی کتابیں پڑھی ہیں وہ مخصوص فکر انگیز سطر مجھے ہر ایک میں سے مل گئی یہ اور بات ہے کہ ویسی دوسری سطر کسی کتاب میں تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہ ملی۔ شاید اس کا سبب یہ حقیقت ہو کہ ہر انسان زندگی میں صرف ایک بات ہی بطریقِ احسن کہہ سکتا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش میں بہت باتیں کہنا چاہیں جلد یا بدیر انتہا پسند طالبانِ جاہ کہلائے مگر صد افسوس ان لاکھوں روحوں پہ جو تمام زندگی وقفِ سکوت رہ کر گذر جاتی ہیں!"

"میں متفق نہیں ہوں!" انقراطے نظریں زمین پر گاڑتے ہوئے کہا۔ "دراصل تخلیق کائنات کا مقصد تین بڑی صداقتوں کا اظہار تھا۔ اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان تینوں صداقتوں پر پانچ صدی پہلے ہی مہر تصدیق ثبت ہو چکی ہے۔ حرقلیطس نے دنیا کو سمجھا۔ فرمانتیدس نے روح کو بے نقاب کیا۔ فیثا غورث نے خدا کو پایا۔ ہمارے لیے تو اب خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ کتنا اچھا ہو اگر ہماری زندگیاں عیش و عشرت میں بسر ہو سکیں!"

اس پر سیتسو چونکی اور بادکش کے دستہ سے میز کو بے تحاشہ ضربیں لگانے کے بعد بولی "طائمن، میرے دوست!"

"ارشاد؟"

"میں کہتی ہوں تم ایسے مسائل کیوں چھیڑ رہے ہو جو نہ مجھ ایسی نابلد لاطینی کو سمجھ آ رہے ہیں اور تمہیں جو اپنی لاطینی دانی کو عمداً فراموش کرنے کی فکر میں ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اپنے تبحر لاطینی سے قسطینہ کو مرعوب کر لو گے؟ جان من! کم از کم تمہاری لفاظیت مجھے تو بالکل متاثر نہیں کر رہی۔ تم وہی تو ہو جو گذشتہ شب میرے خلوت کدہ میں تھے۔ تمہاری اصلیت سے میں خوب واقف ہوں۔"

"کیا واقعی؟" نوجوان نے سرسری طور پہ پوچھا۔

اسی دوران میں حضرت نراسیلاس اپنی ایک دوسری شاعری نہایت شیریں مگر طنزیہ انداز میں شروع کر چکے تھے۔

"اے سیتسو، غور سے سن! اس سے پہلے کہ طائمن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار تو ہم سب کے سامنے کرے قطع نظر اس سے کہ تو طائمن کی تعریف کرے جس کا کہ وہ مستحق ہے یا اسے ہدف ملامت بنائے جس کی ہمیں تجھ سے توقع نہیں، ایک بات بالکل نہ بھولنا کہ طائمن .... ایک سربستہ راز ہستی ہے اور اس کی فطرت کا ادراک ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں .... جانے طائمن کا وجود معنوی کیا بلا ہے کہ دوسروں کی روحیں

اس میں فوراً جذب ہو جاتی ہیں۔ اس کے وجودِ ظاہری کا ہر تغیران منجذب روحوں سے ماخوذ ہوتا ہے۔۔۔۔ گزشتہ رات تیری روح کی آئینہ دار طائمن کی روح تھی۔ میں حیران ہوں وہ روح تجھے کیوں پسند نہ آئی؟ ایک لمحہ بیشتر اس کی روح فلدماس کی روح کا عکس تھی اور غالباً اسی وجہ سے تجھے اصرار تھا کہ وہ روح خود اپنی نفی کر رہی ہے۔ لیکن یاد رکھ کہ روحِ طائمن نہ اپنی تردید پر قادر ہے اور نہ اپنی تصدیق پر مُصرا۔۔۔ تو میری جان، انسان کو دوسروں کے متعلق اظہارِ رائے میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہیئے۔"

طائمن نے فراسیلاس پر ایک خشمگیں نظر ڈالی مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو!" سیتسو نے جواب دیا، "مگر تم یہ بھول گئے کہ محفل میں پیار تو رطبینہ ایسی بھی بیٹھی ہیں۔ کم از کم ہم سے تو پوچھا ہوتا کہ آج کون سا موضوعِ سخن ہم سب کے لیے باعثِ دلچسپی ہو گا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے نزدیک ہم میں اور شیر خوار بچوں میں کوئی فرق نہیں۔ فسطبینہ! تم نووارد محفل ہو۔ حسبِ منشا آغازِ سخن کرو!"

"خوب!" انقراط بولا۔ "ہاں! فسطبینہ تم بتاؤ، آج کا موضوعِ سخن کیا ہونا چاہیئے؟"

جوان و رعنا رومن دوشیزہ نے رُخ موڑا، پلکیں سکیڑیں، قدرے شرمائی اور پھر ایک طویل آہ کشی کے انداز میں اپنے اندامِ نازک کو ناگن کی طرح بل دیتے ہوئے بولی۔ "عشق!"

"واللہ! بڑا دلکش موضوعِ سخن ہے!" سیتسو زیرِ لب مسکرا کر بولی۔

لیکن حیرت ہوئی جب کسی نے آغازِ سخن نہ کیا۔

ضیافت کی میز پر ہار اور پھول، جام اور صراحیاں جگہ جگہ چُنی ہوئی تھیں۔ اس دوران میں خادمائیں برف ایسی ہلکی پھلکی روٹیاں ٹوکریوں میں لا چکی تھیں۔ ساتھ ہی منقش طشتریوں اور رکابیوں میں قسم قسم کی مچھلیاں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ انہیں مچھلیوں میں ارغوانی

رنگ کی پمپلاس مچھلیاں تھیں جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ ربۃ الفرودت کی طرح کف بحر سے پیدا ہوتی ہیں، پمپلاسوں کے علاوہ جانے اور کتنی قسم کی لذیذ مچھلیاں مثلاً بوپو، برادٹون ملاط، قامر اور عقربی شامل تھیں۔ ان میں سے چند مچھلیاں جو باعتبار شکل عورت کے شکم کی طرح گول اور دلفریب تھیں فرائی پینوں میں پیش کی گئیں تاکہ انہیں گرم گرم ہی کھایا جا سکے۔

تو یہ تھا ضیافت کا پہلا دور۔ مہمانوں نے ہر مچھلی کا ایک ایک لقمہ لیا اور بقیہ کنیزوں کے لیے چھوڑ دیا۔

"عشق!" فراسیلاس کہنے لگا "ایک ایسا لفظ ہے جس کا یا تو کچھ بھی مطلب نہیں یا اتنا گہرا ہے کہ ہم سمجھ نہیں سکتے۔ میرے خیال میں عشق دو نا قابل مفاہمت جذبوں یعنی۔ تسکین نفس اور ہوسِ نشاط ۔۔۔ سے ماخوذ ہے۔ جانے قسطینہ کی مراد کس جذبہ سے ہے؟"

"جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے تو غرض تسکین نفس سے ہے کیونکہ ہوس نشاط کو میں اپنے دیوانوں کے لیے وقف سمجھتی ہوں" کرائسس نے کہا اور پھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولی "بہر کیف جناب کو دونوں جذبوں پر بحث کرنا ہوگی ورنہ کم از کم مجھے تو خاک لطف نہ آئے گا۔"

"عشق" خلدماس نے کہا "نہ تو تسکین نفس ہے اور نہ ہوس نشاط۔ عشق تو، میرے خیال میں، بالکل ہی ایک مختلف شے ہے۔"

رحم کرو، خدارا رحم کرو! طامئن چھنا کر بولا "ایک بار تو زندگی میں ہمیں اپنے فلسفہ کے بغیر ضیافت کا مزہ لینے دو! فراسیلاس! ہر کوئی جانتا ہے کہ تم نہایت دل نشیں، دلگداز، شہد آمیز اور فصیحانہ انداز میں نشاط گوناں گوں کی عظمت بمقابلہ ہوس ثابت کر سکتے ہو۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایک گھنٹہ اسی موقف پر مضبوطی سے ڈٹے رہنے کے بعد تم ایک

دم ایسا پلٹا کھا سکتے ہو کہ خدا کی پناہ! یقیناً تم میں صلاحیت ہے کہ رخ بدلنے کے بعد تم پھر اپنے سابقہ مخالفین کی حمایت میں بھی فصاحت و بلاغت کے دریا بہا سکتے ہو۔ اس سے مجھے انکار نہیں کہ....."

"اجازت ہو تو کچھ عرض کروں!" فراسیلاس نے بات کاٹنا چاہی مگر طائس نہ رکا اور کہتا گیا "مجھے اس سے انکار نہیں کہ جو کھیل ہم شروع کر بیٹھے ہیں خاصہ سحر انگیز ہے اور پھر تمہاری نکتہ سنجی نے تو اسے اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں مگر مجھے شبہ ہے کہ ہماری دلچسپی اس دقیق موضوع میں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ بر سبیل تذکرہ آج کی اس مجلس جمیلہ میں تمہاری مطبوعہ تصنیف 'ضیافت' مجھے بار بار یاد آ رہی ہے۔ "ضیافت" میں تمہارا انداز نگارش فن داستان سرائی کے نقطہ نظر سے حد درجہ لطیف اور دلچسپ ہے مگر اس کی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مثلاً داستان کے ہیرو میں جو خوبیاں اور صفات جمیلہ تم نے دکھائی ہیں وہ اس لحاظ سے تو قابل قدر ہیں کہ وہ شخص تمہارے نقطہ نظر سے ایک انسان کامل تھا۔ مگر تم نے یہ حقیقت فراموش کر دی کہ اس انسان کا تعلق بطلیموس علیطر کے عہد سے تھا اور وہ عہد انسانوں میں تمہارے ہیرو کی سی خوبیوں کے فقدان کے لیے بدنام تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ تم یہ بھی بھول گئے کہ ہم تین سال سے نوجوان ملکہ برنیس کی رعایا ہیں — جانے کس قلب ماہیت کے باعث تمہارا نظام فکر جو کبھی ایک گہرہ دبار مستقل مزاج اور نگارشات فلسفہ پر حاوی مفسر کا نظام فکر تھا تمہارے قلم کے زیر اثر چست آستین اور زرد بالوں کے رواج کی طرح ایک عہدی پرانا اور بوسیدہ معلوم ہونے لگا ہے۔ اے لائق استاد! مجھے افسوس ہے باوجودیکہ تمہارے قصے زیادہ دلچسپ نہیں ہوتے اور یہ کہ فطرت نسواں سے متعلق تمہارا تجربہ بھی بالکل صفر کے برابر ہے مگر صد شکر کہ قدرت نے تمہیں ایک پر مذاق روح سے سرافراز کیا ہے۔ میں ممنوں ہوں کہ تیری بدولت مجھے آج ہنسنا نصیب ہوا۔"

" طائمن "! بخیتئ ! خشمگیں ہو کر بولی مگر فراسیلاآس نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

چھوڑو! پیاری بخیتئ! دوسرے مردوں کے برعکس میں تو اپنے متعلق دوسروں کی رائے کا فقط وہ حصہ قابلِ غور سمجھتا ہوں جو میری تعریف میں ہو۔ طائمن نے بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ رہی میری مدح سرائی تو اس کے لیے انسانوں کی کمی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی زندگی سے بھی تو بہ جو سراسر مدح و ستائش کا گہوارہ ہو۔ میں تو عمداً دوسروں کے دلوں میں اپنے متعلق متضاد خیالات پیدا کرتا ہوں کیونکہ یہی متضاد خیالات میرے نزدیک ایک ایسا گلستان ہیں جس میں میرے مطلب کی چیز فقط پھول اور ان کی خوشبو ہے کانٹے نہیں!"

یہ شاعرانہ خیال سنتے ہی جانے کرئسس کو کیوں غصہ آگیا اور وہ فراسیلاآس کو ایک حد درجہ قابلِ نفرین آدمی خیال کرنے لگی۔ ممکن ہے اس غم و غصہ کا سبب یہ ہو کہ فراسیلاآس نے ایک دلچسپ بحث کو ایک دم سمیٹ دیا تھا۔ بہرکیف کرئسس نے طائمن کی طرف دیکھا جو اس کے پہلو میں دراز تھا اور اس کے کندھے تھپک کر بولی "حیاتِ انسانی کا مقصد کیا ہے؟"

یہ وہ مخصوص سوال تھا جو وہ ہر اس فلسفی سے پوچھتی تھی جس کے روبرو وہ زیادہ باتیں نہ بنا سکتی تھی لیکن اب جو اس نے وہی سوال طائمن سے کیا تو اس کی آواز میں ایک ایسی دلگداز نزاکت تھی کہ طائمن نے اسے یک گونہ اعلانِ محبت پر محمول کیا۔ تاہم وہ نہایت اطمینان سے بولا "کرئسس، رفیقۂ من! ہر زندگی کا اپنا علیحدہ مقصد ہوتا ہے۔ کوئی بھی تو ایسی ہمہ گیر منزل نہیں جس کی طرف تمام زندگیاں دوش بدوش گامزن ہو سکیں۔ مثلاً میں ایک ایسے بینکر کا فرزند ہوں جس کا حلقۂ اثر مصر کی تمام عظیم قورطینزاؤں پر مشتمل ہے طرح طرح کے حیلے بہانوں سے میرے باپ نے بے اندازہ دولت جمع کی۔ میں وہی دولت اپنے والد کی طلبِ منفعت کے شکاروں کو واپس لوٹا رہا ہوں۔ ان کے ساتھ مِل ہو کر اور اس معاملہ میں ہتی دیوتاؤں کی عطا کردہ اپنی تمام قوتوں کے بروئے کار لا رہا

ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری قوتِ حیات کا واحد مقصد حصول عیش ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس مقصد کا انتخاب میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ بے شک میرا یہ طریق زندگی جو پاک دامانی کے نادر تقاضوں اور متناقص آسودگیوں کے درمیان واحد قدرِ مشترک ہے کسی مختلف مقصدِ حیات کی تکمیل کا کفیل نہیں ہو سکتا۔

اس دوران میں جب کہ وہ محوِ گفتگو تھا طائمن نے اپنی بائیں ٹانگ پہلو کے بل دراز کر آتسس کی پشت سے ملا دی اور پھر کوشش کی کہ اس کے باہم پیوستہ زانوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کر دے گویا اُس طرح وہ اس شام اپنے وجودِ ہستی کو ایک جامع مقصد سے ہمکنار کر رہا تھا۔ کرآتسس نے اس کی اس حرکت پہ بُرا نہ منایا۔

کچھ دیر محفل پہ سکوت طاری رہا حتیٰ کہ سیتسو نے لب کشائی کی "طائمن! تجھے دیوتا سمجھیں، یہ کیا لغو حرکت ہے کہ تو نے ایک دلچسپ موضوع پہ بات چلائی تھی اور پھر فوراً بند بھی کر دی۔ اگر تم آج بدذوقی کے بھونڈے مظاہرے پہ تلے بیٹھے ہو تو ایک طرف ہٹو اور نقراط کو طبع آزمائی کا موقع دو!"

"بندہ موضوعِ عشق پر کیا عرض کر سکتا ہے؟" معزز مہمان نے کہا۔ "عشق نام ہے اس درد کا جو ایک مبتلائے درد کو آشنائے سکون کرتا ہے۔ آشنائے غم ہونے کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ آدمی اس شے کی تمنا کرے جو اسے میسر نہیں ایک وہ کہ آدمی اس شے کو پائے جسکی اُسے تمنا تھی۔ عشق پہلے طریق سے پیدا ہوتا ہے اور جب دوسرے پہ ختم ہوتا ہے تو ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اسے اگر آپ لوگ چاہیں تو کامیاب عشق کا نام دے لیں! بہر کیف! معبودانِ ارض ہم سب کو خبطِ عشق سے محفوظ رکھیں!"

"فرض کرو اگر یہ غیر متوقع طور پہ میسر آجائے تو کیا یہ حقیقی مسرت کا باعث نہ ہوگا؟" غلدماس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا کہنے اس نادرِ عشق کے!" کوئی بولا

"آپ غلط سمجھے!" فرانسسکا اس نے کہنا شروع کیا "سقراط صاحب، آپ غور سے سُنیں! یہ ایک نہایت باریک مسئلہ ہے بجا کہ تمنائے عشق معیوب ہے مگر کیوں نہ انسان زندگی کو ایک ایسی ڈگر پر چلائے کہ جہاں عشق کے حسین اتفاقات اس کے قدم چومیں چلیے کسی کے عشق میں دیوانہ ہو جانا بُرا ہے مگر دور ہی دور سے حسینانِ جہاں کو دیکھ کر اس احساسِ لطیف سے سرشار ہونے کو کیا کہیئے کہ انہیں پا لیا تو نظارے کا سحر ایک دم ختم ہو جائے گا! ایک عورت سے وہ تمام خوبیاں منسوب کرنا جنھیں تم اس میں دیکھنے کے متمنی ہو سراسر حماقت ہے اور ان خوبیوں پر ایمان لے آنا جن کی وہ دعویدار ہے اور بھی بڑی حماقت۔

..... اس لیے میرے نزدیک ہر مائل محبت عورت کو بالکل بے کشش اور بے کیف سمجھنا چاہیئے تاکہ اس صورت میں اس کی ذات سے ابھرنے والی کوئی غیر متوقع خوبی حقیقی لطف نشاط بخش سکے۔ کیا ایک پارسا انسان پرستارانِ عشق و محبت کو اس سے بہتر کوئی مشورہ دے سکتا ہے! فی الحقیقت حقیقی مسرور وہ مرد ہیں جنھیں اپنی قیمتی زندگیوں کے دوران میں کبھی کبھار چند نشاط ہائے نادرہ اپنے اصلی روپ میں میسّر آ گئے۔"

ضیافت کا دوسرا دور قریب الاختتام تھا۔ اس دور میں دراج 'صحرائی' اعزاز اور ایک راج ہنس جیسے اڑتالیس گھنٹے اس احتیاط اور صفائی سے پکایا گیا تھا کہ اس کے بال و پر کے رنگ و روپ میں کوئی فرق نہ آیا تھا، مہمانوں کو پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی کبڑی طشتریوں میں تالابی سبزی، حواصل اور ایک سپید مور جو نہایت شان سے پر پھیلائے، انڈے سینے کے انداز میں بیٹھا بٹھایا گیا۔ مختصر یہ کہ اتنی خوراک پیش کی گئی جو مدعوئین کے علاوہ ایک صد افراد کے لیے بھی کافی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ آخری ڈش کے مقابلہ میں ہیچ تھا۔

فنِ طباخی کا یہ شاہکار جس کی مثال اسکندریہ میں ایک عرصہ دراز تک دیکھنے میں نہ آئی، ایک کمسن جنگلی جانور تھا جس کا نصف بھنا ہوا تھا اور نصف اُبلا ہوا تھا۔ جانے اس جانور کو ذبح کہاں سے کیا گیا تھا اور یہ کہ اس کے پیٹ میں نامعلوم کس

راستہ سے وہ تمام اشیا بھری گئی تھیں جو اس میں موجود تھیں۔ اس کے اندر موٹے تازے بٹیر تھے، اس میں سینہ ہائے مرغ کے علاوہ صحرائی مینڈول بھرے ہوئے تھے۔ رسیلی چٹنیاں، قیمہ اور کیورے تک تھے ـــ غرضیکہ اتنی ساری چیزوں کا اس جانور کے پیٹ میں بھرا جانا ایک معمہ تھا سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

اس شاہکار طباخی کو دیکھتے ہی ایک نعرۂ تحسین بلند ہوا اور فسطینہ نے تو بالآخر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کی طیاری کا گر سیکھ کر رہے گی۔ فراسیلاس نے کوشش کی کہ اشاروں اور کنایوں سے فسطینہ کی تشفی کر سکے مگر ناکام رہا۔ پھر فلدماس نے ایک ایسا مصرع ایجاد کیا جس میں لاطینی لفظ "پورکس" کے استعمال سے دو معنی نکلتے تھے اور نتیجتہً نہ صرف یہ کہ فسطینہ خوشی سے جھومنے لگی بلکہ سیسو جواب تک نشے میں چور چور ہو چکی تھی۔ اس قدر زور سے قہقہے مارنے لگی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس مرحلہ پر بخنیث نے اپنی کنیزوں کو حکم دیا کہ وہ ساتوں مہمانوں کے سامنے رکھے ہوئے پیمانوں میں سات مختلف مگر نایاب شرابیں ڈالیں۔ حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ مہمانوں نے اپنے اپنے جام ہونٹوں سے لگائے اور اندازِ سخن طرازی ایک دم بگڑ گیا۔

طائمن بخنیث کی طرف رخ موڑ کر بولا "تم اس غریب لڑکی دیتو سے کیوں خفا ہو گئی جسے میں اندر لانا چاہتا تھا۔ تمہارا کیا بگڑ جاتا جو وہ بھی اندر آجاتی؟ آخر کو وہ تمہاری ایک ہم پیشہ تھی! تمہاری جگہ اگر میں ہوتا تو میرے دل میں ایک امیر منتظمہ قحبہ خانہ کی بجائے ایک غریب طوائف کی زیادہ قدر ہوتی۔ میں تو اسے آنکھوں پر بٹھاتا۔"

"تو دیوانہ ہے!" وہ ترشروئی سے بولی۔

"میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ اسے خواہ مخواہ پاگل قرار دیتے ہیں جو مسلمہ سچی باتیں کہنے کا عادی ہو۔ تضاد بیانی کے دلدادہ کو ہر کوئی پسند کرتا ہے!"

"سنو، طائمن! کسی سے پوچھ دیکھو۔ کیا کوئی خاندانی مرد یہ گوارا کرتا ہے کہ کوئی مفلس

و نادار چھوکری اس کی داشتہ بنے"؛

"میں نے گوارا کیا ہے" فلدماس نے نہایت سادگی سے اعلان کیا اور تمام خوشحال قورطیبرائیں اس کے خلاف احتجاجاً صف بستہ نظر آنے لگیں۔

"گذشتہ سال —" اس نے بیان جاری رکھا "گذشتہ سال جب بتسرو کو ملک بدر کیا تو چند وجوہ کی بنا پر مجھے بھی جان کے لالے پڑ گئے۔ چنانچہ میں پیدل بھاگ پڑا اور بالآخر کہستان ایلپس میں کلیٹیس نامی جھیل کے کنارے ایک دلفریب مقام عورآبیہ میں پناہ گزیں ہوا۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی جس میں تین سو کے قریب عورتیں رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک نے دوسری عورتوں کی عصمت و عفت کو محفوظ کرنے کی خاطر قورطیبرہ بننا قبول کر لیا تھا۔ اس کا گھر دوسرے گھروں سے صرف ان چند گلدستوں کی وجہ سے الگ نظر آتا تھا جو اس کے دروازہ پر آویزاں تھے رہا اس رضاکار قورطیبرہ کا رنگ و روپ اور اس کی وضع قطع تو وہ کسی لحاظ سے بھی اپنی بستی کی دوسری ہم جنسوں سے مختلف نہ تھی اسے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں حسن افزا مرکبات، عطریات، مہین نقاب اور آرائش گیسو کا سامان بھی ہوتا ہے۔ فن تزئین جمال سے بالکل بے بہرہ وہ عورت اپنے جسم کے بالوں کو اس طرح اکھیڑتی تھی جس طرح صحن مرمریں سے گھاس۔ آپ لوگ یہ سن کر کانپ اٹھیں گے کہ وہ محض اس لیے ننگے پاؤں پھرتی تھی کہ کوئی اس کے پاؤں کو چوم نہ لے۔ اس کے برعکس فسطینہ کے پاؤں ہیں جو اس کے ہاتھوں سے بھی زیادہ نرم و نازک ہیں اور انہیں بار بار چومنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان سب باتوں کے باوجود میں نے اسے دلگداز پایا — اس قدر دلگداز اور دلفریب کہ اسے اپنی آغوش میں پاکر میں مسلسل ایک ماہ روم، اطالیہ اور اسکندریہ کے نشاط خانوں کی بوقلمونیوں کو بھولا رہا —"

نقراط نے اثباتاً سر ہلایا اور پھر ایک جام مے پی کر بولا "ہنگامۂ بوس و کنار کا وہ لمحہ بہت عظیم ہوتا ہے جب حسن لباسِ عریانی میں نہایت بے باکی سے عشق کے سامنے جلوہ ریز ہو۔ قورطیبراؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنی عریانی کو بطور ایک سامانِ تحیر محفوظ رکھیں۔ لیکن وہ ہیں کہ

بالکل ہی اس اصول کے خلاف چلتی ہیں اور ہمیں مایوس کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں۔ ۔ ۔
کیا ان بالوں سے زیادہ کوئی دردانگیز منظر دیکھنے میں آیا ہے جن پر ان کی مالکہ کی غلطی سے جگہ جگہ گھنگرو ڈالنے والی تپیدہ آہنی سلاخوں کے نشان پڑ گئے ہوں؟ ان آنکھوں سے زیادہ کوئی قابل رحم شے ہے جن کی پلکوں پر مصنوعی سیاہی کی لکیریں جگہ جگہ سے مٹی ہوئی ہوں؟ ان رخساروں سے زیادہ مکروہ کوئی چیز ہے جن کا غازہ عاشق کے لبوں سے چمٹ جائے؟ حسن افزائی کے پُر فریب حربوں کا استعمال صرف مجلس پسند خواتین کو زیب دیتا ہے۔ بجا کہ ہر عورت خواہ وہ کسی پارسا کی بیٹی کیوں نہ ہو فطری طور پر اپنے گرد عاشق مزاج مداحوں کو منڈلاتے دیکھنے کی آرزومند ہوتی ہے اور اس سرکش فطری میلان کے پیش نظر اسکا دوسروں کو حسین و دلکش نظر آنا ضروری ہے مگر یہ کہ اس سلسلہ میں ہر عورت تصنع اور بناوٹ پر اتر آئے غلط بات ہے تصنع اور بناوٹ ان عورتوں کے معاملہ میں تو بہت حد تک جائز ہے جنھیں کسی حالت میں بھی غیر کی آغوش میں بے نقاب ہو کر اپنے نقائص بدنی کا مذاق اڑانا گوارا نہیں مگر یہ کہ قورطینہ ایسی بھی ایسا کرنے لگیں نہایت نامعقول بات ہے۔ ایک عقلمند قورطینہ کو اپنی خلوت گاہ سے باہر ہرگز ہرگز اپنی اصلیت سے زیادہ حسین نظر آنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے بلکہ اگر ہو سکے تو انہیں اپنی تمام دلفریبیاں، اپنی ساری جاذبیتیں بطور سامان تحیر اپنی خلوت گاہ کے لیے محفوظ رکھنی چاہئیں۔ یہ کہ ایک قورطینہ اپنی خلوت گاہ کی بجائے سر راہ زیادہ دلکش نظر آئے، نہایت غلط رویہ ہے!"
"تمھیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں!" کرائسس قدرے مسکرا کر بولی: "مجھے تسلیم ہے کہ ہم میں میں سے ایک عاشق کو بھی دائمی طور پر اپنے ساتھ وابستہ نہیں رکھ سکتیں، لیکن مت بھولو کہ ہم پانچ صد آدمیوں میں سے ایک کو بھی نہیں ورغلا سکتیں اگر ہم خلوت گاہ عیش میں پہنچنے سے پہلے سر بازار کسی کو اپنے جلوہ حسن سے متاثر و مسحور نہ کر سکیں۔ بناؤ سنگار کے بغیر ہمیں کوئی ایک نظر بھی دیکھنا گوارا نہ کرے گا۔ خلدماس کی ننھی منی محبوبہ کی بات نہ کرو جو ایک ہی نگاہ ناز سے اسے مسحور کرنے میں کامیاب ہو گئی کیونکہ وہ اپنے گاؤں میں اکیلی تھی۔

تم بات کرو ان پندرہ ہزار قرطبیراؤں کی جن کے لیے قدم قدم پر ایک دو۔ ہے سے مقابلہ ناگزیر ہے۔"

"کیا تم نہیں جانتیں کہ حسن کامل آرائش کا محتاج نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ ہر معاملہ میں خود کفیل ہوتا ہے؟"

"جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں مگر افسوس ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔ ذرا اسے سامنے لاؤ جو بقول تمہارے حسنِ کامل کی حامل ہو اور پھر اسے ناتھیتن کے مقابلہ میں بٹھاؤ جو عمر رسیدہ اور بدصورت ہے تم اپنی حبیبنہ کو بوسیدہ عبا پہنا کر تمثیل گاہ کی آخری نشست پر بٹھانا اور میں اپنی ناتھیتن کو لباس فاخرہ پہنا کر وہاں بٹھاؤں گی جہاں ادنیٰ کنیزیں بیٹھی ہیں پھر دیکھنا خاتمۂ تمثیل پر باہر جاتے وقت "جمالِ حقیقی" اور "حسنِ کامل" کے پرستار کس کا تعاقب کرتے ہیں، اور کون زیادہ دام پاتی ہے؟ میں کہتی ہوں تمہاری "حسن بانو" کو کوئی دو کوڑی بھی نہ دے گا۔ جب کہ میری "اللہ رکھی"، کو وہ لوگ بخوشی دو مینائیں دیدیں گے۔"

"مرد بے وقوف اور احمق واقع ہوئے!" سیلسو نے حتمی فیصلہ سنایا۔

"نہیں یہ غلط خیال ہے۔ یہ کہیے کہ مرد حضرات فطرتاً سہل انگار واقع ہوئے ہیں۔ وہ انتخاب معشوقہ میں زیادہ بال کی کھال کھینچنا گوارا نہیں کرتے۔ بہر کیف اس میں کلام نہیں ہر دلعزیز حسین عورتیں عموماً دروغ گو اور افترا پرداز ثابت ہوئی ہیں۔"

"بھئی اس انتہا پسندانہ رائے زنی کی کیا ضرورت ہے؟" فراسیلاس نے پوچھا "باور کرو فراسیلاس ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر ایک طرف کسی کی تعریف کر سکتا ہے تو دوسری طرف . . . ."

اور فراسیلاس نے اپنے ان دونوں غیر دلچسپ نظریات پر کافی دیر تک نہایت حسین و دلچسپ انداز میں بحث کی۔

اتنے میں ایک ایک کر کے بارہ رقاصائیں نمودار ہوئیں۔ پہلی دو نے نواز تھیں۔

ایک کے ہاتھ میں طنبورہ تھا اور بقیہ سب کی سب تالی باز۔ آغازِ رقص سے قبل اُن سب نے اپنے اپنے مرباف سنوارے۔ جوتوں کے تلوؤں پر رال ملی اور بازو اٹھا کر ساکت کھڑی ہو گئیں اور موسیقی کے آغاز کا انتظار کرنے لگیں۔ ایک سُر، پھر دوسرا حتّٰی کہ لیڈ بئین دھن پوری طرح پھوٹ پڑی اور جوں ہی اس طربناک دھن کا زیر و بم تیز ہوا وہ سب کی سب جست لگا کر آگے کو بڑھیں۔

ان کا رقص اگرچہ نشاط انگیز تھا مگر کافی پیشگی مشق کے باوجود فنی لحاظ سے وہ بے ربط اور سُست رفتار تھا۔ ایک مختصر سی جگہ میں محدود وہ سب کی سب ایک دوسرے میں لہروں کی طرح گھل مل رہی تھیں۔ جلد ہی وہ جوڑوں میں بٹ گئیں اور رقص کو بند کئے بغیر انہوں نے اپنی پیٹیاں کھول ڈالیں اور ان کی مہین قبائیں زمین پر آ رہیں۔

آن کی آن میں برہنہ اندام عورتوں کی مہک پھولوں کی خوشبو اور بھُنتے ہوئے گرم گرم گوشت کی لپٹ پر غالب آتی ہوئی مردوں کے دل و دماغ پر چھانے لگی۔ نوعمر رقاصائیں آنکھوں کو بانہوں سے ڈھانپے، پیٹ آگے کو کئے پُشت کی جانب جھکیں اور پھر جلدی سے سیدھی تن کر اس طرح کھڑی ہوئیں کہ ان کے کولہوں پر گڑھے پڑ گئے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے کے سامنے سے اس طرح گذرنے لگیں کہ ان کے مرتعش سینے آپس میں متصادم ہوتے نظر آئے۔

"ہمارے دوست کا اُن کے متعلق کیا خیال ہے؟" فراسیلاتس نے اپنی مانوس پتلی سریلی آواز میں پوچھا۔

"میں بہت خوش ہوں،" طائمن نے جواب دیا۔ "مجھے تو آج ہی معلوم ہوا ہے کہ عورت کی زندگی کا عظیم ترین مقصد کیا ہے؟"

"اور وہ کیا ہے؟"

"اپنے آپ کو فحاشی کی نذر کرنا — فن کے ساتھ اور فن کے بغیر۔"

" یہ ایک آدمی کی رائے ہے۔"

" فراسیلاس! پھر وہی بات کہنا پڑتی ہے کہ ہم کوئی بھی دعویٰ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا سکتے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس دنیا میں کسی کو ثبات نہیں لیکن عقیدہ کے طور پر یہ خیال بھی ثبوتِ طلب ہے تمہارے پندارِ نفس کی خاطر میں تم سے ایک ایسے نظریہ کی پر زور تائید کرنے کی اجازت طلب کرتا ہوں جو ہمیشہ ایک متنازعہ فیہ موضوع رہے گا اور اسی وجہ سے دوسروں کے برعکس میرے نزدیک یہ ایک نہایت دلچسپ اور محویت انگیز مسئلہ ہے۔ فکر کی دنیا میں، تم جانتے ہی ہو، تمہاری قطعیت پرستی سے زیادہ عجیب و غریب مسئلہ ندرت طرازی ہے!"

" مجھے ذرا سی لسبئین شراب دینا!" سیکسو نے ایک کنیز سے کہا۔ " وہ دوسریوں سے تیز تر معلوم ہوتی ہے۔"

" مجھے یقین ہے۔" طائمن نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا " کہ ایک شادی شدہ عورت جو اپنے بے وفا اور مکار شوہر پہ جان چھڑکتی ہو اور تمام دوسرے مردوں سے مجتنب رہتی ہو یا پھر شاذ و نادر ہی زنا کے قریب جاتی ہو وہ ایسے بچے جنتی ہے جو اپنی پیدائش سے پہلے ہی اس کی رعنائیوں کو برباد کر ڈالتے ہیں اور پھر اس کے وجود پہ حاوی آجاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ایک عورت اپنی زندگی کو کسی نیک مقصد کے لیے ہرگز صرف نہیں کرتی بلکہ جس دن ایک لڑکی شادی کرتی ہے وہ اس دن اپنی زندگی کا نہایت احمقانہ سودا کرتی ہے۔"

" وہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک فریضہ پورا کر رہی ہے۔" نقراط نے بر سبیل تذکرہ کہا۔

" ایک فریضہ؟ کیسا فریضہ؟ کیا وہ ایک ایسے مسئلہ کو جس کا تعلق صرف اس کی تنہا ذات سے ہے، حسبِ خواہش حل کرنے کی آزادی نہیں رکھتی! وہ عورت ہے اور وہ بحیثیت عورت نشاط ہائے عقلی کے ادراک سے عموماً عاری ہوتی ہے اور اس کے باوجود

کہ وہ اپنی زندگی کو بھرپور مسرتوں کے معاملہ میں ادھوری پاکر کبھی خوش نہیں ہوتی لیکن پھر بھی وہ طوقِ مناکحت اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے اور اس طرح بھرپور خوشیوں سے دائمی محرومی اپنی قسمت میں لکھ لیتی ہے غرضیکہ ایک لڑکی اپنے اندر آرزوئے عشق کو سرکش ہوتے دیکھ کر اپنے آپ سے یہ کہنے میں حق بجانب ہے "میں جوان ہو گئی ہوں۔ میں اپنے لیے دس یا بارہ عشاق کے علاوہ ایک عدد شوہر بھی ڈھونڈوں گی ــــ اور ساتھ ہی وہ یہ بھی باور کر سکتی ہے کہ یہی ہے زندگی کا وہ حسین چلن جس کی بدولت وہ موت سے پہلے تمام الطافِ حیات سے بہرہ ور ہو گی۔ رہا میرا سوال تو بندہ پرور! عرض کروں گا کہ طائمن جس دن زندگی سے رخصت ہو گا تو تین ہزار عورتوں سے شناسائی کی یاد بھی اس کے لیے باعثِ اطمینان نہ ہو گی"

"تم بوالہوس معلوم ہوتے ہو!" کرائسس نے رائے زنی کی۔

"ہم کس زبان سے کن زریں اشعار کے ذریعہ کریم النفس قورطنیزاؤں کو ایک لازوال خراجِ تحسین پیش کریں؟" فلدماس نے پرجوش لہجہ میں کہا "ہم ان کے شکر گزار ہیں جن کی بدولت ہم پیچیدہ پیش بندیوں، باہمی رقابتوں، چالبازیوں اور زنا کے خمیازوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ احسان مند ہیں ہم سب ان کے جو ہمیں طوفانِ باد و باراں میں ایفائے وعدہ کی زحمت، شکستہ سیڑھیوں اور چور دروازوں پر انتظارِ محبوب کی روح فرسا اذیت اور ناتمام ملاقاتوں کی دلسوز خلش سے بچاتی ہیں ــــ وہی تو ہیں جنھیں نہ ہمیں پرخطر مکاتیبِ محبت لکھنے پڑھنے ہیں اور نہ شبہ خیز اشارات سے مدعا سمجھانا پڑتا ہے۔ آفریں بادے معشوقانِ حقیقی، آفریں! خلدماس تم پہ جان و دل سے فدا ہے۔ تمہارے حصول کی خاطر ہمیں گھات میں نہیں بیٹھنا پڑتا۔ چند حقیر سکوں کے عوض تم ہمیں وہ سب کچھ عطا کر دیتی ہو جو ایک نام نہاد شریف عورت تین ہفتوں کی مدافعت اور مزاحمت کے بعد ہمیں بخشتی ہے۔ نہیں بلکہ تم اس سے زیادہ کچھ ہمیں دے دیتی ہو۔ تمہاری منو در روح کے نزدیک محبت قربانی نہیں بلکہ ایک ایسا لطف و کرم ہے جس سے وہ محبت کرنے

والے باہمی طور پر یکساں محظوظ ہوتے ہیں۔ بسکہ تمہاری بے پایاں نزاکت بدنی کا معاوضہ ادا نہیں کیا جا سکتا — اوقات شبینہ میں تشنہ کام عشاق کو جرعہ ہائے مے نشاط پلانے والی اے کریم النفس ہستیو! تمہارے لطف و کرم کا ہم کیا صلہ دے سکتے ہیں؟ تمہاری مخیرانہ کرم گستریوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ کس قدر خوش قسمت ہیں ہم لوگ کہ تمہاری تعداد بھی بے حساب ہے۔ ذرا سی جستجو کے بعد ہمیں اپنی تسکین نفس کے لیے وہ محبوبِ دل نواز مل جاتی ہے جس کے ہم خواب دیکھا کرتے ہیں تمہارے حسن آباد کی نیرنگیوں کا کیا کہنا جہاں ہر ذوق کی حسینائیں مل سکتی ہیں۔ اوقاتِ شب و روز کی وہ کون سی ساعت ہے جب تمہیں پایا نہیں جا سکتا؟ یہ تمہارا گلستان جمال ایک جہانِ رنگ و بو ہے وسیع و عریض! ایک رومان گاہ ہے گیسوئے شبتار اور زلفہائے دراز و زرتار کے سایوں سے بھرپور! چشمہائے میگسار کی خمار کی آگینی سے لبریز اور لب ہائے لعلیں کی تلذذ آفرینی سے سرشار زیر آسماں وہ کونسا پاکیزہ اندازِ محبت ہے جسے تم نباہ نہیں سکتیں؟ وہ کونسا وحشت انگیز اسلوب بوس و کنار ہے جو تمہارے لیے محال ہے؟ تم ایک رسوائے زمانہ انسان سے بھی شرافت سے پیش آتی ہو۔ مریضوں تک کے لیے تمہارا بابِ خلوت وا ہوتا ہے۔ تم لطفِ مجسم ہو، تم مظہر جود و کرم ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم حسین ہو، جمیل ہو اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اے بخیثّ! اے کرہ اُسّس؟ اے سیبّو! اے فسطبنہ! تم سب باور کرو کہ دیوتاؤں کے فیضانِ کرم سے تم سب ما قرطیزاؤں میں ایک لازوال ولولۂ عشق موجود ہے اور اسی لیے منکوحہ عورتیں تم پر ہمیشہ سے رشک کرتی ہیں —"

رقاصائیں رقص بند کر چکیں تو ایک بازیگر لڑکی کمرے میں داخل ہوئی جس نے فوراً ہی خنجر بازی کا مظاہرہ شروع کر دیا اور پھر وہ سر کے بل ہاتھوں کی مدد سے نوکیلی تلواروں کے درمیان چلنے لگی۔

تمام مہمان دم بخود اس کے خطرناک کھیل کو دیکھ رہے تھے طائمن نے کرائسس کو اس وقت بڑی معنی خیز نظر سے دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ دوسروں کی نظروں سے بچتے ہوئے وہ اس کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی اس کے سراپا کو سہلانے لگا۔

"ہٹو!" کرائسس نے سرگوشی کے انداز میں کہا "ہٹو بھی!۔ مجھے نہ چھیڑو!"

لیکن وہ اس وقت تک لبادہ میں اپنا شریر ہاتھ ڈال چکا تھا اور اب نورطیرہ کے جسم دراز کی تپاں جلد کو سہلا رہا تھا۔

"ذرا ٹھہرو!" اس نے منت کی "کوئی دیکھ لے گا تو بخیت خفا ہو گی!"

طائمن نے حاضرینِ محفل پر ایک نظر ڈالی تو اسے یقین ہو گیا کہ انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا چنانچہ اور بھی زیادہ دلیر ہو گیا اور بالآخر اس نے وہ مخصوص چٹکی لے ہی لی جس کے بعد عورت لازماً بے بس ہو جاتی ہے۔ کرائسس کی رہی سہی ہچکچاہٹ کو دور کرنے کے لیے طائمن نے اپنا بٹوا جو حسنِ اتفاق سے کھلا ہوا تھا، اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور نتیجتہً کرائسس نے مزید مزاحمت ترک کر دی۔

بازیگر لڑکی بدستور اپنی خطرناک حرکاتِ رقص میں مشغول تھی۔ ہاتھوں کے بل کھڑی، ٹانگیں سر کی جانب ڈھلکائے وہ نوکیلی تلواروں اور خنجروں کے درمیان چل رہی تھی اور اس کی کمر بند اسکرٹ الٹ کر اس کے کاندھوں پر آ رہی تھی۔ اس خطرناک اندازِ بازیگری اور احتمالِ زخم خوردگی کے باعث اس کے رخسار انگاروں کی طرح دہک اٹھے تھے اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ اس کی ٹانگیں رقاصہ کے بازوؤں کی طرح وا تھیں اور اس کا عریاں سینہ تنفس کی تیز آمد و شد سے مرتعش تھا۔

"بس بھی کرو، توبہ!" کرائسس نے قدرے خفا ہو کر کہا "تم نے بے سود مجھے پریشاں کر دیا ہے۔ اب ختم کرو اپنی ان ناروا دست درازیوں کو!"

"......!"

"پرے ہٹو!"

عین اس لمحہ دو عفیفہ زین لڑکیاں حسبِ دستور حکایت خواجہ سرا کا ایک خاص تمثیلی رقص پیش کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور وہ چپکے سے اپنی گدگدی نشست سے اٹھ کر لرزہ بر اندام باہر نکل گئی۔

رہاکوتیس

اس کے پیچھے دروازہ ابھی پوری طرح بند ہونے بھی نہ پایا تھا کہ کریتیس کا ایک ہاتھ یکایک اس کے دفعتہً بھڑک اٹھنے والے نازک حصۂ بدن کو اس طرح مسلنے لگا گویا وہاں ایک شدید درد اٹھ کھڑا ہوا تھا جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہی ہے۔ زیادہ تسکین نہ ہو سکی تو وہ بالآخر ایک ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ کراہتی ہوئی اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔

ایک ناقابل بیان حالتِ اضطراب میں اس طرح کھڑے کھڑے وہ سوچنے لگی کہ وہ لمحہ سعید کب آئے گا جب اسے بخیتت کے آئینہ کی کوئی واضح خبر ملے گی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا جانے کیوں دماطریس کی کامیابی کے امکان پر اسے شبہ ہونے لگا تھا۔ بارہا اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس نادرِ روزگار آئینہ سے متعلق یوں ہی سے ایک سوال پوچھ لے مگر ہمت نہ ہوئی۔ آئینہ سے متعلق بات کرنے میں ایک عظیم خطرہ تھا۔ ممکن ہے آئینہ فی الواقعہ اب تک چرایا جا چکا ہو اور اس کے بارے میں سوال پوچھنے پر چوری کا الزام اس کے سر پر تھوپ دیا جائے۔ ظاہر تھا وہ ایسا تباہ کن خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھی۔ یہ دور اندیشی اپنی جگہ قابلِ داد تھی مگر اس کی بے چینی اور بے صبری اپنی جگہ قابل رحم۔ غرضیکہ وہ اس اذیت ناک عالمِ تذبذب سے تنگ آ کر باہر نکل آئی۔۔۔

طامس کی گستاخ دست درازیوں نے گویا جلتی آگ پر تیل کا کام دیا تھا۔ اسکا ذہنی خلفشار آہستہ آہستہ ایک ایسے تیز و تند جنسی انتشار میں بدل گیا کہ اب اس کا تن بدن پھنکا جا رہا تھا۔ وہ گری گری جاتی تھی اور بالآخر وہ خود کو اس قدر نڈھال محسوس کرنے لگی کہ چار و ناچار اسے ایک عظیم ستون کی خنک اور ملائم سطح سے پیوست ہو کر کھڑا ہو جانا پڑا۔

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عنقریب اس پر کسی جانب سے ایک بھرپور حملہ ہونے والا ہے اور وہ اس کی ہرگز ہرگز تاب نہ لا سکے گی: "میرے جواہرات کا خیال رکھنا میں باہر جا رہی ہوں"۔۔ یہ کہہ کر وہ ساتوں سیڑھیاں اتر گئی۔

آج رات گرم تھی اور ہوا ساکن۔ حبس کی وجہ سے اس کی عرق آلود پیشانی خشک ہونے میں نہ آتی تھی۔ موسم کی یہ غیر متوقع ناسازگاری اس کی طبع نازک پر بہت گراں گذری۔ دل کی بیکلی اور بھی بڑھ گئی۔ بہرکیف وہ خراماں چلتی گئی۔

بخیتش کی قیامگاہ اسکندریہ کی نواحی بستی بروشیون کے آخری سرے پر واقع تھی اور رہاکوتیس جو ملاحوں اور مصری عورتوں کی ایک مشہور تفریح گاہ تھی بروشیون کی بغل میں واقع تھی۔ ماہی گیر جو دن کی شدید گرمی کے اوقات عموماً اپنی لنگر انداز کشتیوں میں گزارتے تھے اپنی راتیں رہاکوتیس میں بسر کرتے تھے۔ جہاں انہیں اپنی گذشتہ یوم کی کمائی کو فاحشہ عورتوں اور شراب پر صرف کرنے کے مواقع بآسانی میسر آتے تھے۔

کرائسس اس نواحی بستی کی تنگ و تاریک گلیوں میں سے گذرتی گئی۔ یہ گلیاں ہر رات طرح طرح کے شور و غل جن میں وحشیانہ موسیقی اور رقصاں قدموں کی آوازیں بھی شامل ہوتیں، گونجتی رہتی تھیں۔ ایک دو جگہ کرائسس نے تفنن طبع کی خاطر بند دروازوں کی درازوں میں سے اندر جھانکا تو اسے چراغوں کے بدبودار دھوئیں میں دیوانہ وار محوِ اختلاط جوڑے دیکھ کر سخت ذہنی کوفت ہوئی۔ اس کے علاوہ چورستوں پہ واقع مکانات کے مرتفع چبوتروں پہ آراستہ پلنگوں کی رنگارنگ چٹائیاں مشغولِ عشق سایوں کے بوجھ سے چرچرا رہی تھیں۔ ان مناظر نے اسے اور بھی زیادہ خائف و مضطرب کر دیا۔ بہرکیف وہ چلی جا رہی تھی۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف ——

راستہ میں ایک جگہ اسے ایک "لیلیٰ بے قیس" نے زبردستی روکنا چاہا مگر ناکام رہی۔ کرائسس کو سردست لیلیٰ کی بجائے خود ایک قیس کی ضرورت تھی۔ اس سے آگے

ایک عمر رسیدہ بوالہوس نے اس کی چھاتی پر چٹکی لی۔ ذرا اور آگے ایک ضرورت مند ماں نے اسے اپنی بیٹی پیش کرنا چاہی، اس سے کچھ آگے اسے ایک عاشق مزاج گنوار نے پکڑ لیا اور جبراً ایک کریہہ بوسہ اس کی پشت گردن پر ثبت کر ڈالا۔ اس سر راہے 'جبریہ عشق' نے اسے اس قدر وحشت زدہ کر دیا کہ وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔ بھل بھلیاں قسم کی گلیوں کے پیچ و خم کا خیال رکھے بغیر وہ بھاگی جا رہی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیوں، کدھر اور کہاں بھاگ رہی ہے، دراصل آج سے قبل جب کبھی اس کا جی اس طرف آنے کو چاہا تو وہ ناک کی سیدھ تن تنہا چلتی ہوئی ایک سرخ دروازہ والے مکان میں پہنچ جاتی تھی جہاں وہ اپنے روزمرہ کے طلب گاروں کو چند ساعتوں کے لیے مکمل طور پر فراموش کر دینے کی خاطر اپنے ایک من پسند قوی الجثہ حبشی کی انتھک آغوش سے خراج عشق وصول کرتی تھی، اس نے ایک بار اس نوجوان کو "معاوضہ عشق" ادا کرنے کی بھی خوشی حاصل کی تھی مگر آج شام تو وہ اپنے پیچھے دیکھے بغیر ہی محسوس کر رہی تھی کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ایک کی بجائے دو آدمی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

اس نے اپنے قدم تیز تر کر دیئے تو اس کے تعاقب کرنے والے بھی تیز ہو گئے وہ یکایک بھاگ پڑی تو پیچھے سے رواں دواں قدموں کی آواز آنے لگی۔ غرضیکہ فرط وحشت میں بالآخر ایک ساتھ والی گلی میں مڑ گئی۔ وہاں سے وہ ایک اور گلی میں بھاگ آئی جس میں چلتے چلتے وہ ایک ایسے راستہ پر پہنچ گئی جو نہ جانے کہاں جاتا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا کنپٹیاں سلگ اٹھیں لیکن بخیتٔ کے یہاں پی ہوئی بادۂ ناب کے نشہ میں وہ اِدھر اُدھر بھاگتی ہی گئی تا آنکہ ایک فصیل نے اس کا راستہ روک دیا اور اسے دفعتہً رکنا پڑا۔ وہ ایک بڑے مخمصے میں پھنس گئی تھی قبل اس کے کہ وہ مڑ کر وہاں سے بھاگ نکلنے کا خیال اپنے دل میں لاتی دو ساتویں جہاز راں اس کا راستہ روکے کھڑے تھے "کہاں جا رہی ہو، اے پیکان زریں!" ایک نے قہقہہ مار کر کہا۔

"مجھے جانے دو!"

"تو تم گم گشتہ راہی ہو، ہے نا؟ رہا کو تیس میں اجلبنی معلوم ہوتی ہو، کیا نہیں؟ آؤ! ہم تمہیں سارے شہر کی سیر کرائیں!" — یہ کہہ کر ان دونوں نے اپنے بازو اس کی کمر میں ڈال دیئے اور وہ احتجاجاً چلائی، بھنائی اور غصہ میں بے تحاشہ انہیں مارنے لگی، مارتی رہی حتیٰ کہ تھک گئی اور ان میں سے ایک نے اس کی سرخ نازک کلائیوں کو قابو میں لے کر نہایت سادگی سے کہا "زیادہ نہ تلملاؤ۔ اس بستی کے بکین یونانیوں کے دشمن ہیں۔ مطمئن رہو۔ کوئی تمہاری امداد کو نہیں آئے گا۔"

"میں یونانی نہیں ہوں!"

"تم جھوٹ بکتی ہو! تمہاری سپید جلد اور ستواں ناک بتاتی ہے کہ تم یونانی ہو۔ لہٰذا اگر خیریت مطلوب ہے تو خاموش رہو!"

جس نے یہ بات کہی کرسٹس نے اس کو غور سے دیکھا پھر یکایک اپنی بانہیں اس کی گردن میں ڈال کر بڑے ناز سے بولی "مجھے تم پسند ہو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی!"

"بکو نہیں!" وہ شخص غرایا "تو ہم دونوں کے ساتھ چلے گی۔ اے بت طناز! میرا رفیق بھی تجھ سے خراج عیش وصول کریگا۔ اب چل — اس اطمینان قلب کے ساتھ کہ تیرا وقت ہمارے ساتھ خوب مزے میں کٹے گا۔"

جانے وہ اسے کہاں لے جا رہے تھے؟ بہر کیف اسے تُند مزاج جہاندران کا اکھڑ پن اور اس کا وحشیانہ پن بہت پسند آ رہا تھا چلتے چلتے اس نے اس پہ ایک گہری نظر ڈالی اور پھر وہ ایک بے اختیار جذبہ کے تحت اپنے بدن کو کھلاتی ہوئی اس کے اتنے قریب ہو لی کہ ان کے جسم آپس میں متصل ہو گئے۔

وہ تینوں تیزی کے ساتھ ویران اور اندھیاری بستی میں چلے جا رہے تھے۔ بند دروازوں، بے رونق دریچوں اور ساکت سایوں کا نظارہ کرسٹس کے دل پہ ایک عجیب خوف سے

ہراس سے ماخوذ کیفیت طاری کر رہا تھا۔ تنگ آکر اس نے نگاہیں اوپر کی طرف اٹھائیں تو اسے یک گونہ سکون سا محسوس ہوا۔ زرد آسمان پر طلوع مہتاب کا نور پھیل رہا تھا۔

بالآخر لوگ ایک پر رونق مقام پر پہنچ گئے۔ جوں ہی وہ ایک موڑ مڑے انہیں اپنے سامنے چند روشن دروازے نظر آئے جن کے اندر رنگی سنوری نباطی عورتیں مدھم مدھم دیوں کی روشنی میں مُو آراستہ سر جھکائے آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں۔

وہاں سے کچھ فاصلہ پر خاصی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ وہ اب رہاکوتیس کے چوگان میں پہنچ چکے تھے جہاں رات کے وقت جب اسکندریہ کے نو لاکھ نفوس نیند میں ہوتے تو ایک باقاعدہ بازار لگتا تھا۔ اور زندگی کی تمام ضروریات ملتی تھیں۔

وہ تینوں دو رویہ مکانوں کے سامنے رکھے ہوئے بکاؤ مال کے ڈھیروں کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے کہیں سبزیوں کے ڈھیر تھے تو کہیں خوشہ ہائے نرگس کے انبار۔ کہیں گل ہائے یسمن ٹوکریوں میں سجے ہوئے تھے تو کہیں زیتون کی ڈالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرشنس نے اپنی متانت اور خردمندی کے باوصف چلتے چلتے ایک خوشۂ انگور پر طفلانہ انداز میں ہاتھ مارا اور چند انگور توڑ کر جلدی جلدی کھانے لگی۔ اس کی اس بچگانہ ادا پر اس کے آشفتہ سر رفیق زیر لب مسکرائے۔ مختصر یہ کہ وہ لوگ بالآخر ایک میخانے پر پہنچے جس کا دروازہ بہت چھوٹا تھا اور اس کے اندر جانے کے لیے ان دونوں جہاز رانوں کو اس عظیم المرتبت عورت کے ساتھ جھکنا پڑا جس کی خوشنودئ مزاج کی خاطر اندرین کے مقدس موتیوں کی مالا چرائی جا چکی تھی۔

وہ اب ایک ایسے وسیع ہال میں تھے جہاں تقریباً پانچ سو گھٹیا نسل کے آدمی بیٹھے ہوئے صبح ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب کے سب خورد و نوش میں مصروف تھے کوئی زرد رنگ کی بیئر پی رہا تھا، کوئی رسیلی انجیریں کھا رہا تھا۔ چند ایک کنجد کے کیک کھا رہے تھے اور دوسرے جو کی روٹیوں سے دل بہلا رہے تھے۔ ان محوِ ناؤ و نوش مردوں

کے ارد گرد زبان دراز عورتوں کے غول کے غول مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ وہ شراب خانہ بحیثیت مجموعی ایک ایسا میدان معلوم ہوتا تھا جس کا ماحول رنگا رنگ پھولوں کی مہک اور گیسوانِ شب تار کے سایوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہال میں نظر آنے والی مفلس و قلاش عورتیں اسی کی ہو جائیں جو انہیں از راہ کرم وہاں اپنا لیتا۔ وہ وہاں عموماً خوراک مانگنے آتی تھیں اور تمام وقت برہنہ پا برہنہ سینہ کمر پر ایک مختصر سا سرخ یا نیلا پٹکا باندھے ادھر ادھر ماری ماری پھرتی رہتی تھیں۔ ان میں بیشتر کی گود میں چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچے ہوتے تھے۔ گویا کریہہ المنظر ہونے میں ان کا جواب نہ تھا۔

ہال میں ان بدنما عورتوں کے علاوہ چند رقاصاؤں کا وجود جنت نگاہ کا کام دیتا تھا۔ چھ حسین و جمیل اور سڈول بدنوں والی مصری لڑکیاں ہال کے وسط میں واقع ایک بلند اسٹیج پر تین موسیقاروں کی طربیہ دھنوں پر تمام رات ناچے جاتیں ۔

"اوہ !" کرائسس یکایک خوشی سے جھومتی ہوئی بولی "روغن ماہی میں تلی ہوئی مٹھائیاں !" — اور اس نے دو چھوٹے سکوں کی مٹھائی اس کم سن بچی سے خرید لی جو اپنا مال صدائیں لگا لگا کر بیچ رہی تھی۔ اس مرحلہ پہ کرائسس کو اچانک ایسا محسوس ہوا گویا اس کا دم گھٹتا جا رہا ہے۔ شراب خانہ کیا تھا ایک تاریک و متعفن غار تھی۔ قبل اس کے کہ وہ وفورِ کراہت سے بے ہوش ہو کر گر پڑتی، اس کے جہاز ران ساتھی اسے اٹھا باہر لے گئے۔

باہر کی کھلی فضا میں پہنچتے ہی اس کے حواس درست ہو گئے اور وہ قدرے جاندار مگر التجا آمیز لہجے میں بولی: "ہمدرد رفیقو! ہم کہاں چلے جا رہے ہیں؟ — رک جاؤ — آؤ کہیں بیٹھ جائیں — میں تھک گئی ہوں — میں مزید نہیں چل سکتی — گھبراؤ نہیں! اب مجھ میں تابِ انکار کہاں ؟ — دیکھتے نہیں، میرا سلوک کس قدر محتاط ہے؟ آؤ! کہیں جلدی سے جا لیٹے اماں ڈھونڈیں ورنہ میں سمجھی ہے گر جاؤں گی۔"

ہنگامۂ خرمستی

کاشانۂ بخیث پر وہ واپس پہنچی تو اس کے رخسار تمتما رہے تھے اور اس کا جسم اس شیریں بل چل سے سرشار تھا جسے حاصلِ تسکینِ نفس اور آسودگی تبخیرِ جفتی کا خمیازہ کہا جا سکتا تھا۔ اس کا ذہن نازک تر معلوم ہوتا تھا۔ ایک خفیف موجِ کیف اب بھی گاہے گاہے اس کی رانوں میں رقص کناں تھی۔

اس کی روانگی کے فوراً بعد محفل میں ہنگامۂ بدمستی ایک شعلہ کی طرح بھڑک اٹھا تھا دوسرے مہمان بھی اب تک پہنچ چکے تھے۔ وہ بارہ برہنہ اندام رقاصائیں ان کے پہنچنے کے ساتھ ہی ان سے دادِ عیش وصول کرنے لگیں۔ فرش پر چالیس[۴] پامال شدہ ہار بکھرے پڑے تھے۔ میز کے ایک گوشہ میں ایک بوتل اوندھے منہ پڑی تھی اور اس کی تمام شراب میز پر بہہ نکلی تھی۔ فلدماس اپنی محبوبہ قسطینہ کی عبا چاک کیے وہ اشعار گنگنا رہا تھا جو اس نے خاص طور پر اس کے حسن کی شان میں کہے تھے۔

"میری محبوب!
میں تیرے حسن کی تعریف نہیں کر سکتا،
تیرے بازو، تیری رانیں، تیرے پاؤں، تیرے ہاتھ،
کس قدر گرم بھی ہیں نرم بھی ہیں۔
تیرے شانے، تیری گردن، تیرے سینے کا ابھار،
تیرے جوبن کی بہار،
تیری آنکھوں کا خمار،
تیرے چہرے کا نکھار،

یہ ملاحت، یہ صباحت، یہ وجاہت، یہ غرور!
یہ فصاحت، یہ بلاغت، یہ لطافت، یہ سرور!
کتنے اوصاف کی حامل ہے تو!
کس کا اظہار کروں کس کا نہیں؟
تیرا ثانی کوئی دنیا میں نہیں۔
میری محبوب! میرے خواب کی نادر تعبیر!
روم کے حسن کا شہکار ہے تو! ——— عشق کا آخری معیار ہے تو!
میں تیرے حسن کی تعریف نہیں کر سکتا!"

نشے میں چور چور سیلسو میز پر پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی اور اپنے ایکسیلتان کو جام مے میں ڈبوتی ہوئی مذاحیہ انداز میں بار بار کہہ رہی تھی "پی! میرے ننھے منے روپ دلارے! پی ——— کہ تو پیاسہ ہے! پی، پی، پی ———"

الیفر دوسیہ جو ابھی غلام تھی، بدمست مردوں کے نرغہ میں پھنسی ہوئی اپنی حلقہ بگوشی کی آخری شب نہایت ہمت اور استقلال سے منا رہی تھی۔ شہر اسکندریہ کے ہنگامہ ہائے بدمستی کی صدیوں پرانی روایات کے مطابق وہ ابتدائیتین عیاشوں سے بیک وقت نبرد آزما ہوئی اور ہر لحاظ سے کامیاب اور سرخرو ہو کر اس کے سراپائے حسن وجمال کو ابھی اور آزمائشوں سے گزرنا تھا۔ ابھی بہت رات باقی تھی۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے مروجہ قواعد کے مطابق فورطینیرہ بننے کی متمنی الیفر دوسیہ کو اپنا استحقاق ثابت کرنے کے لیے صبح تک اپنی معشوقانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا تھا۔

ایک ستون کی آڑ میں نفر آطا اور فراسیلاس نہایت عاجزانہ انہماک کے ساتھ، عرخاسیلاس اور فرنیدی کے فن پہ گفتگو کر رہے تھے۔ ہال کے ایک بعید گوشے میں مرطوصیلہ اپنی محبوب سہیلی رعودش کو ایک ضدی اور گستاخ مہمان کی نفسانی دست

بُردے سے بچانے میں مصروف تھی۔ جوں ہی ان دونوں نے کرٹسس کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا وہ دونوں موقع کو غنیمت جان کر اس کی طرف بھاگیں۔

"کرٹسس! آیئے اب اجازت ہیں۔ تھیاتو ابھی ٹھہرے گی۔ لیکن ہم تو واپس جانا چاہتی ہیں۔"

"میں بھی ٹھہروں گی!" نوربینرہ نے جواب دیا اور اس کے بعد وہ گلاب کی پنکھڑیوں سے آراستہ اور گداز نشست پر انگڑائی لیتی ہوئی بیٹھ گئی اتنے میں اچھالے ہوئے سکوں کی جھنکار دفعتہً اس کے کان میں پڑی۔

رعودت کی بہن تھیاتو حکایتِ دنائی سے متعلق ایک رقص ازراہِ تمسخر پیش کر رہی تھی مگر تماشائی تھے کہ دادکے ڈونگرے برسا رہے تھے، ان میں سے چند نے بنا دی ڈجد کی حالت میں اس کی طرف سکے اچھالے جن میں سے چند کو رقاصہ تھیاتو نے اپنے عریاں جسم پر سلوٹیں ڈال ڈال کر نہایت صفائی سے وصول کیا۔ حیرت تھی کہ تھیاتو کا یہ اشتعال انگیز مظاہرہ جسمیں اِتقائے حسن نام کو نہ تھا، مہمانوں کو حد درجہ محظوظ کر رہا تھا۔ جانے طہارت حسن اور پاکیزگیٔ جمال کے قدردان دیوتا کہاں سو گئے تھے؟ یہ مظاہرہ اس قابل تھا کہ آسمان سے برق گرتی اور ان سب حاضرین محفل کو فنا کر دیتی!

حسبِ توقع کھیل بگڑ گیا اور سب کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا۔

جانے کس نے زور سے سکہ اچھالا تھا جس کے لگتے ہی تھیاتو کے نازک حصۂ بدن پر زخم ہو گیا کم بخت سکہ تھیاتو کے اندام میں چبھ سا گیا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کھیل بگڑتا دیکھ کر تھیاتو کو بہلانے کے لیے حاضرین کو ایک نیا کھیل اختراع کرنا پڑا۔

دو رقاصائیں شراب سے لبالب ایک بہت بڑا چاندی کا پیالہ کھینچ کر فرش کے وسط میں لائیں۔ تھیاتو کو جس نے اب رونا بند کر دیا تھا۔ سر کے بل کھڑی کر دیا گیا اور پھر اسے نقرئی پیمانے سے شراب پینے پر مجبور کیا گیا۔ شراب پینا تھا کہ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی غرضیکہ یہ کھیل اس قدر

کامیاب اور لطف انگیز ثابت ہوا کہ سب کے سب مہمان اس کے گرد جمع ہو گئے۔

آخر کار اس نے نراز لڑکی کو سیدھا کیا گیا۔ اس کا کھڑا ہونا تھا کہ خون کی تیز گردش سے اس کے گال تمتما اٹھے اور نشے میں مدہوش محفل کی محفل قہقہوں سے گونجنے لگی۔

اچانک بخیت کی آواز گونجی —

"آئینہ، آئینہ — ذرا آئینہ لانا تاکہ تھیالو اپنی شکل دیکھ سکے!"

حکم کی تعمیل میں کنیز کانسی کا آئینہ اٹھا کر لے آئی۔

"نہیں، نہیں، یہ آئینہ نہیں۔ رعود پیس والا آئینہ لاؤ جس کی وہ آج مستحق ہے۔"

کرشتس چونکی۔ ایک خونرنگ لہر تھی جو اس کے چہرے پر آئی اور چلی گئی۔ دل دھک سے ہو کر رہ گیا اور پھر اس زور سے دھڑکنے لگا جیسے سینہ سے باہر آ جائے گا۔ اس کی آنکھیں اس دروازہ پر جمی ہوئی تھیں جس سے کنیز سیلانی باہر گئی تھی یہ اس کی زندگی کا نہایت ہی فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اس کی آخری امید یا تو پوری ہونے والی تھی یا ہمیشہ کے لیے ٹوٹنے والی۔

اس کے چاروں طرف دورِ جشن اب بھی جاری تھا کسی نے شرارتاً سوسن کا پھول اس کی طرف پھینکا جو سیدھا اس کے منہ پر لگا اور اس کے لبوں پر زرگل کا ترش مزہ چھوڑ کر گر گیا ایک شخص نے عطر کی شیشی ہی اس کے بالوں پر انڈیل دی اور عطر نہایت تیزی کے ساتھ بالوں سے اس کے کندھوں پر گرنے لگا۔ کسی اور نے ایک انار اچھالا جو سیدھا اس کے جام شراب میں آ گرا اور نتیجتاً شراب کے چھینٹے اس کی جلد کو بھی بھگو گئے۔ غرضیکہ اس ہنگامۂ بدمستی کے تمام واجبات اس نے نہایت خندہ پیشانی سے پورے کیے۔

مگر کم بخت سیلانی اب تک واپس نہیں آئی تھی —

اور کرشتس تھی کہ پتھر کی طرح زرد ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے حواسِ خمسہ جواب دے رہے تھے۔

بالآخر سیلانی خالی ہاتھ آتی دکھائی دی۔

"آئینہ کہاں ہے؟"

"وہ وہاں نہیں ہے سرکار! — معلوم ہوتا ہے وہ کسی نے چرا لیا" سیلانی تتلائی۔

یہ دل شکن منحوس خبر سن کر بخیتث اس زور سے چیخی کہ محفل کی سخن طرازیاں ایک دم ختم ہو گئیں۔ ہجوم پر ایک خوفناک سناٹا چھا گیا۔ اور ہر طرف سے مرد اور عورتیں بخیتث کے گرد جمع ہو گئیں۔ غصہ سے کانپتی ہوئی بخیتث نے کنیز سیلانی کو قہر باز نظروں سے دیکھا اور غرائی "تو نے کیا کہا؟ کیا کہا؟"

مگر سیلانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بخیتث کا غصہ اسے خاموش دیکھ کر اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اس نے سیلانی کو حلق سے پکڑ کر اٹھایا اور چلائی "بدذات! آئینہ تم نے ہی چرایا ہے۔ تم نے — تم نے — کچھ بکو ورنہ تازیانے کی ضربیں تم سے سب کچھ اگلوا لیں گی۔ ذلیل کتیا!"

اس پر ایک خوفناک واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

لرزہ براندام کنیز اپنے سر پر اذیت ناک موت کو منڈلاتے دیکھ کر بولی "آئینہ میں نے نہیں — الفردوسیہ نے چرایا ہے۔ میں نے نہیں، الفردوسیہ نے چرایا ہے!"

"ہاں" — تمام کنیزیں یک زبان ہو کر چلائیں "یہ کام الفردوسیہ کا ہے، سرکار!" — اور وہ سب اپنی بے ہوش بہن الفردوسیہ کو گھسیٹتے ہوئے بخیتث کے سامنے لائیں اور ایک بار پھر یک زبان ہو کر بولیں "یہ رہی الفردوسیہ بدذات، رذیل کتیا، مادہ خنزیر، چور . . ."

بخیتث کی چہیتی کنیز الفردوسیہ سے مدت کے بعد حاسد بہنوں کو آج انتقام لینے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ ارتیاتث نے تو فرطِ جوش میں اس کے سینے پر ایک ٹھوکر بھی ماردی

"کہاں ہے وہ آئینہ؟ تو نے کہاں چھپا رکھا ہے وہ آئینہ؟"

"اس نے وہ اپنے ایک عاشق کو دے دیا ہے!"

"کون ہے وہ؟"

"ایک اُوپی جہاز راں!"

"اس کا جہاز کہاں ہے؟"

"روم روانہ ہو چکا، سرکار! اب حضور کو اپنا آئینہ کبھی دیکھنا نصیب نہ ہوگا اس بد ذات سؤر کُتیا کو مصلوب کرنا چاہیئے۔"

چشم زدن میں محفل جشن پہ ایک قیامت ٹوٹ پڑی: بخیت رو رہی تھی آئینہ کی گمشدگی نے اسے پاگل بنا دیا تھا۔ الیفردوسیہ جسے اب قدرے ہوش آ گیا تھا بدستور کانپ رہی تھی۔ فرطِ تحیر سے اس کی زبان بند اور آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔

بخیت نے اس کو ایک انتہائی قہر آلود نظر سے دیکھا اور پھر اس پہ چیل کی طرح جھپٹی، اس کو شراب اور پسینہ میں بھیگے ہوئے بالوں سے پکڑ کر فرش پر گھسیٹا اور پھر چلائی "صلیب کی طرف! صلیب کی طرف! کنیزو، ہتھوڑا اور کیل لاؤ!"

سیستو نے اپنے پہلو میں ایستادہ ایک شخص سے کہا۔ "میں نے آج تک منظرِ تصلیب نہیں دیکھا۔ آؤ سب چلیں!"

منظرِ تصلیب

سب مدعوئین ضیافت جلدی جلدی بخیت کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ باوصف اس کے کہ کرشتس کو علم تھا کہ اصل مجرم کون تھا اور یہ کہ تمام ہنگامہ اس کی بدولت تھا لیکن اس کے باوجود منظرِ تصلیب کو دیکھنے کا اشتیاق دل میں لیے وہ بھی ہجوم کے ساتھ ہولی۔

بخیت ضیافت گاہ سے سیدھی کنیزوں کے حجرہ میں پہنچی، جہاں وہ سب رات کے وقت دو دو ہو کر سوتی تھیں۔ حجرہ کیا تھا ایک مستقل تنبیہ گاہ تھا، جس کی دیوار کے ساتھ ایک صلیب آویزاں تھی جو ہمیشہ کاشانۂ بخیت کی ہر خادمہ کو ارتکابِ جرم سے باز رکھتی۔ آج تک اس صلیب کے استعمال کی نوبت نہ آئی تھی۔

تماشائی سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ اچانک چار کنیزوں نے الفردوسیہ کو جو اس وقت سکوتِ مجسم بنی ہوئی تھی، صلیب کے ساتھ کھڑی کر دیا۔ جوں ہی اس کا جسم صلیب کی کھردری سطح سے مس ہوا۔ وہ کانپتی ہوئی سسکیاں لینے لگی۔ بالآخر اسے کھونٹی کے سہارے صلیب سے پیوست کر دیا گیا۔ الفردوسیہ کے پاؤں اب زمین سے اٹھے ہوئے تھے۔ آخر وہ لمحہ بھی آگیا جب اس کی باہیں پھیلا دی گئیں۔

حیلوپ نے اپنی مالکہ کو ہتھوڑا اور کیل پکڑائی۔ اور عمل تعذیب شروع ہوا۔

خمارے، نفرت، غصہ — یہ تھے تین جذبے جو عورت کے قلب کی گہرائی میں ہمیشہ پنہاں رہنے والے جذبۂ ظلم کے ساتھ مل کر اس وقت بروئے کار آئے۔ جب بخیت نے پہلی کیل الفردوسیہ کی ہتھیلی میں ٹھونکی اور دونوں عورتیں — قہار و مقہور — کے منہ سے دلدوز چیخیں نکلیں۔ اس کے بعد اس نے الفردوسیہ کے پیروں میں کیلیں

گاڑیں اور پھر اس کے ہاتھ میں، زخموں سے خون کے چھینٹے اڑے اور بخیبت کے منہ پر آپڑے جس سے اس کا غصہ اور بھی تیز ہو گیا۔ چنانچہ وہ غرائی "یہ کافی نہیں ٹھہر تم خنزیر بر جہاز رانوں کی داشتہ، ٹھہر۔۔۔" اور اس نے البفردوسیہ کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ رسید کیا اور پھر اس کے بالوں سے پنیں نکال کر اس کے کمسن پستانوں، پیٹ اور رانوں میں گاڑ دیں جب اذیت رسانی کے تمام اوزار ختم ہو گئے تو اس نے اس کے خون آلود جسم پر تھوکا۔

ایک لمحہ اپنے اس مکمل شاہکارِ انتقام کو غور سے دیکھنے کے بعد وہ ضیافتگاہ کو لوٹ گئی اور اس کے بعد دوسرے مہمان بھی۔ صرف طائس اور فراسیلاس اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔

کچھ دیر محوِ استغراق رہ کر فراسیلاس کھانسا۔ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر اس نے سر اٹھایا، بھنویں چڑھائیں اور صلیب کی طرف بڑھا جو البفردوسیہ کے مجروح جسم کی طرح لرزاں تھی۔

بالآخر وہ بولا" ہر چند کہ میں اذعانات کے خلاف ہوں لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کہ تو اس وقت اپنے پیش آمدہ حالات پر قدرے حیران و ششدر ہے، تیری روح کے بار کو قدرے ہلکا کرنے کے لیے میں تجھے چند کارآمد رواقی نظریات سے آگاہ کر دوں گا۔ زینو۔ بانی رواقیت جس کا انداز فکر نقائص سے پاک تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے لیے غم و الم سے بے نیاز ہونے کے لیے چند ایسے صوفیانہ خیالات چھوڑ گیا ہے جن پر اگرچہ عام زندگی میں عمل پیرا ہونا تو محال ہے مگر وہ خیالات اس قابل ضرور ہیں کہ ان سے زندگی کے آخری لمحات میں استفادہ کیا جا سکے۔ اذیت بقول زینو، ایک بے معنی لفظ ہے کیونکہ انسان کی قوت ارادی ہمارے جسد فانی کی تمام کمزوریوں پر حاوی ہے۔ اس پر کلام نہیں کہ زینو اٹھانوے سال کا ہو کر فوت ہوا جیسا کہ اس کے سوانح نگار ہمیں بتلاتے ہیں، وہ اپنی تمام زندگی میں ایک بار بھی بیمار نہیں ہوا۔ لیکن یہ

حقیقت اس کی مخالفت میں بطور دلیل پیش نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس کے تمام عمر امراض سے محفوظ رہنے کی حقیقت سے یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ زندگی میں کبھی بیمار ہو جاتا تو ہم اس کی بیماری کو نقصِ کردار پہ محمول کر سکتے۔ اس کے علاوہ فلسفہ دانوں سے یہ سراسر زیادتی ہوگی اگر ہم ان سے اپنے قول پہ عمل کرنے کی توقع رکھیں اور ساتھ ہی ان سے ایسی سیرت کی امید وابستہ کریں جو ان کے تمام اقوالِ زرّیں کی آئینہ دار ہو۔ اس نازک مسئلہ پر مزید کچھ کہے بغیر میں یہ عرض کروں گا کہ تو اپنی روح کو حتی المقدور اپنی حالیہ جسمانی تکالیف سے بلند و بالا کر اے۔ تیرا دکھ، تیری اذیت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو تو اس میں مجھے اپنا شریک سمجھ! یہ عذاب قریب الاختتام ہے۔ صبر کر، بھول جا اور اس لمحہ کو قریب آتے دیکھ جب تو انسان کو شہرتِ دوام بخشنے والے نظریات میں سے ایک بھی ایسا نظریہ اپنے لیے منتخب نہ کر سکے گا جس کے ذریعہ تو اس احساسِ تاسف کو اپنے دل سے دور کر سکتی ہے جو فنا کے تصور سے پیدا ہو رہا ہے۔ اگر وہ نظریات سچے ہیں تو ان کے ذریعہ تو اپنی زندگی کے اس تاریک و ہیبت ناک لمحہ کو منور کر جس میں سے کہ تو گذر رہی ہے۔ اگر وہ سچے نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ تجھے پتہ نہ رہے گا کہ تو نے زندگی میں کبھی کوئی غلطی کی تھی۔"

سلسلہ کلام کو یکایک ختم کر کے فرا سیلاس نے اپنی قبا کا دامن کندھے پہ ڈالا اور لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اب صلیب کے پاس صرف طائمن کھڑا تھا۔ اس بیتی ہوئی رات کی یاد جو اس نے بدنصیب الفردوسیہ کی آغوشِ محبت میں گذاری تھی۔ اس کے ذہن میں اب بھی باقی تھی۔ یہ یاد رفتہ رفتہ الفردوسیہ کے اس جسم کے خیال سے جو کبھی اس کی باہوں میں شعلہ بیباک کی مانند تڑپا تھا اور جو عنقریب بجھنے والا تھا، مل مل کر ایک ناقابلِ بیان ذہنی خلفشار کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ اس نے بالآخر گھبرا کر اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے تاکہ وہ اس مقہور نازنین کو مزید نہ دیکھ سکے لیکن صلیب پہ ٹنگی ہوئی لاش کے تڑپنے کی آواز

مسلسل اس کے کانوں میں آ رہی تھی اور نتیجۃً اس نے جانکنی کی حالت میں مبتلا الیفر دوسیہ کو پھر دیکھنا شروع کر دیا۔ سینے کے زخموں سے خون اب بھی بہہ رہا تھا۔ اس کا سر اب بھی اِدھر اُدھر ہل رہا تھا۔ خون، پسینہ اور عطر میں بھیگی ہوئی زلفیں قریب المرگ جسم کے بائیں طرف ڈھلکی ہوئی تھیں۔

"الیفر دوسیہ! کیا تم میری آواز سن رہی ہو؟ کیا تم مجھے پہچان رہی ہو؟ میں ہوں طائمنؔ، تمہارا طائمنؔ!"

ایک بجھی بجھی سی نگاہ بمشکل تمام طائمنؔ تک پہنچی۔

اگرچہ جسم نے تڑپنا بند کر دیا تھا مگر الیفر دوسیہ کا سر بدستور دائیں بائیں ہل رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے کہ کہیں اسے مزید تکلیف نہ پہونچے طائمن دبے پاؤں سے صلیب کے ذرا اور قریب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے بازو پھیلائے اور الیفر دوسیہ کے لرزاں سر کو نہایت پاکیزہ اور شفقت آمیز انداز میں سہلایا۔ اس کے رخساروں پر ڈھلکے ہوئے اشک آلود بالوں کو ایک طرف ہٹایا اور پھر اس نے ایک بے پایاں نزاکت کے ساتھ اس کے مرتعش اور گرم ہونٹوں پر ایک بوسہ ثبت کر دیا۔

چشم زدن میں الیفر دوسیہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

کیا وہ اسے پہچان گئی تھی؟ کیا وہ اسے پہچان گئی تھی جس نے اس کی زندگی کے آخری تاریک و ہولناک لمحہ کو ایک لطیف ادائے محبت سے منور کیا تھا؟

ایک ناقابل بیان مسکراہٹ اس کے نیلگوں ہونٹوں پر پھیل گئی اور ایک آہ کے ساتھ الیفر دوسیہ نے اپنی روح کو آزاد کر لیا۔

کیفِ جذب و مستی

تو کام ہو چکا تھا۔ کرائسس کے پاس اس کا ثبوت تھا! اگر دماطرئیس پہلے نمائشی جرم کا ارتکاب کر سکتا تھا تو بقیہ دو جرائم کا ارتکاب کر سکتا تھا تو بقیہ دو جرائم کا ارتکاب بھی اس کے لیے محال نہ تھا۔ اس ایسا بلند مرتبہ انسان قتل اور اشیائے مقدسہ کی بے حرمتی کو چوری کی نسبت یقیناً کم ذلیل فعل خیال کرتا ہو گا! غرضیکہ تمام فرمائشوں کی تعمیل ہو چکی تھی وہ اب کرائسس کا غلام تھا۔ خوب کہ دماطرئیس ایسا حریت پسند، آوارہ منش، سرد مہر اور سنگدل شخص بھی اس کا اسیر ناز ہو سکتا تھا۔ اب اس کی محبوبہ تھی کرائسس — سرزمین غناسرت کی سارہ!

آہا! کس قدر دل گداز تھے تنہائی کے وہ لمحات جن کے دوران میں دماطرئیس کی تغیر پذیر زندگی کے متعلق وہ سوچتی رہی اور بآواز بلند اس حقیقت کا بار بار ذکر کرتی رہی۔ یکایک کرائسس کو اپنا گھر شور و غل سے بھرپور نظر آنے لگا اور وہ قدرے بیزاری محسوس کرنے لگی۔ چنانچہ وہ اپنی خلوت گاہ سے باہر نکل آئی اور سڑک پہ بے تحاشہ بھاگنے لگی نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔ بادِ صبح کے فرحت بخش جھونکوں نے اس کے رخساروں کو چوم چوم لیا۔

وہ بندرگاہ کی طرف جانے والی سڑک پہ رواں دواں بالآخر اس وسیع چوگان میں پہنچ گئی جس کے پرلے پار آٹھ سو جہازوں کے بادبان مکئی کے بلند قامت پودوں کا سا منظر پیش کر رہے تھے۔ یکایک وہ اس راہگذار پہ چل دی جس پر دماطرئیس کی ذاتی قیام گاہ واقع تھی۔ کاشانہ محبوب کو دیکھتے ہی اس کے جسم میں یک گونہ موج انبساط دوڑ گئی۔ باوجودیکہ وہ اپنے آستانہ حسن کے ہونے والے پرستار کے دریچوں کے سامنے سے

گذر رہی تھی لیکن اس کے پندارِ نفس نے اسے دماطریس کے گھر کی طرف پیش قدمی سے مصلحتاً باز رکھا۔ چنانچہ وہ اس سڑک پر چلتی گئی جو سبدھی "کالوپاک گیٹ" کو جاتی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی وہ ایلوے کے دو درختوں کے درمیان زمین پر لیٹ گئی۔

تو اس نے وہ کام کر ہی ڈالا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دماطریس نے اس کی خاطر ایک ایسا کارِ عظیم کر ڈالا تھا۔ جو کسی عاشق نے آج تک ایک عورت کی خاطر نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ اس کارِ نمایاں کا بار بار ذکر کر رہی تھی۔ گویا اس طور سے اپنی عظیم کامیابی کی تصدیق پر تصدیق مقصود تھی، دماطریس ــــ محبوبِ کُل ــــ متعدد عورتوں کے دلوں کا کبھی پورا نہ ہونے والا خواب کرائسس کی خاطر ہر ممکن خطرے، ہر نوع کی بدنامی اور رسوائی سے برضا و رغبت نبرد آزما ہونے پر آمادہ تھا۔ اس نے اس کے لیے اپنے تخیّل کے مثالی نمونہ یعنی ربۃ الفرودت کی مورتی کے گلے سے مقدس ہار اتارنے کی ناپاک جسارت سے بھی گریز نہ کیا تھا اور آج کا نیا دن اس عظیم معبودہ کے پرستارِ حقیقی کو ایک نئی محبوبہ کے آستانہ محبت پر سجدہ ریز دیکھنے والا تھا۔

"آؤ، مجھے لے جاؤ، مجھے لے جاؤ!" وہ چلائی۔ کرائسس اب اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اب اسے پکار رہی تھی۔ وہ اب اس کی آرزوئے طلب میں بے چین اور بیکل تھی۔ اب ہر سہ جرائم اس کی نگاہ میں ایسے کارہائے شجاعت کا درجہ اختیار کر گئے تھے جس کا بدلہ نہ تو وہ اپنی تمام تر نازک اداؤں سے دے سکتی تھی اور نہ اپنی جنسی نشاط آفرینیوں سے۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ وہ التہابِ عشق کس قدر بے مثال ہوگا۔ جو ان دو ایک سے جوان و رعنا ہم نفسوں، ان دو ایک سے پُر ولولہ اور پُرجوش انسانوں کے ملاپ سے پیدا ہوگا۔ ان کا جوشِ محبت ہر مشکل پر فاتح ثابت ہوگا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ہو کر رہیں گے۔

وہ دونوں اکٹھے مل کر کہیں دور چلے جائیں گے۔ ملکہ برنیس کے دیس سے کنارہ کش ہو کر وہ سمندر کے راستے عما تھیوز، عبادوس یا پھر اس انجانے روم کی طرف نکل جائیں گے جو عظیم شہر اسکندریہ جس کے سامنے بڑے بڑے تاج دار سرنگوں تھے، کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ وہ وہاں باہم مل کر کیا کچھ نہ کریں گے! وہ کون سی مسرت تھی جو وہاں ان پر نثار نہ ہو گی؟ قلبِ انسانی کو میسر آنے والی ہر شادمانی، ہر کامرانی ان کے نشاط ہائے رنگین میں گھل مل جانے کے لیے بیتاب ہو گی۔

کیفِ جذب و مستی کی شدت نے کرائٹس کو نڈھال سا کر دیا تو اس نے اپنی بانہوں کو پھیلایا، لہرایا اور اس کے بعد وہ اپنے کاندھوں کو تھپک کر نہایت متکبرانہ انداز میں اکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ یک گونہ احساسِ خستگی اور ایک ہمہ گیر موجِ انبساط نے اس کے مضبوط سینے میں ایک تناؤ سا پیدا کر دیا اور وہ افتاں و خیزاں گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

دروازہ کھولتے ہی اسے فوراً محسوس ہوا کہ گذشتہ رات سے اب تک اس کے گھر کے ماحول میں ذرا سی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ رنگ و بو کی دنیا میں ایک زبردست انقلاب آ چکا تھا۔ میزوں اور الماریوں پر رکھی ہوئی اس کی مانوس اشیاء اب اس کی نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔ ان میں بعض کو تو اس نے محض اس لیے توڑ پھوڑ ڈالا کہ وہ اسے اس کے چند ناکارہ و بے سود طلب گاروں کی یاد دلاتی تھیں اور اس وجہ سے اسے سخت ناپسندیدہ تھیں۔ دوسری جو اس کی دست برد سے بچ گئیں ان کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ اسے پسند تھیں غلط تھا۔ وہ تو محض اس لیے بچ گئیں کہ اگر کہیں دماطریس آئندہ رات اس کے یہاں گذارنے کے لیے چلا آیا تو ان کے بغیر کرائٹس کی خلوت گاہ بے حد بے رونق اور بے جان نظر آتی۔

آہستہ آہستہ اس نے اپنا لباس اتارنا شروع کیا تو گذشتہ رات کے ہنگامۂ بدمستی

کی یادگاریں مثلاً نان ریزے، بال اور گلاب کی پنکھڑیاں اس کے لبادہ سے گریں۔ پوشاک اتر چکی تو اس نے اپنی ملائم کمر کو سہلایا جو کمر بند کی داب سے قدرے درد کرنے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے بالوں سے کھیلا کی۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے بستر پر دراز ہوتی ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کانپا "ہو نہ ہو کچھ وقت میں چھت پر گزاروں جہاں ہوا نہایت لطیف ہوگی" چنانچہ وہ پھرتی سے چھت پر چڑھ گئی۔

سورج ابھی پوری طرح سے نہ نکل پایا تھا بلکہ اس مرحلہ پر اس کی شکل اُفق پر آراستہ ایک نہایت بڑی نارنجی سے مشابہہ تھی۔ چھت کی پستہ منڈیر پر ایک خمیدہ شجر نخل کے ہرے پتے جھوم رہے تھے۔ کرائسس نے اپنی ارتعاش پذیر برہنگی کو ان پتوں کی اوٹ میں کر لیا اور پھر ایکا ایکی اپنے سرکش سینہ کو لطیف جنبشیں دینے لگی۔ رہی اس کی نظریں تو وہ آہستہ آہستہ روشن ہونے والے شہر پر مرتکز تھیں۔ صبح کا بنفشی کہر خاموش اور سنسان گلی کوچوں سے اٹھتا ہوا نرل ہوا میں فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔

یکایک ایک برق آسا خیال اس کے ذہن میں تلملایا اور اس کا سراپا آن کی آن میں ایک دلآویز ہل چل سے کانپنے لگا۔ اس نے سوچا اب جب کہ دیمانظریس۔ محبوب گل — اسکی خاطر — ایک باصول اور خوددار قوبطینرہ کی خاطر اتنا کچھ بجمال رضا و رغبت کر گزرا تھا، کیوں نہ ملکہ مصر برنیس کو قتل کر کے اسکندریہ پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے اور اس کے بعد۔

اور اس کے بعد —

وہ جاذب نظر عمارات، وہ پر شکوہ محلات، وہ الوہیت پاش معابد، وہ پوسچ، وہ طویل و عریض ستونی سلسلے جو مغرب میں واقع نقرد پولس سے باغات معبد تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بروشئین کا خوبصورت یونانی محلہ، وہ ربا کوتیس۔ مصریوں کی بستی جس کے سامنے فائین کی سیرگاہ ایک کہستانی بالاحصار کی طرح جلوہ ریز تھی،

وہ سرآفس دیوتا عالیشان مندر جو اپنے پیشِ عمارت پر دو فلک بوس برجوں کے لیے مشہور تھا، وہ ربۃ الفرودت کا عظیم معبد جس سے ملحقہ باغات میں کھجور کے تین لاکھ درختوں کے علاوہ بے شمار تالاب تھے، وہ فربیقوں اور رغز ربنو کے عبادت خانے، وہ فسیدتوں کے حرم، وہ عیس فاروس کے تین مینار، وہ عیس ریاس کی ہفت ستون تمثیل گاہ اور اس کے قرب میں واقع رتھ بانوں کی آماجگاہ، وہ عظیم اسٹیڈیم جہاں سطاقس اور نیخا ستھنیز کے درمیاں دوڑ کا مقابلہ ہوا تھا، وہ مدفنِ اسطارنس اور مقبرۂ اسکندریہ — اسکندریہ، اسکندریہ! مادرِ جواں مرداں جس کے فلک بوس مرمریں میناروں نے بے شمار انسانوں کو غرقاب سمندر ہونے سے بچایا تھا۔ اسکندریہ! ملکہ برنیس کا شہرۂ آفاق شہر! گیارہ گذشتہ بطلیموسی شاہوں کا پایہ تخت۔ اسکندریہ! گہوارۂ خواب ہائے شیریں اور ان نہ ترین فتوحات کا مظہرِ اعلیٰ جو گذشتہ تین ہزار سالوں میں اس کے عظیم فن کاروں نے تیشہ، بانسری، پرکار اور شمشیر کی مدد سے ممفیس، طباس، ایتھنز اور قورنتھ پر حاصل کیں۔ دور فاصلہ پر نظر آنے والا نیل کا ڈیلٹا اور اس کے کناروں پر آباد سائیس، بوباسطس اور جیلوپولس کی دل کش بستیاں اور ان کے جنوب میں زرخیز وادیوں کے دلفریب مناظر۔ وہ نیل کے دونوں کناروں پر آباد ہفتانوس جو اپنے اندر بارہ سو دیوتاؤں سے منسوب مندر رکھتا تھا اور اس سے پرے تبائس، دریا سفلیس اور فیلان کے جزیرے اور ناقابلِ عبور آبشاریں اور اگر مصری عقاید کو مان لیا جائے تو ان سے پرے وہ رومانی سرزمین واقع تھی جن کی افسانوی جھیلوں سے قدیم نیل نکلتا تھا۔ جھیلیں جو اس قدر وسیع و عریض تھیں کہ ان کی سطح پر محوِ سفر ہونے والوں کو ارغوانی افقوں کا پتہ نہ چلتا تھا۔ جھیلیں جو پہاڑوں میں اس قدر بلندی پر واقع تھیں کہ ستارے بمثلِ اثمارِ زریں ان میں منعکس ہوتے تھے — وہ سب مل کر ایک سلطنت ہوں گے، ذاتی جاگیر بنیں گے قورطیسز ہ کر اشتس کی۔

فرطِ تفخر سے اس کا دم گھٹنے لگا تو اس نے اپنی بانہیں اٹھائیں گویا وہ آسمان کو چھو لینا چاہتی تھیں۔ اسی اثنا میں اس کی دائیں جانب سے ایک سیاہ پروں والا بڑا پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا اس کے قریب سے سمندر کی طرف اڑ گیا۔

قلوپطرہ

ملکہ برنیس کی چھوٹی بہن قلوپطرہ نامی تھی۔ اس سے پہلے بھی قلوپطرہ نام کی بہت سی مصری شہزادیاں گذری تھیں۔ لیکن آئندہ سالوں میں یہ لڑکی وہ شہرۂ آفاق قلوپطرہ ثابت ہوئی جس نے اپنی سلطنت کو برباد کر لیا تھا۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے اس سلطنت کی لاش پر اس نے اپنے آپ کو قتل کر ڈالا۔

وہ اس وقت بارہ سال کی تھی اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ آئندہ چل کر اس کا جمال کون سا رُخ اختیار کرنے والا تھا۔ وہ ایک ناقص طور پر پیوند شدہ، عجیب الخلقت پھل کی طرح پک رہی تھی۔ اس کے چند خط و خال پر مقدونیہ کی شوخ و شنگ عورتوں کا سا گماں ہوتا تھا اور اپنے دوسرے اوصاف سے وہ سرزمین نوبیا کی ان البیلیوں میں سے ایک لگتی تھی، جو اپنے چمپئی رنگ اور نازک اندامی کے لیے مشہور تھیں۔ اپنے لامبے قد اور چھریرے بدن کی بدولت وہ اپنے خاندان میں بالکل اچھوتی معلوم ہوتی تھی کیونکہ یہ خاندان فربہ اندام عورتوں کے لیے مشہور تھا۔ وہ ایک مشتبہ اور گھٹیا نسل عورت کی بیٹی تھی۔ اس کی نازک ستواں ناک کے نیچے حبشیوں کے سے ہونٹوں کا منظر نہایت استعجاب انگیز تھا۔ اس کے نوخیز پستان گول، چھوٹے اور ایک دوسرے سے کافی الگ الگ تھے انثمار الشباب کے متورم ہالوں کی جلوہ نمائی اس کے بنت النیل ہونے کا پتہ دیتی تھی۔

ننھی شہزادی سمندر کی طرف کھلنے والے ایک وسیع حجرہ میں رہتی تھی۔ یہ حجرہ ملکہ کی آرامگاہ سے ایک زمین دوز دالان کے ذریعہ ملا ہوا تھا۔ قلوپطرہ اپنی راتیں ایک ایسے نیلے ریشمیں بستر پر گزارتی تھی۔ جس پر لیٹے ہوئے اس کی سیاہی مائل اعضا کی آب تاب کو چار چاند لگ جاتے تھے۔

ہوا یہ کہ اس رات جب وہ تمام واقعات جن ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور اب تک قلوپطرہ کے علم میں نہ آئے تھے، ظہور پذیر ہو رہے تھے وہ پو پھٹنے سے کافی دیر پہلے جاگ اٹھی آج رات اُسے ٹھیک طرح سے نیند نہ آئی تھی۔ اس بدخوابی کا ایک سبب تو وہ بدنی اضطراب تھا۔ جو اس کی بلوغت رسیدگی کے تازہ تازہ تجربہ اور احساس کا نتیجہ تھا اور دوسرا سبب گرم ہوا کا پیدا کردہ اضمحلال تھا بہر کیف اپنی خادمہ شب کی نیند میں مخل ہوئے بغیر وہ نہایت چپکے سے اپنے بستر سے اٹھی، پتلی پتلی کلائیوں پر طلائی کنگن پہنے اور پھر اپنی نازک گندمی رنگ کمر پر بڑے بڑے موتیوں کی جھالر باندھ کر اپنی خوابگاہ سے باہر نکل آئی۔

سوائے اس دربان کے جو ملکہ کی خواب گاہ پر مامور تھا محل کے تمام مسلح سپاہی بلند بام برآمدے میں سو رہے تھے۔ شہزادی کو دیکھتے ہی دربانِ خاص دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور فرطِ وحشت میں اس طرح بڑبڑانے لگا گویا وہ بیچارہ اس سے قبل کبھی فرائض اور خمیازۂ کوتاہی کے مخمصے میں نہ پھنسا تھا۔

”شہزادی قلوپطرہ! خواستگار عفو ہوں کہ بندہ حضور کی راہ میں حائل ہے۔“

بچی سینہ تان کر کھڑی ہو گئی، چیں بجبیں ہوئی اور پھر اس نے ایک زناٹے دار تھپیڑ لرزہ براندام دربان کے منہ پر مارا۔

”تو اور شہزادی قلوپطرہ کی راہ میں حائل؟ تیری یہ جرأت! تیری یہ مجال!“ وہ دبی دبی مگر قہر آلود آواز سے بولی ”کمینے! قلوپطرہ یہ آبروئی کی دہائی دے کر تجھے قید کروا دے گی!“ — یہ کہہ کر وہ چپکے سے ملکہ برنیس کی خواب گاہ میں گھس گئی۔

باہوں کا تکیہ بنائے، ایک ہاتھ ڈھلکائے برنیس سو رہی تھی۔ ارغوانی بستر پر ایک قندیل آویزاں تھی جس کی مدھم مدھم روشنی خوابگاہ کی سپید مرمریں دیواروں سے منعکس ہونے والی چاندنی سے گھل مل رہی تھی۔ طلسم خواب سے سرشار عورت کی خمیدگی افروز برہنگی کے مبہم مگر درخشاں خطوط ان دو روشنیوں کے درمیان لرزاں سائے

میں لپٹے ہوئے تھے۔

قلوپطرہ نے اپنا نازک بدن بستر کے کنارے پر ٹکا دیا اور پھر وہ اپنی بڑی بہن کے چہرہ کو اپنے ننھے مُنّے ہاتھوں میں لے کر زبان اور انگلیوں کی مدد سے اسے جگانے لگی۔

"جانے سرکار کا عاشق آج رات کیوں پاس نہیں؟" اس نے سوال کیا۔

برنیس نے جھنجھلا کر آنکھیں کھول دیں۔

"قلوپطرہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں پوچھ رہی تھی۔ سرکار کا عاشق آج یہاں کیوں نہیں؟"

"کیا واقعی وہ غیر موجود ہے؟"

"جی ہاں، قطعاً مفقود الخبر! سرکار جانتی ہی ہوں گی؟"

"درست۔ وہ اب نہیں آتا۔ مگر اے ظالم، کیا تو ملکہ کو یہی جتلانے آئی ہے؟"

"مگر شاہی عاشق کی اس مجرمانہ بے رخی کا مطلب؟"

"ملکہ اسے صرف اسی وقت شرف باریابی بخشتی ہے جب وہ خود ملتمس ملاقات ہوتا ہے۔"

برنیس نے شاہانہ مگر سرد آہ بھر کر کہا۔ "وہ آتا ہے مگر دن کے وقت۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے اور بس!"

"کیا آپ کل اس سے ملی تھیں؟"

"ہاں مگر سڑک پر۔ میں اپنی پالکی میں تھی۔ وہ میرے پاس آ بیٹھا۔"

"تو وہ قصرِ شاہی میں نہیں آیا؟"

"درست۔ فقط بابِ شاہی تک آیا!"

"تو کیا باتیں ہوئیں سرکار کی اس سے؟"

"میں تو غصہ سے آگ بگولہ بنی رہی۔ جانے کیا کچھ غصہ میں بک گئی؟ جانے کیا کچھ میں نے کہہ ڈالا؟"

"واقعی؟" لڑکی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میری باتیں یقیناً سخت ہی تھیں کیونکہ ان تلخ نوائیوں کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب میرا غصہ بہت ہی بڑھ گیا تو اس نے میری دلجوئی کی خاطر ایک لمبی داستان سنانا شروع کر دی — وہ داستان قطعاً میری سمجھ میں نہ آئی مگر مجبوراً چپ سادھے رہی اور عین اس لمحہ جب میں اسے اپنے پاس سے نجانے دینے کی کوئی ترکیب سوچ رہی تھی وہ ظالم باہر کھسک گیا۔"

"تو جناب نے اسے واپس کیوں نہ بلا لیا؟"

"مجھے ڈر تھا کہیں وہ خفا نہ ہو جائے؟"

قلوپطرہ یہ جواب سن کر غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگی اور ساتھ ہی اپنی بہن کو کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ پھر ملکہ برنیس کی مدھ ماتی آنکھوں میں اپنی گستاخ آنکھیں ڈال کر بولی "کیا کہا؟ تو! میری بڑی بہن، جو ایک ملکہ ہے، عوام کی نظروں میں ایک دیوی ہے، نصف دنیا کی حکمران اور مالک ہے، آفاق کی تاجدار اور دیوتاؤں کی منظور نظر ہے، ایک عاشق کے دل پر حکومت نہیں کر سکتی؟"

برنیس جیسے کمسن قلوپطرہ کی ضرب گفتار نے ہلا کر رکھ دیا، سر جھکا کر بولی "حکومت! حکومت! یہ بات کہہ دینا آسان ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ عاشق عاشق ہے، ایک رذیل حلقہ بگوش غلام نہیں کہ اسکے دل و دماغ پر من مانی حکومت کی جا سکے۔"

"کیوں نہیں؟ خدارا ذرا بتلانا!"

"اس لیے کہ — خیر چھوڑ و اس مسئلہ کو۔ تو نہ سمجھ سکے گی یہ مسئلہ۔ البتہ اتنی بات ضرور کہوں گی کہ جب ایک عورت کسی مرد کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے تو وہ اپنی تمام خواہشات پر اپنے محبوب کی خوشنودیٔ مزاج کو ترجیح دیتی ہے۔ اگر برنیس کا محبوب دماطر بس اسی بات میں خوش ہے کہ برنیس ملکہ مصر ہوتے ہوئے بھی اس کے غم فراق میں شب و روز اشکبار رہے تو فبہا۔ برنیس کو یہ المناک اشکباریاں دل و جان سے زیادہ عزیز ہیں۔

برنیس تو وہی کچھ کرنا چاہے گی جو اس کے محبوب کو مرغوب ہے!"

" برنیس! تم بزدل ہو۔ تمہیں نہیں معلوم عشق کس طرح کیا جاتا ہے! لڑکی تلملاتے ہوئے بولی۔

ملکہ ایک سوگ وار سی ہنسی ہنسی اور اس نے پھر اپنی بانہوں کو بستر کے دونوں طرف اکڑا کر پھیلا دیا، اپنے سینہ میں ایک زہد شکن ابھار پیدا کیا اور اپنے بدن کو خم دے کر سرد آہ کے ساتھ بولی "آہ! اے کم سن متکبر دوشیزہ! سن! جب تو پہلی بار آغوش محبوب میں کیف نشاط سے بہرہ ور ہو گی تو تجھے معلوم ہو گا کہ کیوں ایک عورت اس مرد کی ملکہ نہیں بن سکتی جو اسے کیف ہائے نشاط بہم پہنچانے کا موجب بنتا ہے۔"

" اگر عورت چاہے تو ہمیشہ ملکہ رہ سکتی ہے!"

" بشرطیکہ محبت میں وہ اپنی تمام قوت ارادہ کھو نہ بیٹھے!"

" یہ بے بسیاں اور بیچارگیاں ملکہ مصر کو مبارک! قلوپطرہ اپنی قوت ارادہ کبھی نہیں کھوئے گی۔ حیرت ہے تم مجھ سے عمر اور تجربہ میں بڑی ہوتے ہوئے بھی ایسی ہزیمت خوردہ باتیں کرتی ہو!"

برنیس پھر مسکرائی "میری ننھی البیلی! کون ہے تیری قوت ارادی کا تختۂ مشق؟ غالباً تو اپنی کسی گڈیا پر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہو گی؟"

" یوں پوچھو کس عاشق پر؟" قلوپطرہ نہایت ناز سے جواب دیا۔

قبل اس کے کہ برنیس اپنی بہن کے اس تعجب سے خیز اور مہوشربا انکشاف کے متعلق کچھ کہہ سکتی۔ قلوپطرہ جلدی سے اور بھی زیادہ شوخ ہو کر بولی " ہاں، میں بھی ایک عدد عاشق کی مالک ہوں۔ میرا بھی ایک عاشق ہے۔ ہے اور ضرور ہے! اگر کیوں نہ ہو جب کہ ہر دوسری عورت کا ہے وہ خواہ برنیس کی طرح ایک ملکہ ہے اور خواہ مصر کی ایک ادنیٰ ترین لونڈی، خواہ ہماری ماں ہے اور خواہ ہماری خالہ۔ عاشق ہے بے شک میں بھی۔

ایک عاشق رکھتی ہوں۔ اور کیوں نہ رکھوں جب کہ میں گذشتہ چھ ماہ سے سنِ بلوغ کو پہنچ چکی ہوں اور تم نے میرے لیے اب تک شوہر نہیں تلاش کیا۔ میں نابالغ لڑکی نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں — اب میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تم مجھے کچھ بھی بتلانے کی زحمت نہ کرو جب کہ میں ہر چیز سمجھتی ہوں۔ میرے بازوں نے اکثر ایک ایسے مرد کی برہنہ پشت کو اپنی گرفت میں لیا ہے جو اپنے آپ کو مجھ پر حاوی سمجھتا تھا۔ میں اسے اکثر اپنی باہوں میں بھینچتی گئی ہوں۔ حتّٰی کہ وہ ٹوٹنے کے قریب آ جاتی رہیں۔ میں نے تمہاری طرح اپنے تلوؤں کو فضا میں کھڑا کیے رکھا ہے جب میرے جسم سے جان نکل رہی ہوتی ہے۔ میں بارہا تمہاری طرح مر مر گئی ہوں۔ لیکن ——

برنیس! ہنگامۂ عیش سے فارغ ہو کر میں ہمیشہ اپنے آپ میں آ جاتی ہوں۔ گویا تلو بطرہ کسی دوسرے کی بجائے خود اپنی داشتہ اور عاشق ہے۔ اس لیے تم میرے ساتھ زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تمہیں اپنی خود مختار ملکہ تسلیم کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے تم ہو ایک مرد کی محکوم اور غلام —!"

اپنے آپ کو ایک پختہ عمر عورت کی طرح قد کشیدہ ظاہر کرنے کے لیے ننھی مُنّی تلو بطرہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سر کے دونوں طرف اس طرح رکھ دیئے گویا وہ ایک ایشیائی مَلکہ تھی جو اپنا تاج درست کر رہی تھی۔ اس کی بڑی بہن جو بستر پہ تن کر بیٹھی تھی اور نہایت غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی، اچانک اس کی طرف جھکی اور اس کے ڈھلوان، نازک کاندھوں کو تھپکاتی ہوئی بولی! "تو تیرا بھی ایک عاشق ہے!" اس کی آواز میں بودا پن اور لحاظ تھا۔

"اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا تو آؤ —— میں تمہیں اپنا عاشق دکھا ہی دوں!" لڑکی نے کج ادائی سے کہا۔

"تو اس سے کب ملتی ہے؟" برنیس نے پوچھا۔

"دن میں تین مرتبہ!"

"کہاں؟"

کیا تم چاہتی ہو کہ میں یہ بھی تمہیں بتا دوں؟"

"ہاں!"

"حیرت ہے تم اس قدر بے خبر ہو!"

"مجھے کچھ معلوم نہیں حتیٰ کہ محل کے کوائف سے بھی یکسر بے خبر رہتی ہوں۔ دراصل میرے لیے دماطریس ہی زندگی میں سب کچھ ہے۔ اسی کی باتیں کرتی ہوں، اسی کے متعلق باتیں سننا مجھے پسند ہیں۔ بجا مجھے تجھ پر کڑی نظر رکھنا چاہیئے تھی۔ افسوس، میں ایسا نہ کر سکی۔ یہ سب میرا قصور ہے۔"

"اگر ہو سکے تو مجھ پر تم ضرور نظر رکھو مگر یہ نہ بھولنا — کہ جس روز قلوپطرہ کی من مانیاں ختم ہونے کو آئیں گی وہ اپنے تئیں مار ڈالے گی۔ اسے مطلق کوئی پروا نہ ہو گی کہ اس کی موت کے بعد دنیا میں کیا ہوتا ہے۔"

"جانِ من! تو آزاد ہے۔" بر نیس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔ "بہر کیف تجھے پابند کرنا اب خارج از بحث ہے۔ مگر ہاں جانِ عزیز، یہ تو بتاؤ، تو اپنے عاشق کو اپنے پاس اور اپنے تک کیسے پابند و محدود رکھتی ہے؟"

"ہاں، اسے پابند و محدود رکھنے کی میرے پاس ایک کارگر ترکیب ہے!"

"وہ کس نے سکھلائی تجھے؟"

"خود میں نے اپنے آپ کو سکھلائی — ان چیزوں سے آگاہی یا تو انسان وجدانی طور پر حاصل کرتا ہے یا بالکل نہیں۔ جب میں چھ سال کی تھی تو مجھے پتہ چل گیا تھا کہ میں آنے والی زندگی میں اپنے عاشق کو کس طرح قابو میں رکھوں گی۔!"

"مجھے بتلاؤ گی کس طرح؟"

"میرے ساتھ چلی آؤ!"

برنیس اپنے بستر سے دھیرے دھیرے اٹھی، لبادہ زیب تن کیا، لبادے پہ ایک فرغل ڈالی اور پھر جب وہ اپنے عرق آلود بالوں کو جھٹک چکی تو دونوں بہنیں خواب گاہ سے باہر نکل آئیں۔ قلوپطرہ پیش پیش تھی۔ دونوں دالان میں سے گذر کر قلوپطرہ کے حجرہ خصوصی میں پہنچ گئیں جہاں پر ایک تکیہ کے نیچے سے کم سن ساحرہ نے ایک نئی چابی نکالی۔

"چلی آؤ، برنیس!" لڑکی نے کہا۔ "ابھی منزل دور ہے!" — یہ کہہ کر وہ دالان کے وسط میں سے اوپر کو جانے والے زینہ پر گامزن ہوئی، تب اس نے ایک طویل ستون دار برآمدہ میں پہنچ کر یکے بعد دیگرے کئی دروازے کھولے اور غالیچوں سے مزین ان گنت سیرطبھوں اور سنسان کمروں کے منقش فرشوں پر ہوتی ہوئی وہ ایک عظیم دروازے کے سامنے پہنچ گئی جس کی دہلیز کے بالمقابل واقع سنگین روش پر چند سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ انہیں اس سے بھی آگے جانا تھا، قصۂ مختصر، وہ دونوں کافی دیر خراماں خراماں چلنے کے بعد ایک وسیع احاطہ میں پہنچ گئیں۔ جہاں چاندنی پھیلی ہوئی تھی کھجور کے ایک لمبے تڑنگے درخت کا سایہ قلوپطرہ کی کمر اور کولھوں سے لپٹا لپٹا جاتا تھا۔ برنیس جو ایک آسمانی رنگ کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی، اب بھی اپنی چھوٹی بہن کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی، بالآخر وہ دونوں ایک عظیم آہنی دروازے کے سامنے کھڑی تھیں۔ قلوپطرہ نے قفل میں چابی پھنسا کر دو مرتبہ گھمائی۔ پھر اس نے دروازے کو دھکیلا اور ایک آدمی جو اندھیرے میں دبو معلوم ہوتا تھا، اس غار نما حجرہ کی پہنائیوں سے نمودار ہو کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

ہیجانِ جذبات سے چور چور برنیس نے اندر جھانکا اور پھر سر کو قدرے ڈھلکا کر آہستہ سے بولی "بچی! تو یہ تُو ہے! اری تو نہیں جانتی محبت کیسے کی جاتی ہے کم از کم ابھی نہیں۔ میرا خیال درست ہی تھا جب میں نے تجھ پر رموزِ عشق سے بے خبری کا الزام لگایا تھا —"

"محبت برائے محبت!" لڑکی نے جواب دیا۔ "مجھے اپنا طریق محبت بہت پسند ہے

کم ازکم اس سے مجھے تو کیفِ نشاط میسر آتا ہے۔"

قید خانے کی دہلیز پر کھڑے کھڑے، ایک قدم بڑھائے بغیر قلوپطرہ نے سایا میں ایستادہ آدمی کو تحکمانہ انداز میں کہا۔

"یہاں آؤ۔۔۔ اور میرے قدموں کو بوسہ دو، کُتّے کی اولاد!"

جب وہ اس کے پاؤں چوم چکا تو قلوپطرہ نے اپنا ہوس آشنا دہن اس کے لبوں سے پیوست کر دیا۔

سپنا

دماطرِیس اس دوران میں آئینہ، شانہ اور ہار لیے گھر واپس پہونچا۔ نیند میں اس نے ایک ایک عجیب خواب دیکھا جو یہ تھا۔

وہ تنِ تنہا ایک جمِ غفیر میں سے ہوتا ہوا اگوری کی طرف جانے والی شاہراہ پر جا رہا ہے عجیب رات ہے، نہ چاند ہے نہ تارے اور نہ بادل لیکن اس کے باوجود رات ایک نورانی دھندلکے میں ملفوف ہے۔

جانے وہ کیوں چلا جا رہا ہے! جانے کون سی ساحرانہ کشش ہے جو اسے بے چلے جا رہی ہے! رواں دواں ہونے کے باوجود وہ محسوس کر رہا ہے کہ وہ 'وہاں' نہ پہنچ سکے گا۔ اس کے قدم خود بخود بوجھل سے ہوئے جا رہے ہیں۔ ہوا تک اس کی راہ میں مزاحم ہے گویا وہ پانی میں چل رہا ہے۔ اس کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں۔ وہ ڈر رہا ہے کہ وہ وہاں ..... وہاں . . . . ہرگز نہ پہنچ سکے گا لیکن اس کے باوجود وہ چلا جا رہا ہے۔ جانے کہاں! کس کی طرف! لرزہ براندام، مضطرب و بے چین درخشاں ابہام میں لپٹی ہوئی فضا کو چیرتا ہوا۔ گاہے ہجوم اس کی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے اسکا ذہن اس بیکراں ہجوم کے احساس سے چند لمحوں کے لیے بے نیاز ہو جاتا ہے اور نتیجتہً اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد وہی ہجوم پھر اس کے سامنے نمودار ہو جاتا ہے اور اب تو اس کی ریل پیل اس قدر شدید اور تیز معلوم ہوتی ہے کہ اس کے قدم اس کا ساتھ دینے سے عاجز

نظر آتے ہیں چند لمحوں بعد وہی ہجوم اسے اپنے نرغہ میں لے لیتا ہے اور وہ حواس باختہ ہو جاتا ہے۔

اس بے پناہ ریل پیل میں اچانک ایک آدمی اس کے کاندھے سے ٹکراتا ہے۔ ایک عورت کے کمر بند کے بر پیچ کا کیل اس کے چغہ میں ایسا الجھتا ہے کہ دامن تار تار ہوتے رہ جاتا ہے۔ اپنے میں ایک لڑکی ہجوم کے دھکے سے اس کے اس قدر قریب ہو جاتی ہے کہ لڑکی کا ابھرا سینہ اور دیماطریس کا جسم پل بھر کے لیے آپس میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ لڑکی شرما جاتی ہے اور پھر غصہ سے پیچ و تاب کھاتی ہوئی اس کا منہ اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے پرے ہٹا دیتی ہے۔

یکایک وہ بندرگاہ کی گودی پر تنہا کھڑا رہ جاتا ہے۔ جب وہ اپنا منہ موڑ کر پشت کی جانب نظر دوڑاتا ہے تو دور فاصلہ پر وہی ہجوم ایک سپیڈ ٹڈی دل کی طرح پیچھے کو ہٹتا نظر آتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتا ہے "میں تنہا ہوں۔ وہ جم غفیر اب میری طرف کبھی نہیں آئیگا۔"

اس کے سامنے کی طرف بحر ناپیدا کنار پر گودی کی سڑک ایک نامکمل شاہراہ کی طرح منزل اُفق کی طرف ساحرانہ طور پر پھیل رہی ہے۔ وہ شاید منار فاروس کی طرف جانا چاہتا ہے۔ وہ ایک بار پھر تیزی سے چل پڑتا ہے۔ اس کے قدم یکا یک سبک ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ بڑھ رہا ہے۔ ریتیلے ساحل سے اٹھتی ہوئی ہوائیں اسے گودی کی سنسان سڑک پہ اڑائے چلی جا رہی ہیں۔ وہ بڑھ رہا ہے اور منارِ فاروس پیچھے کو ہٹتا جا رہا ہے۔ منار کا ارغوانی شعلہ کانپتا ہوا سرمئی افق سے باتیں کرنے لگتا ہے وہ کبھی بجھتا ہے کبھی بھڑکتا ہے اور رفتہ رفتہ آخر کار ایک دوسرا محوِ غروب چاند معلوم ہونے لگتا ہے۔

دیماطریس ہے کہ بڑھا جا رہا ہے —

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکندریہ کے پشتہ بند ساحل سے دور آئے ہوئے اسے کئی دن اور کئی راتیں گذر گئیں اور اس وجہ سے اس کا جی پیچھے کی طرف نظر ڈالنے

کو نہیں چاہتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہاں اب سوائے اس کٹھن راہ کے کچھ نہیں جو وہ بعجلت تمام طے کر چکا ہے۔ چنانچہ اب وہ نہایت مستعدی اور استقلال کے ساتھ ایک انجانے راستہ پہ سامنے کی طرف ایک انجانی منزل کی طرف گامزن ہے۔

چلتے چلتے وہ اچانک مڑ پڑتا ہے۔

پشت کی جانب اسے ایک جزیرہ نظر آتا ہے۔ ایک جزیرہ، گل افروز درختوں سے بھرپور —

وہ سوچتا ہے :- کیا میں آنکھیں بند کیے یہاں تک پہنچ گیا یا وہ جزیرہ مجھے متحیر و متعجب کرنے کے لیے ابھی ابھی پُراسرار طور پر ظہور پذیر ہوا ہے؟

وہ اس مسئلہ پر مزید کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔ آج کی رات ناممکنات ہی قدرتی ممکنات معلوم ہوتے ہیں —

جزیرے پر ایک عورت موجود ہے۔ اس وقت وہ جزیرے پر اپنے واحد گھر کے سامنے محو گلگشت ہے۔ گاہے وہ نیم وا آنکھوں سے فضا کو دیکھتی ہے گاہے قد آور گلپوش پودوں کو اپنے نازک ہونٹوں سے چومتی ہے اس کے بال نہایت سنہری اور گھنے ہیں۔ لامبی گردن پر آراستہ غیر معمولی طور پر پھیلی ہوئی عقاص اس کے گیسوؤں کی غیر معمولی درازی کا پتہ دیتی ہیں۔ سیاہ رنگ کے جُبّا میں ملبوس وہ نازک اندام عورت کالی فرغل بھی زیب تن کیے ہوئے ہے۔ اس وقت وہ آنکھیں بند کیے ایک شبرنگ گُلِ سوسن کو ایک ساتھ سونگھ اور چوم رہی ہے۔

اس تمام ماتمی جلوہ آرائی میں جو شے دماطریس کی نگاہوں کو سب سے زیادہ متاثر کر رہی ہے وہ اس عورت کے بال ہیں جن کا منظر آبنوسی ستون پہ آراستہ سنہری گلدان کا سا ہے۔ وہ دفعتہً کرائسس کو پہچان لیتا ہے —

آئینہ، شانہ اور ہار کا مبہم سا خیال اس کے ذہن میں آتا ہے اور گذر جاتا ہے۔ اس

عجیب وغریب خواب ہیں حقیقت بھی اسے واہمہ معلوم ہوتی ہے —

"آ" وہ کہتی ہے "آ، میرے پیچھے چلا آ۔"

چنانچہ وہ اس کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ آہستہ سے وہ سپید کھالوں سے ڈھنپے ہوئے ایک زینہ پر چڑھتی ہے۔ اس کے بازو کٹہرے کا سہارا لیے ہوئے ہیں۔ اسکرٹ کے نیچے اس کی ننگی ایڑیاں گام گام پر نظر آتی ہیں۔

مکان یک منزلہ ہے۔ زینہ کی آخری سیڑھی پر وہ رُک جاتی ہے۔

"اس میں چار کمرے ہیں" وہ کہتی ہے "ان کو ایک بار دیکھ لینے کے بعد تو ان میں پھر کبھی نہیں آئے گا۔ کیا تو میرے پیچھے آئے گا؟ تو ہے ہمت؟"

مگر وہ تو اس کے پیچھے کہیں بھی جانے پر آمادہ ہے۔ وہ پہلا دروازہ کھولتی ہے وہ اندر داخل ہو جاتا ہے تو وہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔

کمرہ لمبا مگر تنگ سا ہے۔ ایک دریچہ جس میں سے تمام سمندر دیکھا جا سکتا ہے اس کی روشنی کا واحد ذریعہ ہے۔ دائیں اور بائیں جانب بچھی ہوئی دو میزوں پر ایک درجن دستاویزی کتابیں لپٹی ہوئی پڑی ہیں۔

"یہ رہیں تیری من پسند اور محبوب کتابیں!" کرائسس کہتی ہے "ان کے علاوہ اور نہیں ہیں۔"

دماطریس انہیں کھولتا ہے۔ وہ ہیں شاعر مرآن کی "اوڈی نس"، "القیبس کی "مراجعت"، ارستفاس کی تصنیف "آئینہ لعیس"، تھیوفرلیطس کی "ساحرہ" "سائیکلوپس" اور بحولات"، "اوڈمی کولوناس ہیں"، دیوان صافو اور چند دوسری کتابیں۔ اس بے مثال مطالعہ گاہ کے وسط میں ایک برہنہ اندام لڑکی ایک گداز جو کی پر تکیہ کا سہارا لیے ادائے ناز سے محو استراحت ہے۔

"ہاں تو!" کرائسس ایک طلائی صندوقچے میں سے ایک یک ورقی مسودہ نکال کر آہستہ

سے کہتی ہے۔ "یہ رہا اس قدیم نظم کا ایک صفحہ جسے تو اکیلا اشکبار ہوئے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔"

نوجوان سرسری طور پر یہ پڑھتا ہے۔

"وہ سب کے سب ماتم کناں تھا۔ خاص طور پر عورتوں کا تو بہت ہی بُرا حال تھا۔ سیمتن اندرومانخے جبار و قہار جیققطر کا سر پکڑے سینہ کوبی میں پیش پیش تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ اے میرے سر تاج! تجھے جوانی میں کیوں موت آگئی۔ تیرے وسیع و عریض مرمریں محلات میں میں کب تک اکیلی زندہ رہ سکوں گی؟ تجھے اس کمسن بچے پر بھی رحم نہ آیا۔ آہ! یہ بچہ، بدبخت والدین یعنی تیری اور میری محبت کی نشانی!"

وہ پڑھتے پڑھتے رک جاتا ہے اور کرشسس پر ایک نازک مگر تحیر آمیز نگاہ ڈالتا ہے بالآخر کہتا ہے "تو اور یہ مجھے دکھائیے!"

"آہ! تو نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے! چلا آ۔ جلدی جلدی میرے پیچھے چلا آ!"

وہ ایک دوسرا دروازہ کھولتے ہیں——

دوسرا کمرہ چوکور ہے۔ ایک دریچہ جس میں سے تمام مناظر قدرت نظر آتے ہیں اسے روشن کئے ہوئے ہے۔ اس کے وسط میں ایک میز پہ سرخ مٹی کا ڈھیر ہے اور ایک گوشہ میں ایک خمیدہ کرسی پہ ایک برہنہ اندام لڑکی آرام کر رہی ہے۔

"یہاں پہ تو اندرومیدہ، زاغوس اور سوریہ دیوتا کے گھوڑوں کے بت بنایا کرنا مجھے معلوم ہے وہ بت تو فقط اپنی تفنن طبع کے لیے تخلیق کرے گا۔ اور ان سب بتوں کو اپنی موت سے پہلے خود ہی توڑ ڈالے گا۔"

"یہ کمرہ تو فی الحقیقت ایک کاشانہ نشاط ہے!" دماطریس دھیمی آواز میں کہتا ہے اور اپنی پیشانی کو ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

اتنے میں کرشسس ایک دوسرا دروازہ کھولتی ہے۔

تیسرا کمرہ وسیع اور گول ہے۔ ایک دریچہ جو تمام نیلگوں آسمان کا آئینہ دار ہے اسے روشن کیے ہوئے ہے۔ اس کی دیواریں کانسی کی جالی جس سے مخفی سازندوں کی ہوئی نغمہ ریز موسیقی ہر وقت مترشح رہتی ہے، سے مزین ہے۔ پرے ایک دیوار سے لگے ہوئے سبز مرمریں تخت پہ ایک ننگ دھڑنگ لڑکی خاموش بیٹھی ہے۔

"چلا آ۔ چلا آ۔" کرشنس تکرار کرتی ہے اور دونوں ایک اور دروازہ کھولتے ہیں۔

چوتھا کمرہ پست بام، نیم روشن، طبی اصولوں سے آراستہ اور مثلث نما ہے۔ اس کے اندر فرش سے چھت تک بھاری بھر کم ملبوسات اور سموری لبادے اس نزاکت اور صفائی سے معلق نظر آتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں برہنگی وجدان پہ گراں نہیں گذرتی ہے آفرین ان مائلِ محبت آشفتہ سروں کو جنھوں نے فرطِ جنوں کے باوجود اس خوش اسلوبی سے اپنے ملبوسات دیواروں پہ آویزاں کیے۔ جب دروازہ بند کر دیا جاتا ہے تو وہ تمام منظر غائب ہو جاتا ہے۔ کوئی دریچہ نہیں ہے، یہ دنیا سے الگ تھلگ ایک مختصر دنیا ہے کہیں کہیں سیاہ سرو کے آویزاں خوشوں سے قطراتِ عطر ٹپک ٹپک کر فضا کو مہکا رہے ہیں۔ یہ کمرہ ان سات مخفی چراغوں کے نور سے روشن ہے جو سات رنگا رنگ ابرقی چوکھٹوں سے چھن چھن کر بوقلموں رنگینیوں کے جلو میں پیدا ہوتا ہے۔

"تو نے دیکھا ہمارے اس حجرۂ خاص کے تینوں گوشوں میں تین مختلف پلنگ ہیں؟" نوجوان عورت نے ملائم اور شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔

ساطرکیس جواب میں خاموش رہتا ہے۔ مگر اپنے آپ سے دل ہی دل میں سوال کرتا ہے: "کیا یہی منتہائے آرزو ہے؟ کیا وجودِ انسانی کا یہی حقیقی انجام ہے؟ کیا میں نے وہ تین کمرے اسی لیے عبور کیے تھے کہ میں بالآخر اس کمرہ خاص میں پہنچ کر ٹھہر جاؤں؟ کیا میں عشق و محبت کی ایک سرشار رات اس نشاط خانہ میں جو بادی النظر میں قبر کی ایک وسعت یافتہ شکل معلوم ہوتا ہے، گذار کر باہر زندہ نکل سکوں گا؟"

اس سے پہلے کہ وہ ان اضطراب انگیز سوالات کا جواب اپنی روح سے پا سکتا
کرشتیس بول پڑتی ہے۔

"محبوب من! تو نے مجھے بلایا تھا۔ میں اب آ گئی ہوں۔ میری طرف دیکھ ....!"

وہ اپنی بانہیں ایک ساتھ اٹھاتی ہے اور پھر اپنے ہاتھ سر پر رکھے کہنیاں بڑھائے مسکراتی ہے۔

"میرے محبوب! میں تیری ہوں — اوہ، ذرا رک جا۔ اتنی جلدی نہیں۔ میں نے تجھے گیت سنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں پہلے گاؤں گی!"

اور وہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر اسی اور فقط اسی کے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ وہ سیاہ رنگ کی چمڑی چپلیں پہنے ہوئے ہے۔ نیلے موتیوں کی چار چار لڑیاں اس کے پیروں سے لپٹی ہوئی ہیں۔ اس کے ہر ناخن پا پر گہرے سرخ رنگ کے ہلالی نشان بنے ہوئے ہیں۔ سر کو اپنے کاندھے کی طرف ڈھلکائے ہوئے وہ اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ بائیں ہاتھ کی انگلیاں مارتی ہے اور اپنے کولہوں کو خفیف سی جنبش دیتی ہے۔

"میں نے رات کو اپنے پلنگ پر اسے ڈھونڈا جو میری جان کا پیارا ہے۔
میں نے اسے ڈھونڈا پر نہ پایا۔
اے یروشلم کی بیٹیو! میں تم کو قسم دیتی ہوں کہ اگر میرا محبوب تم کو مل جائے
تو اس سے کہہ دینا کہ میں عشق کی بیمار ہوں۔"

"آہ، ڈماطریس! یہ ہے نغمۂ نغمات، غزل الغزلات۔ میرے وطنِ مالوف کی بیٹیوں کی مناجاتِ عروسی!"

"میں سوتی ہوں پر میرا دل جاگتا ہے۔"
شاید میرے محبوب کی آواز دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔
ہاں، میرے محبوب کی آواز! دیکھ وہ آ رہا ہے!

پہاڑوں پر سے کودتا اور ٹیلوں پر سے پھاندتا ہوا آرہا ہے۔
میرا محبوب مانندِ آہو ہے۔
دیکھ وہ ہماری دیوار کے پیچھے کھڑا ہے۔
وہ جھنجریوں سے تاکتا ہے۔
میرے محبوب نے مجھ سے باتیں کیں اور کہا:
اُٹھ میری پیاری! میری نازنین! چلی آ۔
کیونکہ میرا سر شبنم سے تر ہے۔
اور میری زلفیں رات کی بوندوں سے بھری ہیں۔
سو اُٹھ میری پیاری، میری جمیلہ! چلی آ!
کیونکہ دیکھ جاڑا گزر گیا۔
مینہ برسا اور نکل گیا۔
زمین پر گلوں کی بہار ہے۔
پرندوں کے چہچہانے کا وقت آپہنچا۔
اور ہماری سرزمین میں قمریوں کی آواز سنائی دینے لگی۔
سو اٹھ میری پیاری! میری جمیلہ! چلی آ!"
اور وہ اپنا نقاب اتار پھینکتی ہے اور اب اس کے بدن کا آخری لباس اس کی کمر اور ٹانگوں پر نظر آتا ہے!
"میں تو کپڑے اتار چکی اب پھر کیسے پہنوں؟
میں تو اپنے پاؤں دھو چکی اب ان کو کیوں میلا کروں؟
میرے محبوب نے اپنا ہاتھ سوراخ سے اندر کیا۔
اور میرے دل و جگر میں اس کے لیے جنبش ہوئی۔
میں اپنے محبوب کے لیئے دروازہ کھولنے کو اٹھی۔

اور میرے ہاتھ سے مُر ٹپکا۔
اور میری انگلیوں سے رقیق مُر ٹپکا۔
اور قفل کے دستوں پر پڑا۔
"اسے اپنے منہ کے چوموں سے مجھے چومنے دو!
اس نے اب اپنا سر پشت کی جانب ڈھلکا دیا ہے اور آنکھیں بند کر لی ہیں۔
"میرے محبوب! مجھ کو پیار کرو، مجھ کو پیار کرو"
کیونکہ میں عشق کی بیمار ہوں۔
دیکھ میرے محبوب کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہے۔
اور اس کا داہنا ہاتھ مجھے گلے سے لگاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:
اے میری زوجہ! میری پیاری! تو نے میرا دل لوٹ لیا۔
اپنی ایک نظر سے۔ اپنی گردن کے ایک طوق سے تو نے میرا دل غارت کیا۔
اے میری پیاری! میری زوجہ! تیرا عشق کیا خوب ہے!
تیری محبت مے سے زیادہ لذیذ ہے
اور تیرے عطروں کی مہک ہر طرح کی خوشبو سے بڑھ کر ہے۔
اے میری زوجہ! تیرے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے۔
شہد و شیر تیری زبان تلے ہے۔
تیری پوشاک کی خوشبو لبنان کی سی ہے۔
میری پیاری، میری زوجہ ایک مقفل باغیچہ ہے۔
وہ محفوظ سوتا ہے اور سر بمہر چشمہ ہے۔"

"اے بادِ شمال بیدار ہو! اے بادِ جنوب چلی آ!
میرے باغ سے گذر تاکہ اس کی خوشبو پھیلے۔"

اس نے اب بازوؤں کو پھیلا کر منہ اوپر کی طرف اٹھا دیا ہے۔

"میرا محبوب اپنے باغ میں آئے۔
اور اپنے لذیذ میوے کھائے۔
میں اپنے باغ میں آیا ہوں، اے میری پیاری! اے میری زوجہ۔
میں نے اپنا مُر اپنے بلسان سمیت جمع کر لیا۔
میں نے اپنا شہد چھتے سمیت کھا لیا،
میں نے اپنی مے دودھ سمیت پی لی ہے۔"

"نگین کی مانند مجھے اپنے دل میں لگا رکھ
اور تعویذ کی طرح اپنے بازو پر۔
کیونکہ عشق موت کی مانند زبردست ہے۔"

اب وہ اپنے بے حرکت کولھوں پر جسم کو موڑتی ہے تو اس کے پاؤں جامد نظر آتے ہیں اور گھٹنے ساکن اور باہم پیوست۔ ملفوف ٹانگوں کے اوپر اس کا چہرہ اور اس کے دونوں پستان اس کے گلدانِ ملبوس میں آراستہ تین بڑے بڑے گلابی پھول معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فرطِ جوش میں ناچ رہی ہے۔ اپنے کاندھوں اور سر کو جنبشیں دیتی ہوئی اور اپنی باہم پیوستہ باہوں کو لہراتی ہوئی۔ وہ اپنے جسم کی رہی سہی ستر پوشیوں سے بیزار اور باقی ماندہ پسیدیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے بیتاب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی سانس پھول رہی ہے۔

وہ اپنا منہ بند کرنا چاہتی ہے مگر نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے لبوں کو اور کھولنا چاہتی ہے مگر نہیں کھول سکتی۔ اک موجِ التہاب ہے جو اس کے رخساروں کو سُرخ سُرخ تر کیے جا رہی ہے۔

گاہے اس کی آپس میں الجھی ہوئی مخروطی انگلیاں چہرہ پر سایہ افگن ہیں گاہے اس کی سیمگوں باہنیں فضا میں لہرا رہی ہیں۔ ایک تموجِ تلطف ہے جس کے سامنے سپر انداز ہو کر وہ زمین

پر لیٹ جاتی ہے اور ایک طویل جیلہ جو سلوٹ اس کے اٹھے ہوئے کاندھوں کے درمیاں نمودار ہے۔ بالآخر وہ ہانپتی ہوئی پھریرے کو چند آوارہ بالوں سے دولہن کی طرح چھپا کر اس منقش بروچ کو کھول دیتی ہے۔ جو اس کے گوہریں پٹکے کو کمر پر سنبھالے ہوئے ہے۔ چشم زدن میں اس کے جمال رعنا کی رہی سہی مخفی دلفریبیاں بھی بے نقاب ہو جاتی ہیں....

وہ ماطر تبس اور کرائسس....

ان دونوں کی اولین ہم آغوشی فوراً ہی اس قدر مکمل، اس قدر بے عیب اور اس قدر ہم آہنگ ثابت ہوتی ہے کہ وہ بے حرکت پڑے پڑے کافی دیر تک ایک کیفِ گوناں گوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ کرائسس کا ایک پستان اس بازو کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے۔ جو اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اس کی ایک ران دو ٹانگوں کے نرغہ میں آئی ہوئی سلگ رہی ہے اور دوسری جو اوپر ہے اور قدرے الگ الگ، اس ہیجان خیز اور بے پایاں آرزوئے وصل کے لیے تڑپ رہی ہے جیسے وہ دونوں سردست آسودہ نہیں کرنا چاہتے۔ سب سے پہلے ان کے مرتعش ہونٹ ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی مجنونانہ دھن میں باہم ٹکرا کر پیوست ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو مدہوش و بدمست کر رہے ہیں انتہائی اشتعال انگیز انداز میں، اپنی دہکتی ہوئی تشنۂ آرزو جوانیوں کو آسودہ کیے بغیر۔

دنیا میں کوئی شے اتنی زیادہ قریب اور اتنے غور سے نہیں دیکھی جاتی جتنا رخ محبوب ابھر آئندہ بوسہ کی جذب آفریں توقع پر کرائسس کی آنکھیں بے حد بڑی بڑی نظر آنے لگتی ہیں جب وہ انہیں بند کرتی ہے تو دو متوازی تہیں ہر پپوٹے پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ اور ایک خفیف زرد موج اس کی پلکوں اور رخساروں کے درمیان کھیلنے لگتی ہے۔ جب وہ آنکھیں کھولتی ہے تو ریشمیں تار کی طرح ایک لطیف سبز رنگ کا حلقہ لامبی خمیدہ پلکوں کے زیر سایہ بے انداز طور پر پھیلنے والی کالی اور اتھاہ پتلی میں ایک نئی جھلک اور ایک نیا رنگ پیدا کر دیتا ہے ننھا سا سرخ گوشہ جس سے آنسو بہتے ہیں دفعتہً کانپنے لگتا ہے۔

بوسہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کرائسس کی زبان شہد اور دودھ کی مرکب نہیں ہے جیسا کہ الہامی کتاب میں لکھا ہے بلکہ وہ زندگی سے بھرپور ایک سحر انگیز اور تیز رو پانی ہے۔ آفت کی پرکالہ یہ زبان ہر آن ایک نیا انداز اختیار کر رہی ہے۔ ابھی سمٹ رہی ہے ابھی پھیل رہی ہے، یہ ہٹی۔ وہ بڑھی۔ کبھی تن کر بقچہ گل بن گئی کبھی نرم ہو کر پھول کی پنکھڑی کی صورت اختیار کر گئی۔ بڑے انہماک اور بڑی ہوشیاری سے کرائسس اس میں ہر لحظہ ایک نئی لطف انگیز نزاکت پیدا کر رہی ہے —— پھر کرائسس کی لمس انگیز دست درازیاں ہیں کہ ایک قیامت برپا کر رہی ہیں۔ اس کی مشاق انگلیوں کی پوریں اس کے جسم کے حصہ حصہ میں مسلسل پیوست ہوئی جا رہی ہیں اور شیریں خلشوں کا ایک طوفان ہے جس کی تندی اور تیزی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ وہ کہا کرتی ہے کہ وہ فقط اس وقت خوش ہوتی ہے، جب آرزوئے وصل اس کے انگ انگ جلا رہی ہوتی ہے یا جب اس کا بدن خستگیٔ تسکینِ نفس سے چور چور ہوتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کا درمیانی عرصہ اسے ایک عذاب معلوم ہوتا ہے۔ بالآخر جب اس کا طلب گار اسے دعوتِ تلطف دیتا ہے تو وہ اسے اپنی پھیلی ہوئی باہوں سے پرے پھینک دیتی ہے، باوجودیکہ اس کی رانیں آپس میں مل مل جاتی ہیں اور ہونٹ لرزاں اور مرتعش نظر آتے ہیں۔ دماطریس آخر کار اسے جبراً قابو میں لاتا ہے۔

قدرت کا کوئی منظر —— خواہ وہ افق مغرب پر شعلہ افشانیوں سے متعلق ہو، خواہ تلاطم بحر سے، نخلستان کا ہو یا آسمان پر رواں دواں گرج دار بادلوں کا، سراب نظر کا پیدا کردہ ہو یا سمندر کی ہیبت ناک طوفان خیزیوں کا اس قدر جاذب نظر اور لائق ستائش نہیں ہوتا جس قدر ایک عورت کا آغوشِ محبوب میں پڑے پڑے جستجوئے کیف میں ہر لحظہ اپنے انداز سپردگی میں ایک نیا حسن، ایک نیا روپ پیدا کرنے کا منظر۔ چند ہی لمحوں میں کرائسس ایک استعجاب انگیز ہستی بن جاتی ہے۔ اس کا جسم اٹھتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔ گدے پر ایک کہنی ٹکا کر وہ تکیئے کے ایک کونے کو اس طرح بھینچتی ہے گویا وہ جانکنی کی حالت میں ہے اور سر کو پیچھے کی طرف ڈھلکا

کر وہ تیز تیز سانس لینے لگتی ہے۔ ایک متکیف نگاہ اپنے اندر تشکر و امتنان کی ایک خمار آگیں اور ہوش ربا دنیا لیے ہوئے اس کی آنکھوں سے ابھرتی ہے۔ اس کے رخسار تمتما رہے ہیں، دو پسندیدہ عضلاتی لکیریں کان اور کندھے کے قریب سے ابھر کر اس کے بائیں پستان کے نیچے باہم مل کر پستان کو ایک پھل کی طرح اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔

ایک نسوانی پیکر کو دیویوں کے سے بے پایاں جوش و خروش کے ساتھ مچلتے دیکھ کر، ایک انسانی جسم کے حیرت ناک قلبِ ماہیت پر، اس کی مافوق الانسانی اینٹھن پر جس کی پیدائش کا باعث خود اس کی ذات ہے، جسے وہ نہایت آزادی سے حسب منشا دباتا اور ابھارتا ہے اور جو ہزار دیں بار بھی اسے حیران و ششدر کر دینے کا باعث بنتی ہے — دماقریس ایک مذہبی خوف سے کانپنے لگتا ہے۔

اس کی آنکھوں کے زیر سایہ زندگی کی تمام تخلیقی قوتیں مجتمع ہو کر کاہشِ آفرینش میں محو و منہمک ہیں۔ پستانوں پر مامتا کی پر وقار عظمت کا رنگ چھا رہا ہے اور ایک عورت کا مقدس رحم امید کی دولت سے معمور ہو چکا ہے۔"

ہیجان

سمندر اور دیوی کے باغات پر چاندنی محیط تھی۔ ملیتا — وہی نازک بدن، شوخ لڑکی جسے چند لمحوں کے لیے دماطرآیس نے اپنی آغوش میں لیا تھا اور جو اسے بعد میں ہیننگو شمارس کے پاس لے گئی تھی۔ کافی دیر تک اس عورت کے پاس بیٹھی رہی۔ شمارس پالتی مارے اب بھی رنجیدہ اور غصہ میں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"تو اس شخص کا پیچھا کرنا چھوڑ دے۔" وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

"میں تو کا پیچھا کروں گی اور ضرور کروں گی۔ دیکھتی نہیں وہ چلا بھی گیا اور میں نے اسے بتایا تک نہیں کہ پھر کب ملاقات ہوگی۔ حد ہوگئی الوداعی معانقہ تک نہ ہوا۔ میں تو اس کے پیچھے جا رہی ہوں۔ جلد واپس آجاؤں گی۔"

"خبردار ایسا نہ کرنا۔ اسی میں تیری بھلائی ہے۔ جو عورتیں بھی اس سے ایک بار مل چکی ہیں اب تک اپنے جسم سہلا رہی ہیں۔ اس سے دوسری بار ملنا گویا موت کو دعوت دینا ہے!"

"شمارس! تم مجھ سے کیسی باتیں کر رہی ہو! میں جواب تک صرف ایک بار اس سے ملی ہوں بلا مبالغہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کی آغوش تلطفِ بے پایاں کا دوسرا نام ہے!"

"ناداں لڑکی! تو بھول رہی ہے کہ تو ابھی کمسن ہے، ناپختہ ہے۔ تو کیا جانے نفسانی خلفشار کسے کہتے ہیں؟ میری ننھی تو اسے بھول جا اور سمجھ لے کہ تیرا ایک ہجولی تھا جو بچھڑ گیا۔ شکر کر کہ تو ابھی گیارہ ہی برس کی ہے ورنہ چنگاریاں قاتل شعلے بن چکتیں اور لطفِ نشاط کی جگہ مرگ اذیت سے زیادہ قریب ہوتی —"

"جانے جواں ہو کر لوگ کیوں آزردہ خاطر نظر آتے ہیں!" بچی نے سراپا تجسس بن کر کہا۔ "یہاں کی تمام عورتیں ہر وقت کسی نہ کسی درد کا رونا روتی رہتی ہیں اور ایک میں ہوں کہ

آج تک ایک بار بھی نہیں روئی۔"

شمارس نے فرطِ جوش میں اپنے ہاتھ ملیتا کے بالوں میں گاڑ دیے اور اس کے بعد جانے وہ کیوں کراہنے سی لگی۔ اس کا کالا بکرا جو قریب ہی کھڑا تھا، اسے حالت کرب میں دیکھ کر اپنی طلائی زنجیر کو ہلانے لگ گیا۔

"چھوڑ دو یہ بیکار باتیں۔ میں یہاں کی مسرور ترین عورت کو جانتی ہوں۔ وہ ہے میری گہری سہیلی کرانسس جو، مجھے یقین کامل ہے، آج تک کبھی نہیں روئی!"

"وہ روئے گی!" شمارس نے جواب دیا۔

"بس بس، بند کر اپنی یہ بدگوئیاں، پیغامبرِ شر! اپنے وہ منحوس الفاظ واپس لے جو تو نے ابھی ابھی کہے ہیں۔ بدبخت و بدکلام عورت! میں پھر کہتی ہوں اپنے وہ مکروہ الفاظ واپس لے لے ورنہ میں تجھ سے نفرت کرنے لگوں گی۔"

بکری کو غم و غصہ کے خطرناک انداز میں پیچ و تاب کھاتی دیکھ کر بکرا بوکھلانے لگا اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بکری کو اپنے سینگوں پر اٹھا لے گا۔ چنانچہ ملیتا وہاں سے کچھ سوچے بغیر بھاگ کھڑی ہوئی اور کچھ راستہ طے کرنے کے بعد یکایک قہقہہ مار کر رک گئی کیونکہ اس کی نظر ایک ایسی جھاڑی پر پڑ گئی جس کی اوٹ میں ایک جوڑا نہایت مضحکہ خیز انداز میں محوِ اختلاط تھا۔ اگرچہ منظر ملیتا کو ایک آنکھ نہ بھایا مگر اس نے اس کے خیالات کی رَو کو ضرور بدل دیا۔ وہ اپنے گھر فوراً واپس دوڑ جانا چاہتی تھی مگر اب اس نے ارادہ بدل دیا اور دوسرے ہی لمحہ وہ ایک لمبے راستہ پر چل پڑی۔ وہ ابھی کچھ دیر اور اپنے گھر سے دور رہنا چاہتی تھی۔

رات کا سماں تھا۔ ہر طرف دلآویز چاندنی ہی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ باغات کی عشرت انگیز فضا میں نغمات گونج رہے تھے۔ دماطریس جا تا جاتا کافی رقم ملیتا کے ہاتھ میں تھما گیا تھا۔ ملیتا نے سوچا کہ یہ کمائی اسے کافی روز تک فکرِ معاش سے بے نیاز رکھے گی اسی لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بقیہ رات بیابان میں بیکار دیے کس پڑے رہنے والے مفلس اور قلاش مردوں کے ساتھ

ایک فیاض منش آوارہ حسینہ کا پارٹ ادا کرے گی چنانچہ اس انتہائی عجیب ترنگ کو دل میں بسے وہ بیاباں میں چکر کاٹنے لگی حتیٰ کہ چند ہی ساعتوں میں اسے دو تین عشاق سے سابقہ پڑ گیا اور وہ اپنے اس نئے اندازِ دلبری سے خوب خوب محظوظ ہوئی۔ یہ کھیل جس کا ہر ایکٹ اسے نئے ماحول اور نئے انداز میں کھیلنا پڑا اسے اس وجہ سے بھی بہت پسند آیا کہ یہ اس کی زندگی کا بالکل نیا تجربہ تھا۔ ایک نے اسے ستون سے لگا لیا، دوسرے نے اسے ایک بنچ پہ لٹایا اور تیسرے نے ایک درخت کا سہارا ہی کافی سمجھا۔ وہ آگے بڑھی تو اسے ایک سپاہی نے پکڑ لیا جو ایک درخت کے سائے میں کھڑا تھا۔ اس آشفتہ سر سپاہی کا انداز محبت باغات کے اس دیوتا کا سا تھا جو پھول توڑنے والی لڑکیوں کو اپنی آغوش میں لے کر رقص کرتا اور اس رقص کے دوران میں ہی پیار کی تمام منازل طے کر جاتا۔ غرضیکہ سپاہی سے مل کر وہ ایک بے پناہ احساس فتح مندی سے سرشار ہوئی۔

وہ اب ایک نخلستانی راہ گزر پہ گامزن تھی۔ چلتے چلتے اچانک اس کی ملاقات میکائیلس نامی ایک لڑکے سے ہو گئی جو جنگل میں گم گشتہ راہ معلوم ہوتا تھا۔ ملیتا نے اس سے ملتے ہی اس کو رہبری کی پیشکش کی جو اس نے فوراً ہی قبول کر لی اور اس طرح ملیتا کو اسے اور بھی گمراہ کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اسے حسبِ منشا استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اور بلاشبہ اپنی اس خواہش کی تکمیل میں وہ بہت کامیاب رہی۔ میکائیلس کو ملیتا کا ہم نفس بننے میں زیادہ دیر نہ لگی اپنی بچگانہ استطاعت کے مطابق اس نے کم سن حسینہ کی نازک اداؤں اور معشوقانہ صلاحیتوں سے مستفید ہونے کی کوشش کی۔ چنانچہ از نشاطِ باہمی کی حدود سے نکل کر وہ دونوں ایک دوسرے کے ہمسفر نظر آنے لگے اور شانہ بشانہ سنسان اور ویران راستوں پہ چلنے لگے۔ اس سے قبل کہ وہ دونوں اپنے ارد گرد کے بے رونق ماحول سے متاثر ہوتے وہ جنگل عبور کر چکے تھے اور اب سمندر کے سامنے کھڑے تھے۔

وہ اب ایک ایسے مقام پہ پہنچ چکے تھے جو ان مخصوص خلوت ناک گوشوں سے دور تھا،

جہاں قورطینز ایئس عموماً اپنے قابلِ احترام بلکہ مقدس پیشہ کی رسومات ادا کرتی تھیں۔ اس پسندیدہ اور دلکش مقام کی بجائے قورطینز اوئس نے ان تنگ و تاریک گوشوں کو کیوں منتخب کیا تھا وہ دونوں نہیں بتا سکتے تھے جنگل کا وہ حصہ جہاں عموماً مجمع دیکھنے میں آتے تھے رفتہ رفتہ ایک بدنام و رسوا شاہراہ بن گیا تھا۔ اس کے ارد گرد لاتعداد پگڈنڈیاں اور درختوں کے جھنڈ ہی جھنڈ نظر آتے تھے۔ حیرت تھی کہ اس مقام پر جہاں وہ کھڑے تھے اور جو ہر لحاظ سے جاذبِ قلب و نظر تھا تنہائی ہی تنہائی تھی۔ بہر کیف وہ دونوں آگے بڑھے۔

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے میکائیلس اور ملیتا خراماں خراماں اس عوامی سیرگاہ کی حدود میں داخل ہو گئے جس کی ایلوسے کے درختوں کی باڑ بیابانِ الفروُدت اور باغات پیشولئے اعظم کے درمیان ایک برائے نام خطِ تقسیم کا کام دیتی تھی۔ پارک بھی ویراں پڑا تھا مگر اس کی کل پوشش ویرانیاں خواہ مخواہ ان کے معصوم دلوں کو طرح طرح کی بچکانہ شرارتوں پہ اکسا رہی تھیں۔ ادھر ادھر بیکار تکنے کے بعد وہ ایک دیوار پہ چڑھ گئے جو اینٹ اور پتھر کی بجائے باہم الجھے ہوئے گھنے پودوں سے تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ اس دیوار پر ان کا چڑھنا تھا کہ ان کی نظر بحیرہ روم پہ پڑی جو بالکل ہی ان کے قدموں میں موجزن معلوم ہوتا تھا۔ اس کی لہریں چھوٹی چھوٹی تشنہ کنار ندیوں کی طرح ساحلِ بحر سے سر پیٹ رہی تھیں چنانچہ ان سے نہ رہا گیا۔ دیوار سے کودے اور سینے کمر تک گہرے پانی میں پہنچ کر آپس میں چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ وہ ہنستے، شور مچاتے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ گاہے ملیتا نیچے ہوتی اور گاہے میکائیلس۔ عجیب و غریب طریقوں سے وہ ایک دوسرے ہم آغوش ہو رہے تھے۔ مگر یہ ہم آغوشیاں ایسے کھیلوں کی مانند تھیں جن کی نامکمل مشق کی گئی ہو۔ دونوں کو خاک بھی لطف نہ آیا اور بالآخر وہ تھک ہار کر پانی سے باہر آ گئے اور اپنی مینڈکوں کی سی پتلی پتلی ٹانگوں سے اچھلنے کودنے شب رنگ ساحل پہ چھٹکی ہوئی چاندنی کا مزہ لینے لگے۔ ریتلے ساحل پہ قدموں کے چند نشانات نے انہیں پیش قدمی پہ اکسایا تو وہ ان نقوشِ پا پہ ہی چلنے لگے۔ بلکہ دوڑنے لگے ایک دوسرے کو باری

باری دامن کھینچتے ہوئے۔ وہ بھاگے جا رہے تھے اور ان کے واضح سایوں سے ساحل طرح طرح کے نقشے بن رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس طرح چلتے چلتے وہ دونوں کہاں اور کدھر نکل جائیں گے جب کہ دور دور تک انہیں کسی ذی روح شے کا نشان نظر نہ آتا تھا۔

ملیتا یکایک خوفزدہ ہوکر بولی "ارے وہ دیکھو!"

"تجھے کیا نظر آرہا ہے؟"

"ایک عورت!"

"ایک قورطینزہ۔ بدذات کہیں کی! معلوم ہوتا ہے کم بخت گھر سے باہر ہی سو گئی!"

"نہیں، نہیں، وہ قورطنزہ نہیں!" ملیتا نے اپنے سر کو زور سے ہلا کر کہا۔ "بابا نہ! میں اس کے قریب نہ جاؤں گی!"

"میرا خیال ہے وہ قورطینزہ ہی ہے!"

"نہیں، وہ قورطینزہ نہیں ہے، میکائیلس! وہ طاؤنی ہے، پیشوائے اعظم کی زوجہ ذرا غور سے دیکھنا وہ سو نہیں رہی۔ مجھے اس کے نزدیک جانے سے ڈر لگتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ آؤ بھاگ چلیں یہاں سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرا جی گھبرا رہا ہے!"

میکائیلس پنجوں کے بل تین قدم بڑھا اور بولا "تو ٹھیک کہتی ہے وہ سو نہیں رہی۔ وہ بیچاری تو مردہ پڑی ہے!"

"مردہ؟"

"ہاں! اس کے سینہ میں ایک پن پیوست ہے!"

میکائیلس نے پستان میں گڑے ہوئے پن کو نکالنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو ملیتا مارے خوف کے کانپ گئی

"نہ نہ۔ اسے مت چھوؤ! وہ مقدس ہے اسے مت ہاتھ لگاؤ — رک جاؤ — تم

اس کی نگہبانی کرو میں ابھی جا کر امداد کے لیے شور مچاتی ہوں — میں ابھی اس واقعہ کی اطلاع دوسروں کو کرتی ہوں" — یہ کہہ کر وہ اپنی پوری قوت سے بھاگی اور درختوں کے سایوں میں گم ہو گئی۔

میکابیلس جواب اکیلا رہ گیا تھا، کانپتا ہوا نوجوان عورت کی لاش کی طرف بڑھا پہلے اس نے زخمی پستان کو اپنی ایک انگلی سے چھیڑا لیکن اس کے فوراً ہی بعد خوف سے گھبرا کر یا یہ سوچ کر کہ کہیں اسے قاتل نہ سمجھ لیا جائے وہ بھی دم دبا کر بھاگ پڑا اس ارادہ کے ساتھ کہ وہ اس واقعہ کی خود کسی کو خبر نہ کرے گا۔

اور شفاف چاندنی میں طاؤنی کی بے جان جرمنگی اپنی بے کسی پر خون کے آنسو روتی رہی۔

کافی دیر تک بعد جنگل یکایک سنسنی خیز سرگوشیوں سے گونجنے لگا۔ ہر طرف سے درختوں اور جھاڑیوں کے بیچوں بیچ ایک ہزار قورطیز ایئیں دہشت زدہ بھیڑوں کی طرح آپس میں کاندھے رگڑتی ہوئی آہستہ آہستہ نمودار ہو رہی تھیں، تمام ہجوم پر ایک سی دہشت طاری تھی۔ کوئی بھی لاش کو سب سے پہلے دیکھنے پر آمادہ نہ تھی۔ ایک زبردست شور تھا جو ایک ایک ہزار دں پر مشتمل گاہے بلند ہو جاتا تھا اور گاہے بالکل ختم۔ درخت کے نیچے پڑی ہوئی مردہ لاش کو سلام کرنے کے لیے پہلے ایک ہزار باہیں ہیبت سے کانپتی ہوئی بلند ہوئیں اور ان کے بعد ایک ہزار اور —

"دیوی! ہم پہ رحم کر!" آوازیں گونجیں۔ "اے پوتر دیوی! اگر تجھے انتقام لینا ہی مقصود ہے تو ہمیں ضرور بخش دے، ہماری زندگیوں پہ رحم کر۔"

رُعبِ حاکمیت سے بھرپور ایک آواز ابھری۔ "سب معبد چلو!"

"معبد کی طرف ۔۔۔ معبد کی طرف" دوسری قورطیز ایئں چلائیں۔

ہیجان زدہ ہجوم میں گھبراہٹ کی ایک اور لہر پیدا ہوئی اس عورت کو جو آنکھیں کھولے اور باہیں ڈھلکائے پڑی تھی ایک بار پھر دیکھنے کی ہمت نہ پا کر تمام کی تمام قورطیز ایئں جن میں سپید بھی تھیں اور سیاہ فام بھی، مشرقی بھی تھیں اور مغربی بھی، ملبوسات فاخرہ والی

بھی تھیں اور چیتھڑوں والی اور ننگی بھی ۔— درختوں کے درمیاں منتشر ہو گئیں اور مختلف پگڈنڈیوں راستوں اور سڑکوں پر ہوتی ہوئیں بالآخر اپنے اپنے گھروں کے سامنے آ جمع ہوئیں۔ وہاں سے جلوس کی شکل میں وہ پھر روانہ ہو پڑیں حتیٰ کہ وہ سب اس مرتفع گلابی زینۂ مرمریں پر چڑھ گئیں جو آنے والے دن کی صبح کے سرخی مائل دھندلکے میں چمک رہا تھا۔ وہ دفعتہً بابِ معبد کے کانسی کے کواڑوں پر بے تحاشہ مکے مارنے لگیں اور ساتھ ہی طفلانہ انداز میں چلائیں "کھولو.... دروازہ کھولو... ہمیں اندر آنے دو!"

ھجوم

اس صبح کو جو بخیت کے ہاں برپا شدہ ہنگامہ بدمستی کے خاتمہ پر طلوع ہوئی، اسکندریہ میں ایک خاص واقعہ، ہوا یعنی بارش ہوگئی۔ فوراً ہی ہر شخص برکھا کا خیر مقدم کرنے کے لیے اپنے دروازہ سے باہر نکل آیا حالانکہ کم آفریقی ممالک میں ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

یہ مظہر قدرت یعنی بارش پر شور نہ تھی باوجودیکہ موٹے موٹے قطرات آب ایک گرج دار بادل کی بلندی سے فضا کو چیرتے ہوئے ٹپک رہے تھے عورتوں کی چھاتیاں اور جلدی میں گندھے ہوئے بال بارش سے بھیگے جا رہے تھے۔ مرد نہایت دلچسپی سے آسمان کو تک رہے تھے اور بچے قہقہے مارتے ہوئے کیچڑ میں کلیلیں کر رہے تھے۔

آہستہ آہستہ بادل روشنی میں غائب ہوگیا اور نتیجۃً مطلع ایک بار پھر بالکل صاف ہو گیا۔ دوپہر کے کچھ دیر بعد سورج کی شعاع ریزیوں میں تمام کیچڑ خشک ہو کر ایک بار پھر دھول میں تبدیل ہوگئی۔ بارش اگرچہ تھوڑی دیر ہوئی لیکن سارے شہر میں ایک نئی رونق اور ایک نئی زندگی پیدا کر گئی۔ عظیم احاطہ کی روشوں پر جگہ جگہ لوگ چھوٹے چھوٹے جھرمٹ بنائے محو نظارہ تھے اور عورتیں جا بجا گروہوں کی شکل میں کھڑی ایک دوسرے کو بآواز بلند پکار رہی تھیں۔ یہ سب کی سب تورطیز ایئں تھیں کیونکہ آج جبکہ الیفردوسی جشن کا تیسرا دن تھا، بستی کی تمام منکوحہ عورتیں ایک جلوس کی شکل میں معبد اسطارطہ یعنی اسطار طیون کی طرف رسومات عبودیت ادا کرنے کے لیے روانہ ہو چکی تھیں۔ اس لیے احاطہ میں ملبوسات زربفت اور سرمئی آنکھوں والی عورتوں کے سوا کوئی دوسری عورت نظر نہ آتی تھی۔

جوں ہی مرطو صبیلہ پاس سے گزری نیوطس نامی ایک نوجوان لڑکی نے جو متعدد دوسری

عورتوں سے ہم کلام تھی، اسے آستین سے پکڑ کر روک لیا۔

"اوہ، نکو! تو نے تو بخنیت کے یہاں مظاہرہ فن کیا ہو گا؟ تو وہاں کیا ہوا؟ لوگ کیا کرتے رہے؟ بخنیت نے اپنی چربی دار مولی گردن کو چھپانے کے لیے دوہرے کالر والا ہار تو پہن رکھا ہو گا؟ وہ چوبی سینے پہنتی ہے یا تانبے کے؟ کیا اس نے کنپٹی کے سپید بالوں پہ وسمہ لگا رکھا تھا یا نہیں؟ آ، ننھی پگلی، کچھ کہہ!"

"تو سمجھتی ہے میں یہی کچھ وہاں دیکھتی رہی؟ میں تو ضیافت کے بعد چلی آئی۔ میں نے اپنا مظاہرہ فن کیا، معاوضہ لیا اور اس کے فوراً بعد چل پڑی۔"

"اوہ! مجھے معلوم ہے تو اپنے آپ کو خراب نہیں کرتی۔"

میں کیوں گریباں چاک کرواتی اور پٹتی؟ نہیں، فلوطس، صرف امیر عورتیں ہی ان ہنگاموں میں شریک ہو سکتی ہیں۔ وہاں مجھ ایسی فاقہ مست اور مفلس نئے نواز کنواریوں کے لیے سوائے آنسوؤں کے کچھ نہیں رکھا۔"

"کبھی کپڑے ہی بچانا مقصود ہو تو انسان انہیں اپنے حجرہ آرائش میں اتار جائے۔ رہا پٹنے کا سوال تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ دوگنی فیس وصول کرنی چاہیئے۔ یہ تو نہایت تمہیدی اصول ہے۔ تو تم ہمیں کچھ نہ بتاؤ گی؟ اری نکو کچھ تو بتا۔ کوئی لطیفہ، کوئی مہم، کوئی نصیحت؟ ہمارے منہ میں پانی آرہا ہے۔ اگر تمہیں فی الواقعہ کچھ معلوم نہیں تو وہاں کا کوئی من گھڑت قصہ ہی سنا دے!"

میری دوست تھیاتو میرے بعد بھی وہاں رہی۔ جب میں سو کر اٹھی تو وہ اس وقت بھی واپس نہ آئی تھی۔ شاید جشن ابھی جاری ہے۔"

"وہ ختم ہو چکا ہے۔" ایک دوسری عورت بولی۔ "وہ رہی تھیاتو ــــ سر ایک دیوار کے پاس۔" تورطینز ابیں آن کی آن میں تھیاتو کی طرف بھاگیں مگر کچھ فاصلہ پہ پہنچ کر رک گئیں اور حیرت سے اُسے تکنے لگیں۔ تھیاتو جو ایک نہایت نرم لبادے میں جھومتی معلوم ہو رہی تھی اپنے بالوں میں الجھے ہوئے ایک خار دار پژمردہ گلاب کو نکالنے کی مسلسل کوشش میں

مشغول تھی۔ اس کے زرد لبادہ پر سُرخ اور سپید دھبے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ گذشتہ رات کی تمام خرمستیوں کا تختۂ مشق اس کو بنایا گیا تھا۔ اس کا تہہ دار لبادہ جیسے ایک کانسی کا بروچ اس کے بائیں کندھے پر سنبھالے ہوئے تھا، اس کی کر بند پیٹی سے باہر نکل ہوا تھا اور اس کے نوخیز دھڑکتے ہوئے سینہ کی پردہ پوشی سے عاری تھا۔ اس کے ایک پستان پر دو خراشیں نظر آ رہی تھیں مرطوقیبلہ کو دیکھتے ہی وہ اپنے اس مخصوص انداز میں قہقہہ زن ہوئی جس سے تمام اہل اسکندریہ مانوس تھے اور جس کی بدولت وہ لوگوں میں "مُرغی" کے لقب سے مشہور ہوئی تھی۔ اس کا قہقہہ انڈوں پر بیٹھی ہوئی مُرغی کی پیہم کڑکڑاہٹ تھی ایک آبشار سرخوشی تھی۔ جو کبھی اس کے حلق میں اتر جاتی کبھی ایک باریک اور تیز چیخ کی مانند اوپر کو اٹھتی اور یہ لحظہ بہ لحظہ بدلنے والا سلسلۂ آواز ایک فاتح مرغی کے خروش نشاط کی طرح طربناک موزونی کے ساتھ جاری رہتا "بیضہ مُرغ!" فلوطیس چلائی۔

لیکن مرطوقیبلہ نے اشارۃً کہا "آؤ تھیانو! تمہیں بستر پر لیٹ جانا چاہیئے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میرے ساتھ آؤ!"

تھیانو نے زور سے قہقہہ مارا اور پھر اپنی چھاتیوں کو سہلاتی ہوئی قدرے گلوگیر آواز میں چلائی "ہا ہا! آئینہ!"

مرطوقیبلہ نے مکرّر بے صبری سے کہا "چلو!"

"آئینہ چوری ہو گیا۔ چوری ہو گیا۔ چوری ہو گیا۔ آ ہا ہا ہا۔ میں اتنا پھر کبھی نہیں ہنس سکوں گی خواہ میں کتنی ہی لمبی عمر کیوں نہ پالوں۔ چرا لیا گیا۔ چرا لیا گیا آئینہ آ ہا ہا!"

مغنی لڑکی نے کوشش کی کہ وہ اسے وہاں سے کھینچ کر لے جائے مگر فلوطیس بات تاڑ گئی۔ چنانچہ اپنی بانہیں ہوا میں لہرا کر اس نے دوسری عورتوں کو پکارا "جلدی آؤ جلدی! ایک خبر ہے۔۔۔ بخیت کا آئینہ چوری ہو گیا!"

آن کی آن میں تیس تورطیزائیں نو نواز لڑکی کے گرد جمع ہو گئیں۔

"کیا ہُوا؟"

"کوئی بخیث کا آئینہ چرا لے گیا تھیا لو کہہ رہی ہے۔"

"کب؟"

"کس نے چرایا؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"اری تو نے رات وہاں کاٹی ہے تجھے تو معلوم ہونا چاہیئے۔ اگر تجھے خود پتہ نہیں چل سکا تو کیا کسی نے تجھے بتایا بھی نہیں؟ تھیا تو یاد کر، ذہن پہ زور دے!"

"اُف! مجھے تو کچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔ وہاں بیس سے بھی زیادہ لوگ تھے۔ مجھے تو رقص کے لیے بلایا گیا تھا مگر میں خاک بھی ناچ نہ سکی۔ سب کے سب رقص و سرود کے سے بیزار نظر آتے تھے۔ فرمائش ہوئی کہ میں رقصِ دنائی کی نقل اُتاروں چنانچہ میں دنائی کی طرح ناچنے لگی اور انہوں نے سکے مجھ پہ برسانے شروع کر دیئے وہ سب کے سب سکے بخیث اٹھا لے گئی۔۔۔ وہ سب کے سب بدمست و مدحوش تھے۔ سمجھیں؟ میں رونے لگی۔ تو انہوں نے مجھے سر کے بل کھڑا کر دیا۔ پھر ایک بڑے پیالہ سے اسی حالت میں مے نوشی پہ مجبور کیا۔ پیالہ شراب سے لبا لب تھا۔ اس میں سات مختلف شرابیں انڈیلی گئی تھیں۔ میرا تمام چہرہ شراب میں بھیگ گیا۔ ڈوب گیا۔ میرے تمام بال بھیگ گئے اور میرے سارے گلاب بھی!"

"ہاں، ہاں،" مرطوصیلہ نے مچل کر بات کاٹی "تیرے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیئے تھا۔ تو بہت شریر ہے۔ لیکن بتا آئینہ کہاں گیا؟ اسے کون لے اُڑا؟"

"وہی بات تو میں کہہ رہی تھی جب انہوں نے مجھے سیدھا کیا تو میرے کانوں میں شراب ہی شراب تھی۔ وہ لوگ بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ اور میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ اسی اثنا میں بخیث نے آئینہ منگوایا۔ وہ وہاں نہ تھا — ہا ہا ہا! کوئی اسے چُرا لے گیا تھا۔ ہا ہا ہا۔۔۔"

"وہ کون تھا؟ وہ کون تھا؟"

ظاہر ہے وہ میرا کام تو تھا نہیں۔ میری تلاشی لینے کی بھی ضرورت نہ تھی کیونکہ میں بالکل ننگی تھی۔ آئینہ درخمہ تو تھا نہیں کہ میں اسے اپنے پپوٹے میں چھپا لیتی۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ آئینہ میں نے نہیں چرایا — چوری کے الزام میں ایک کنیز کو مصلوب کر دیا گیا۔ غالباً وہی چور تھی۔ جب میری آنکھیں کھلیں تو وہ سب مجھ سے بے خبر تھے۔ موقع پاکر میں نے چند سکے اٹھا لیے۔ مرطوعسیلہ! اب میرے پاس پانچ دراخم ہیں۔ وہ تینوں کے لیے نئے کپڑے خریدنے کے سلسلے کافی ہیں.... ہا ہا ہا!"

آئینہ کی چوری کی خبر آہستہ آہستہ تمام احاطہ میں پھیل گئی۔ ہر قرطیسزہ مطمئن تھی کہ وہ قابلِ ملامت کام اس کا نہ تھا۔ ایک تجسس آمیز انتشار عورتوں کے تمام جمگھٹوں پر طاری تھا۔

"وہ یقیناً کسی عورت کا کام ہے۔" فلوطس نے کہا۔

"سنا ہے بخیت اپنے آئینہ کو نہایت حفاظت سے چھپا کر رکھتی تھی۔ چور اس کی تلاش میں خوب ہی بھٹکتا پھرا ہوگا۔"

"بخیت کے دشمن بھی تو بہت ہیں۔ کئی تو برسوں پرانے دشمن ہیں جو اس کی زندگی کے ایک ایک راز سے واقف ہیں۔ پہلے کسی نے نہایت صفائی سے بخیت کو گھر سے باہر جانے پر اکسایا ہوگا۔ جب وہ گھر سے واپس چلی گئی ہوگی تو وہ گھر میں گھسا ہوگا۔"

"غالباً وہ آئینہ اس چور نے اب تک قرضے بیباق کرنے کے لیے فروخت بھی کر دیا ہوگا۔"

"کیا خیال ہے یہ کام بخیت کے کسی دیرینہ عاشق نامراد کا تو نہیں؟ سنا ہے آج کل وہ مفلس و قلاش مزدوروں پر مہربان ہے۔ ممکن ہے ان میں سے کسی نے....؟"

"بہر کیف یہ کام کسی عورت کا ہرگز نہیں۔ آفریں اس پر جس نے یہ مہم سر کی!"

عین اسی لمحہ ایک اور نہایت ہیجان زدہ ہجوم احاطہ کی جانب کشاں کشاں چلا آرہا

تھا، تمام راہگیروں کی توجہ اس ہجوم پر مرکوز ہو گئی "کیا ہو گیا، خدایا خیر ہو"!
ہجوم کے افسردہ اور بے چین چہروں کو چھیڑتی ہوئی ایک پتلی آواز بلند ہوئی "پیشوائے اعظم کی زوجہ قتل کر دی گئی"!
ایک برق تھی جو اس انبوہ عظیم پر گری۔ لوگوں کو اس دلدوز خبر پر یقین نہ آتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ماننے کو تیار نہ تھا کہ الفردوسی تیوہار کے مبارک اور بابرکت ایام میں ایسی لرزہ خیز واردات پیش آ سکتی تھی جس کی پاداش میں دیار اسکندریہ پر تمام کے تمام دیوتا قہر و عتاب کی آگ برسا سکتے تھے۔ بایں ہمہ ہر کسی کی زبان پر یہی جگر خراش فقرہ تھا"
پیشوائے اعظم کی زوجہ مبارک قتل کر دی گئی! رسومات معبد روک دی گئیں!
یہ خبر آگ کی طرح پھیل رہی تھی۔ باغات معبد کے ایک مرتفع مقام پر نعش پائی گئی۔ بائیں پستان میں ایک پن پیوست ہے، زخم رس نہیں رہا ہے۔ قاتل نے تمام بال کاٹ لیے ہیں۔ ملکہ لطوخریت والا نشانہ چرا لیا گیا ہے۔
ایک دہشت تھی جو پھیل رہی تھی۔ ایک بدحواسی تھی جو ہر ذی روح پر طاری ہو رہی تھی۔ ہجوم لمحہ بہ لمحہ پھیل رہا تھا۔ شہر کی تمام مخلوق گھروں سے باہر آ چکی تھی۔ ہجوم کیا تھا ایک سمندر تھا سروں کا جن میں سے کچھ ننگے تھے اور دوسرے کلاہ بر داشتہ۔ وہ ایک بہت بڑا ریوڑ تھا جو اسکندریہ کے دھوپ میں نہائے ہوئے وسیع و عریض احاطے میں نیم روشن گلی کوچوں میں سے چلا آ رہا تھا۔
ایسا عظیم انسانی اجتماع اس سے قبل اس احاطہ میں صرف اس دن دیکھنے میں آیا تھا جب بطلیموسی اولیطر کو اس کی بیٹی برینیس کے حواریوں نے تخت سے اتار کر برینیس کی ملوکیت کا اعلان کیا تھا۔ بڑے بڑے سیاسی انقلابات اس بے حرمتی کے سامنے ہیچ تھے۔ جس کی وجہ سے شہر کی بقا خطرہ میں تھی۔ چشم دید گواہوں سے تفصیلات پوچھی جا رہی تھیں۔ عورتیں غم و غصہ میں کانپتی ہوئیں ہر نووارد کو نشانہ کی چوری کا حال بتلا رہی تھیں۔ ان میں جو زیادہ سمجھ دار تھیں وہ بڑے یقین کے ساتھ اس خیال پر مصر تھیں کہ دونوں جرائم کا ارتکاب

ایک ہی شخص کا کام ہے۔ مگر وہ تھا کون؟

وہ کنواریاں جنھوں نے کل ہی دیوی کے روبرو آئندہ سال کے لیے منتیں مانی تھیں اور قسم قسم کے ہدیے نذر کیے تھے یہ سوچ کر گھبرا رہی تھیں کہ کل والا تمام مظاہرہ اکارت گیا۔ وہ سر جھکائے رو رہی تھیں۔

ایک قدیم توہم آمیز عقیدہ کے مطابق ایسے دو جرائم کا ارتکاب ایک تیسرے زیادہ خوفناک وقوعہ کی تمہید ثابت ہوتا تھا۔ اب اس انبوہِ عظیم کو تیسرے وقوعہ کا انتظار تھا۔ آئینہ اور شانہ چرا لینے کے بعد سنگدل چور اور کیا کر سکتا تھا؟ ایک روح سوز ماحول جو بادِ جنوب کے اڑائے ہوئے ریتیلے غبار سے معمور تھا سناٹے میں آئے ہوئے ہجوم پر مسلط ہو رہا تھا۔

غیر محسوس طور پر جیسے وہ تمام ہجوم ایک واحد مجتمع ہستی بن گیا تھا، ایک ایسی شدید گھبراہٹ کی لہر سے کانپا جو بعد میں ایک زبردست دہشت کی شکل اختیار کر گیا۔ یکایک سب کی سب آنکھیں افق پر نظر آنے والے ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئیں۔

وہ مرکزِ نگاہ اس عظیم و مستقیم شاہراہ کا آخری سرا تھا جہاں سکندریہ اور کنا یک گیٹ ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے اور جہاں سے معبد اور احاطہ کے لیے راہ پھٹتی تھی۔ دلفریب نشیب کے بلند ترین مقام پر جہاں ایک سڑک آسمان کو چومتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، ایک دوسرا دہشت زدہ ہجوم نظر آیا جو رواں دواں، افتاں و خیزاں پہلے ہجوم کی طرف آ رہا تھا۔

"قرطینزاوُ! اے مقدس قرطینزاوُ!"

سب بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ کسی ایک کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر نئی آفت کے متعلق کچھ پوچھے۔ وہ لوگ ایک سیلابِ رواں کی مانند قدموں کے گرانبار شور کے جلو میں قریب پہنچے تو انہوں نے بازو آسماں کی طرف اٹھائے اور اس کے بعد افراتفری کا ایک ایسا عالم پیدا ہوا گویا کہ وہ سب کی سب ایک غنیم فوج سے حراساں تھیں

اب وہ پہچانی جانے لگی تھیں۔ ان کے بال ان کی کمربند پٹیاں اور ان کے ملبوسات ان کی اصلیت کا پتہ دے رہے تھے۔ دھوپ کی کرنیں ان کے طلائی جواہرات کو جگمگا رہی تھیں۔ وہ اب بالکل قریب تھیں۔ انہوں دفعتہً اپنے منہ کھولے اور سناٹا اور بھی مہیب ہو گیا۔

”ربۃ“ اندوینن کے سچے موتیوں والا ہار چرا لیا گیا۔۔۔“

حرمان و یاس میں ڈوبی ہوئی ایک کلبلاہٹ نے اس خبر کا استقبال کیا۔ ہجوم پہلے ایک لہر کی طرح پسپا ہوا، پھر آگے کو بڑھا، دیواروں سے ٹکرایا، سڑک پر پھیلا اور عورتوں کو اپنے نرغہ میں لے کر شاہراہ دراموس پر بہتا ہوا اس معبودہ باقی کی طرف چل پڑا جس کی بےحرمتی کی گئی تھی۔

جواب

وسیع احاطہ اس طرح خالی اور سنسان تھا جس طرح جوار بھاٹے کے بعد ساحلِ سمندر۔ مگر نہیں وہ مکمل طور پر خالی نہ تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت ابھی وہاں موجود تھے۔ وہی دو ہستیاں جو عوام الناس کی اس ناقابلِ بیان بے چینی اور ہیجان کا اصل سبب جانتی تھیں اور جو اپنی اپنی جگہ اس کا اصل سبب اور باعث تھیں یعنی کرسس اور دماطریس۔

نوجوان گودی کی ایک مرمریں نشست پر براجمان تھا۔ نوجوان عورت احاطہ کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ رہے تھے لیکن وہ ایک دوسرے کی موجودگی سے آگاہ تھے۔ پندارِ نفس میں سرشار اور آرزوئے وصل سے بے چین کرسس چمکیلی دھوپ میں محوِ خرام تھی۔

"تو جناب نے وہ کام کر ہی ڈالا!" وہ بآوازِ بلند گویا ہوئی۔

"ہاں تیرے حکم کی تعمیل ہو چکی!" نوجوان نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

وہ یکایک گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور اس کا دامن پکڑ کر نہایت جذبات آفریں انداز میں بولی "مجھے تجھ سے محبت ہے مجھے تجھ سے محبت ہے۔ احساسِ محبت میری زندگی کا بالکل نیا تجربہ ہے۔ میں نے اب جانا محبت میں مبتلا ہو جانا کیا شے ہے؛ میرے محبوب! اپنی بیمارِ محبت کو غور سے دیکھ اور یقین کر کہ تیری شیدا کرسس تجھے اس وعدہ سے کہیں زیادہ دینے پر آمادہ ہے جو اس نے دو روز پہلے تجھ سے کیا۔۔۔ اُف! مجھے معلوم نہ تھا کہ میں جس کے نزدیک کسی دوسرے کی آرزو کرنا اپنے پندارِ حسن کی توہین کے مترادف تھا تجھے دیکھ کر تجھے مل کر اس قدر بدل جائے گی۔ مجھے یاد ہے میں نے اپنا جسم چند لمحاتِ عیش کے لیے تیرے سپرد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اب ۔۔۔ اب تو میں اپنا وہ سب کچھ تجھ پر نثار کرنے کی آرزو مند ہوں جو دلکش اور حسین ہے۔

ہاں، اپنا وہ سب کچھ جو اچھوتا اور پاکیزہ ہے۔ میری زندگی کا تمام خلوص، میرے جمالِ رعنا کی تمام ساحرانہ جاذبیتیں، میری روح کی تمام پاکدامانیاں —— سب تیرے لیے ہیں۔ غور کر، سوچ! میں کیا ہوں؟ آہ، ہمارے وہ دن اور وہ راتیں دنیا کے معمولی شب و روز سے کس قدر مختلف ہوں گے، کس قدر نرالے ہوں گے! اُف! میرا دم گھٹ رہا ہے! میرے محبوب! دیکھ! میں رو رہی ہوں۔ میں نے اب جانا محبت میں اشکبار ہونا کسے کہتے ہیں؟ ہاں! —— اس کا مطلب ہے وفورِ شوق اور فرطِ انبساط میں دیوانہ ہو جانا —— تو میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتا؟ —— تو خاموش ہے مگر کیوں؟ آہ! چوم . . . مجھے پیار کر!"

دماطریس نے نوجوان عورت کو جھک کر اٹھایا، الگ کیا اور پھر اپنی پوشاک جھاڑ کر آہستہ سے بولا "مجھے معاف کر! الوداع!" —— اور وہ وہاں سے چل پڑا۔

کرائسس جو ہونٹ دانتوں میں دبائے فرطِ جذبوں میں بیکل ہوئی جارہی تھی۔ اپنی باہیں ڈھلکا کر بولی "کیا کہا؟ کیا کہا؟ تو نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا 'الوداع'" اس نے پہلے کی طرح آہستہ سے کہا۔

"کیا وہ تو ہی نہ تھا جس نے . . . ؟"

"ہاں، میں ہی تھا اور میں نے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"تو پھر؟ . . . . تیری باتیں خاک میری سمجھ میں نہیں آرہیں!"

"نہ آئیں —— مجھے اس کی پروا نہیں۔ بہرکیف میں اس ادنیٰ راز کو تیری خرد کے لیے چھوڑتا ہوں تاکہ وہ اس کی تہہ کو پہنچے۔ اگر تیری باتیں فی الواقعہ سچی ہیں تو اس صورت میں تجھے راز پاتے پاتے کافی وقت لگے گا۔ میں فی الحال یہی کر سکتا ہوں کہ تجھے تنہا چھوڑ دوں تاکہ تو فوراً یک سوئی سے سوچنا شروع کر دے۔ اچھا تو پھر الوداع!"

"دماطریس! تجھے کیا ہو گیا؟ تیرے منہ سے میں یہ کیا سن رہی ہوں؟ یہ اندازِ گفتگو تو نے کب سے اپنایا؟ کیا واقعی یہ تو ہے جو مجھ سے اس طرح مخاطب ہے؟ کھل کے بات کر

میں منت کرتی ہوں۔ مجھے بتا وہ کون سی شے ہے جو ہمارے درمیان حائل ہو گئی ہے ـــ
ورنہ میں دیوار سے سر پھوڑ لوں گی!"

"کیا وہی بات مجھے ہزار مرتبہ دوہرانہ پڑے گی؟ ہاں، میں آئینہ حاصل کر چکا ہوں - ہاں، میں نے وہ قدیم شاہانہ حاصل کرنے کی خاطر پیشوائے اعظم کی بیوی طاونی کو قتل کیا ہے - ہاں، میں نے وہ ہفت تار جواہر کا ہار دیوی کی گردن سے اتارا ہے ـــ مجھے وہ تینوں تحائف تیری ایک قربانی کے عوض تجھے ابھی دینا باقی ہیں۔ تیری اس قربانی کی یہی صحیح قیمت تھی - کیا نہیں؛ مگر میری نظر میں تیری قربانی کی اب وہ قیمت نہیں رہی، بلکہ اب مجھے تجھ سے کچھ مطلوب نہیں - تو بھی میرا سا رویہ اختیار کر تاکہ ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوں - میں حیران ہوں کہ تو ایک نہایت سادہ صورت حال کو بھی نہ سمجھنے پر مصر ہے!"

"یہی بات ہے تو تحائف اپنے پاس رکھ - کیا میں ان کی بھوکی ہوں؟ مجھے تو مطلوب ہے تو ـــ"

"ہاں، میں یہ جانتا ہوں لیکن ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ میرا خیال مختلف ہے اور پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جس طرح تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے - اسی طرح پیمان محبت کی تکمیل کے لیے بھی بہر حال دونوں فریقین کی رضامندی ضروری ہے - مجھے ڈر ہے کہ میرا موجودہ رویہ تیرے اس خواب کی تعبیر کے موافق نہیں - یہی بات ہے جو میں اتنی دیر سے تجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تو ہے کہ . . . ؛ بہر کیف میں استدعا کرتا ہوں کہ تو میری گریز پائی کی حقیقت جان ورنہ یہ تیری ضد، یہ تیری ہٹ دھرمی مجھے یہ باور کرنے پہ مجبور کر رہی ہے کہ ہماری گفتگو حد درجہ بے معنی، ہماری باتیں نہایت بیکار و بے سود ہیں اور بہت ممکن ہے ان باتوں سے میں ناشائستہ اور ناخوش گوار طرز عمل اختیار کرنے پہ مجبور ہو جاؤں اور یہ نہایت افسوس ناک بات ہو گی!"

"لوگوں نے تجھ سے میرے خلاف باتیں کی ہوں گی؟"

"نہیں!"

"اوہ! مجھے پورا یقین ہے کہ لوگوں نے میرے متعلق تجھ سے باتیں کی ہیں۔ انکار نہ کر۔ انہوں نے تجھے ضرور ورغلایا ہے۔ میرے بہت سے سخت دشمن ہیں۔ تجھے ان کی باتوں پہ کان نہ دھرنے چاہئیں، قسم ہے مجھے تمام دیوتاؤں کی ان عورتوں نے نری بکواس کی ہے!"

"مجھے ایسی عورتوں سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا"

"یقین کر! یقین کر! محبوبِ کُل! تجھے دھوکا دینے کے خیال میں مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جب کہ تو اور فقط تو ہی میرا محبوب و مطلوب ہے۔ یقین کر! تو وہ پہلا شخص ہے جس سے میں اس طرح مخاطب ہوں . . .!"

دماطریس نے اس کی آنکھوں میں بغور جھانکا اور کہا "بہت دیر ہو چکی اور پھر میں تو تجھے پا بھی چکا۔"

"تو دیوانہ ہے — تو نے مجھے پایا۔ کب؟ کہاں؟ کیسے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے تجھے پایا مگر تیرے بغیر۔ مجھے تیرے انداز کرم سے جس شے کی توقع تھی وہ تو نے مجھے بخشی اور خوب ہی دل کھول کر بخشی اور تجھے اس کا علم بھی نہیں۔ گذشتہ رات تو مجھے خواب میں وہاں تک کشاں کشاں لے گئی جہاں تو اس وقت جانا چاہتی ہے اور وہاں — تو نہایت حسین تھی، جمیل تھی۔ کرائسس! میں اُس دیارِ حسن آباد سے ابھی ابھی آیا ہوں — کوئی انسانی ارادہ اب دوبارہ مجھے وہاں نہیں لے جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان ایک خوشی ایک ہی شکل میں دوبارہ نہیں پا سکتا۔ تو کہے گی وہ سرمدی مسرت تیری بخشی ہوئی تھی۔ مگر میں کہوں گا تیرا یہ خیال غلط ہے کیونکہ میرا ولولۂ عشق تجھ سے نہیں تیرے سائے سے لطف اندوز ہوا تھا۔ اس لیے، جانِ من، تو مجھے اب اپنے وجودِ حقیقت سے بہرہ ور نہ کر!"

کرائسس نے اپنے ہاتھ اپنی کن پٹیوں پہ رکھ لیے۔ پھر بولی "الامان۔ والحفیظ! تو اور

ایسی باتیں کہنے کی ہمت کرے! یہ اندازِ قناعت ؛ یہ اندازِ تفاخر!"

"تو نتائج اخذ کرنے کے معاملہ میں بہت جلد باز ہے۔ میں نے تجھے بتایا تھا، میں نے ایک خواب دیکھا۔ کیا تجھے یقین ہے میں سو رہا تھا؟ میں نے عرض کی تھی، میں بہت مسرور ہوا۔ کیا تیرے نزدیک مسرت سے واحد مراد وہ ادنیٰ جسمانی اہتزاز ہے جو، جیسا کہ تو نے ایک بار مجھے بتایا تھا، تم بکمال خوبی پیدا کرتی ہو۔ مگر اس میں کسی قسم کا متنوع الاشکال کیف پیدا کرنے سے عاری ہو۔ بسکہ تیرا پیدا کیا ہوا اہتزازِ جسمانی بھی وہی ہے جو ہر مائلِ التفات اور راغبِ سپردگی عورت ہر حال میں پیدا کر لیتی ہے۔ یقین کر کہ تو اپنے موجودہ مجنونانہ رویہ سے اپنی قدر و منزلت کو کم کرنے پر مصر ہے۔ تو نہیں جانتی کہ تیری افتاخیز بلس کیسی کیسی سرخوشیاں پنہاں ہیں؟ معشوقاؤں کو کون سی چیز ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے؟ کیا ان کے فرق کی بنیاد یہ حقیقت نہیں کہ ہنگامۂ عشق کو شروع کرنے اور ختم کرنے کا انداز ہر ایک کا اپنا اپنا ہے؟ ورنہ اصل معاملہ باعتبار نوعیت اتنا ہی فرسودہ و یک رنگ ہے جتنا کہ وہ ہم سب کی بقا کے لیے ضروری اور اس وجہ سے اس پر کسی قسم کی تحقیق بھی بے سود ہی ہے مگر اس کے باوجود ایک مرد جہاں اپنی زندگی میں ایک عدد مثالی داشتہ یا محبوبہ کا متلاشی رہتا ہے۔ عورت وہاں ایک عدد مثالی عاشق کی جستجو میں رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہنگامۂ الفت کو شروع اور ختم کرنا تجھ پر ختم ہے۔ کم از کم مجھے تو اس حقیقت کے اعتراف میں عار نہیں اور شاید تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دے گی الفرودتِ معبد کو دیکھ لینے کے بعد خواب میں میرے تخیل نے جو نسوانی پیکر پیش کیا وہ تو اور فقط تو تھی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں تجھے نہیں بتاؤں گا کہ آیا وہ ایک خواب شبینہ تھا یا ایک واہمۂ بیداری؟ تیرے لیے تو فقط یہی جان لینا کافی ہے کہ خواہ وہ خواب کا کرشمہ تھا خواہ عالم بیداری کا فریب نظر، بہر کیف تیرا پیکرِ تصور ایک نہایت غیر معمولی ماحول میں میرے سامنے جلوہ گر ہوا — تو عالمِ رویا کی جلوہ گری کہہ لے لیکن مت بھول کہ میں تجھے فریب نظر کے اس طلسم کو توڑنے

کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔"

"اور میں؟ اس تمام معاملہ میں تو نے میرا کیا بنایا؟ میں — میں جو تیرے منہ سے وہ تمام خرافات سن لینے کے بعد بھی تیرے لیے تڑپ رہی ہوں؟ کیا تیرے اس ہولناک خواب کا مجھے بھی احساس تھا؟ کیا میں بھی اس خوشی میں شریک تھی جو تو نے مجھ سے چرائی؟ ہاں چرائی؟ کیا کسی نے آج تک ایسے عاشق کے متعلق سنا ہے جس کی خود غرضیوں کا یہ عالم ہو کہ وہ اپنے سے محبت کرنے والی عورت سے حظ تو اٹھائے مگر اس حظ میں عورت کو شریک کئے بغیر، دماطریس! مجھے پاگل نہ بنا!"

اس مرحلۂ ہم کلامی پر دماطریس نے اپنے لہجہ سے طنز نکال دیا اور قدرے کانپتی ہوئی آواز میں بولا "کیا تیرے دل کو اس وقت ذرا سی بھی تکلیف پہنچی تھی جب تو نے میری دیوانگی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھے تین ایسے جرائم کے ارتکاب پر اکسایا تھا جو میرے وجود ہستی کو تباہ و برباد کر سکتے تھے اور جن کی یاد اب بھی میرے ذہن میں ایک سہ رخی ندامت کی شکل میں کھٹک رہی ہے؟"

"اگر میں نے ایسا کیا تھا تو اس کا مقصد تجھے اپنے سے وابستہ کرنا تھا۔ میرا خیال تھا اگر میں اپنے آپ کو تیرے سپرد کر دیتی تو تجھے نہ پا سکتی۔"

خوب! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تو مطمئن ہو چکی۔ تو نے مجھے پا لیا اگرچہ زیادہ دیر کے لیے نہیں۔ بہر حال اپنی خواہش کے مطابق تو مجھے طوق غلامی پہنانے میں کامیاب ہو گئی۔ اب اجازت دے کہ میں آزاد ہو جاؤں!"

"آزادی کی تو میں مستحق ہوں کیونکہ غلام میں ہوں — فقط میں!"

"ہاں، تو یا میں! — ہم میں سے صرف وہ غلام ہے جو دوسرے کا طلب گار ہے۔ غلامی! غلامی! یہ تو دراصل بوالہوسی کا دوسرا نام ہے۔ تم سب کا ایک ہی خواب ہے۔ ایک ہی خیال ہے جو سب کے دل اور دماغ میں جاگزیں ہے۔ یعنی اپنی فطری کمزوریوں سے مرد کی قوت کو شکستہ کرنا۔ اپنی کج فہمیوں کو اس کی فہم و فراست پر حاوی کرنا! تم سب

فقط یہ چاہتی ہو کہ جوں ہی تمہارے سینوں میں اٹھان پیدا ہو، تم کسی سے محبت نہ کرو بلکہ تم سے دوسرے محبت کریں۔ تمہارا کوئی محبوب نہ ہو تم سب کی محبوب بنو۔ تم مرد کو اپنے ٹخنوں سے باندھ کر اسے ذلیل و رسوا کرو۔ اس کا سر جھکاؤ اور اس پر جوتیاں مارو۔ پھر تم اپنی خواہش ناروا کے مطابق ہم سے ہماری شمشیر، تیشہ اور پرکار تک چھین لیتی ہو غرضیکہ اپنے سے ہر بڑھنے ہوئے کا راستہ روکتی ہو۔ ہر خوددار انسان کا سر کچلتی ہو۔ . . . . کون بھول سکتا ہے کہ ہراقلیس جیسے بادشاہ سے تم نے اپنے لیے اون کتوائی۔ لیکن تم نے جب دیکھا کہ دنیا میں ایسے بھی سر ہیں جو تمہارے سامنے نہیں جھک سکتے تو تم نے ان سروں کی پرستش کی۔ ان ہاتھوں کو پوجا جو تم پر اٹھے، ان زانوؤں کو چوما جنھوں نے تمہیں بے بس کیا اور اس منہ کا پیار لیا جس نے تمہیں لعن طعن کی اور وہ مرد تو تمہارا سرتاج قرار پایا جو محبت میں نازک ادائیوں کا منکر اور عشق میں جبر و اکراہ کا قائل تھا۔ رخصت کے وقت مغموم نہ ہونے والا آشفتہ سر تو تمہیں تمہارے سر کے بالوں سے کھینچ کر اپنی آغوش ہوس میں ڈال سکتا ہے۔ اور مرد کے بجھنے ہوئے جذبہ محبت کو ایک بار پھر تند و تیز بنانے کے لیے تمہارے صرف آنسو کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ اے بوالہوس عورت! تمہارا دوسروں کو غلام نہ کرسکنے کی حسرت کا صرف ایک مداوا ہے اور وہ یہ کہ تمہیں وہ دوسروں کا غلام بنا دیا جائے۔

"آہ! اگر یہی تیری آرزو ہے تو مجھے مار! لیکن بعد میں پیار بھی کر!"

مجھے تجھ سے سخت نفرت ہے۔ الوداع! وہ بھنا کر بولا۔

کرسٹس نے اس کا دامن پکڑ لیا اور گریہ آمیز آواز میں بولی۔ جھوٹ مت بول! تو مجھے چاہتا ہے۔ تیری روح میرے خیال سے معمور ہے۔ تو فقط ندامتِ اطاعت سے گریزاں ہے۔ سُن! اے محبوب کل! اگر تیرا پندار نفس اسی بات پر مصر ہے، تو میری آرزوئے پرُ رگی اور خواہش حصول بھی کسی لحاظ سے کم نہیں۔ اپنے لیے مجھ سے قربانی مانگ۔ تجھے پالینے کے بعد میں کبھی کوئی شکوہ نہ کروں گی!"

دماطریس نے اسے تجسس آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر جس طرح اس نے تین راتیں

پہلے گودی پر کیا تھا، بولا "تو کون سی قسم کھائے گی؟"

"الیفرودت کی!"

"تو الیفرودت کی قائل نہیں ہے سبتِ جاہ کی قسم کھا!"

غلیلی یہودن کا رنگ زرد ہو گیا "دماطریس! کوئی سبتِ جاہ کی قسم نہیں کھاتا!"

"تو تجھے انکار ہے؟"

"نہیں! لیکن یہ قسم بہت لرزہ خیز ہے!"

"میں تو یہی قسم کھلواؤں گا۔"

وہ کچھ دیر ہچکچائی لیکن بالآخر دبی سی آواز میں بولی "ربّ جاہ کی قسم! مجھ سے کیا قربانی چاہیئے، دماطریس؟"

نوجوان کچھ دیر خاموش رہا——

"کچھ کہہ! اے محبوب گل، جلدی سے بتا۔ میں بے چین ہوں!"

"اوہ! بہت ہی چھوٹی بات ہے!"

"لیکن کیا؟"

"میں تجھ سے اپنے نادرِ روزگار تحائف کو صلہ میں نہیں عام تحائف نہ مانگوں گا۔ وہ خلافِ دستور بات ہو گی۔ البتہ میں ان تحائف کو قبول کرنے کا مطالبہ تو کر سکتا ہوں۔ ہے نا؟"

"یقیناً" کرائسٹس دفعتہً جوش میں آ کر بولی۔

"وہ آئینہ، وہ شانہ اور وہ ہار جو میں نے تیرے لیے حاصل کیے، ان سب کو تو نے استعمال کرنے کی تو کبھی خواہش نہ کی ہو گی، ہے نا؟ چوری کا وہ آئینہ، ایک مقتول عورت کا وہ شانہ اور دیوی کا وہ ہار — مانا کہ یہ سب انمول چیزیں ہیں مگر بیکار کیونکہ انہیں کوئی انسان استعمال نہیں کر سکتا۔"

"کیا خوب خیال ہے!"

"نہیں — کیونکہ میں نے درحقیقت ہمیشہ اس کے برعکس سوچا ہے۔ تو ان تینوں کو پہنے گی ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ تو ایک نہایت سنگدل عورت ہے جس نے صرف بے سود اپنے محبوب کو تین سنگین جرائم کے ارتکاب پر آمادہ کیا۔ بلکہ اس کے نتیجہ میں اسکندریہ کی تمام مخلوق کا آرام اور چین بھی تباہ کیا — تو انہیں پہنے گی!"

"کیا کہا؟"

"تو اس مختصر سے محصور باغ میں جائے گی جہاں استغیاں حرمیس کا مجسمہ نصب ہے وہ جگہ ہر وقت ویران رہتی ہے اس لیے وہاں تیرے کام میں کسی کی خلل اندازی کا خطرہ نہیں۔ تو دیوتا کی بائیں ایڑی اٹھائے گی تو پتہ چلے گا کہ سنگ پا شکستہ ہے وہاں پایہ ستون کے اندر تجھے آئینۂ نخبیث ملے گا جسے تجھے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ وہیں سے تجھے ملکہ نطوفریت کا نادر روزگار شانہ ملے گا جسے تجھے اپنے بالوں میں سجانا ہوگا۔ دیوی الفرودت کا ہفت تار ہار بھی اسی جگہ ملے گا جسے تو زیب گلو کرے گی۔ اس طرح آراستہ ہو کر اے حسین وجمیل کرائسس! تو شہر میں سے گذرے گی، ہجوم تجھے پکڑ کر ملکہ برنیس کے سپاہیوں کے حوالے کر دے گا۔ لیکن دماطریس سے متعلق تیری آرزوئے طلب ضروری پوری ہوگی کیونکہ صبح ہونے سے قبل میں تجھے قید خانے میں ملنے آؤں گا۔"

باغِ حرمیس

کرشمس کا پہلا ردِ عمل گریز پائی پر مبنی تھا۔ وہ اس قدر بھولی نہ تھی کہ پاسِ قسم اسے فوراً ملحوظِ خاطر ہوتا۔

دوسرا ردِ عمل وہاں سے چل پڑنے کا تھا۔

ایک قوی جذبۂ تجسس نے اسے اس پراسرار جگہ کی نقاب کشائی پر مجبور کیا جہاں دماطریس نے اپنے تینوں جرائم کے محاصل چھپا رکھے تھے۔ وہ انہیں اس جگہ سے نکالنا چاہتی تھی، اپنے ہاتھوں سے چھونا چاہتی تھی، دھوپ میں نہلانا چاہتی تھی اور پھر ایک لمحہ کے لیے ان پر بھرپور قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی فتح صرف اس وقت مکمل ہو گی جب وہ اپنی آرزوئے طلب کے ان تینوں مظاہر کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ بھینچ لے گی۔

رہا دماطریس کا سوال تو وہ اسے دوبارہ حاصل کرنے کا کوئی راستہ ضرور تلاش کر لے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس سے ہمیشہ کے لیے کٹ جائے؟ اس کے خیال میں دماطریس کا جذبۂ مطلب آسانی سے ختم ہونے والا نہ تھا۔ وہ کم ہو کر دوبارہ شدت پکڑ سکتا تھا۔ وہ عورتیں جو بھرپور میلانات کا تختۂ مشق بن چکی ہوں مرد کے محرمانہ ذہن میں برسوں مقیم رہتی ہیں اور مرد کی ہر سابقہ معشوقہ ملاقات کے دوران میں تمام تلخ یادیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ ایک نئی محبت ایک نئی وابستگی پروان چڑھتی ہے۔ کرشمس اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی، مانا کہ وہ اپنی زندگی کے اولین محبوب کو رام کرنے کے لیے بے حد مضطرب و بے چین تھی مگر ہاں، وہ کوئی اس قدر پاگل بھی نہ تھی کہ کاہش حصول میں اپنی زندگی تک گنوا بیٹھے جب کہ اس سنگدل عاشق کو ورغلانے اور پھسلانے کے ابھی کئی راستے باقی تھے۔

اور اس کے باوجود ——— وہ سوچ رہی تھی ——— اس شخص نے اس زندگی کے لیے کتنا

حسین انجام تجویز کیا تھا!

وہ منظر کتنا عجیب و غریب ہوگا جب وہ ایک بیکراں ہجوم کے روبرو اس قدیم نادِر زمانہ آئینہ کو لئے کھڑی ہوگی جس میں صافو اپنا رُخ زیبا دیکھا کرتی تھی۔ اور وہ شاہ جو کبھی ملکہ نطوخریت کے شاہانہ گیسوؤں کی زینت تھا اس کے اپنے سنہری بالوں میں جلوہ فگن ہوگا اور وہ سمندری موتیوں کا ہار جس کا ایک ایک موتی ربۃ اندومین سے مانوس رہ چکا تھا اس کی حسین، لامبی گردن میں جلوہ نما ہوگا —— اور پھر وہ اس کا شام تا سحر اس لطفِ بے پایاں سے ہمکنار رہنا جو عورت کو ہنگامۂ بوس و کنار کی جنوں ساماںیوں سے میسر آتا ہے —— اور پھر دوپہر کے قریب اس کا ایک بے اذیت موت مر جانا —— کس قدر بے مثال تھا زندگی کا یہ انجام!

کرائسٹس نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں اور . . . . .

مگر نہیں، —— وہ اپنا یہ حشر نہ ہونے دے گی!

وہ راکوتیس کے بیچو بیچ ناک کی سیدھ میں چلتی گئی اور بالآخر اس راہگذر پہ ہولی جو رفیع الشان معبدِ سرافس کو جاتی تھی۔ یہ شاہراہ جسے یونانیوں نے جگہ جگہ سے کاٹ رکھا تھا اس بستی میں سے گذرتی تھی جو اپنی ان تنگ و تاریک گلیوں کے لیے مشہور تھی۔ جہاں دو قومیں اپنے باہمی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے سے باہم ملتی تھیں مصریوں کی نیلی پوشاکوں کے درمیان سپید یونانی لبادے عجیب منظر پیش کرتے تھے۔ کرائسٹس نہایت تیزی سے وہاں سے گذر گئی حالانکہ جگہ جگہ لوگ ان جرائم کا آپس میں مزے لے لے کر ذکر کر رہے تھے جن کا تعلق اس کی ذات سے تھا اور جو اس کی خاطر کئے گئے تھے۔

معبدِ سرافس کی سیڑھیوں سے وہ بائیں جانب کو مڑی اور ایک تاریک گلی میں ہوگئی۔ اس گلی سے وہ ایک اور گلی میں ہو گئی جس کے گھروں کی چھتیں اس کے سر کے اُوپر ملتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس گلی کے بعد اس نے ایک چھوٹے سے ستارہ نما چوک کو عبور کیا جس کے

وسط میں ایک فوارہ تھا۔ فوارہ کے پاس دو سیاہ فام لڑکیاں کھڑی کھیل رہی تھیں۔ بالآخر وہ چلتے چلتے رک گئی۔ شاید منزل قریب آگئی تھی۔

حرمبس عنابوس کا باغ دراصل ایک چھوٹا سا قبرستان تھا ویراں شدہ یا پھر اسے ایک دہشتِ ویراں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ نہ تو وہاں لوگ اپنے مرحوم رشتہ داروں کو پُرزور خلوص پیش کرنے آتے اور نہ ہی راہگیر وہاں سے گذرنا پسند کرتے تھے۔ کرسٹس باوجودیکہ اپنے پاؤں تلے آنے والے ہر کنکر سے ڈر جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی قبروں کے سنگ ہائے شکستہ پر محیط خاموشی کو چیرتی چلی جارہی تھی۔ ہوا جو بدستور غبار آلود تھی اس کی کن پٹیوں کے بالوں کو چھیڑ رہی تھی اور ساتھ ہی اس کے گلناری ریشمیں نقاب کو اشجار جمیز کے سپید پتوں کی طرف اڑا رہی تھی۔

اس نے دماطریس کے بتائے ہوئے مجسمہ کو تین ماتمی لاٹوں، جو دیکھنے میں ایک عمارتی مثلث معلوم ہوتی تھیں، کے درمیاں پایا۔ رازِ ہائے مرگ کو چھپانے کے لیے وہ ایک نہایت موزوں جگہ تھی۔ وہ ایک تنگ پتھریلے راستہ سے بمشکل اندر داخل ہوئی اور مجسمہ کو دیکھتے ہی ایک لمحہ کے لیے زرد ہو گئی۔

گیدڑ کا سر رکھنے والا دیوتا ایک ٹانگ آگے کو بڑھائے کھڑا تھا۔ اس کی پوشاک میں جو بہت نیچی تھی، دو سوراخ تھے جن سے اس کے بازو باہر نکلے ہوئے تھے۔ متصلب بدن کے اوپر جھکا ہوا سر ان ہاتھوں کے انداز کو غور سے دیکھ رہا تھا جو عملِ حنوطگی میں مصروف نظر آتے تھے۔ بایاں پیر ڈھیلا اور ڈھلکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

کرسٹس نے سہمے ہوئے انداز میں اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ ایک ہلکی سی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ وہ ایک سبز رنگ کا گرگٹ تھا جو مرمریں پایۂ ستون کی ایک درز میں گھس رہا تھا۔ آخر کار اس نے مجسمہ کے شکستہ پاؤں کو پکڑا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد جوں ہی وہ ایک طرف کو ہٹایا۔ اس کی نظریں ان تین بیش بہا جواہرات پر پڑیں جو

پاؤں کے نیچے نہایت قرینہ سے رکھے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے اس نے ہار باہر نکالا۔ اُف! وہ کس قدر بھاری تھا! اسے کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ وہ ہار اور اس کے موتی دیوی کی گردن سے جدا ہو کر اس کے ہاتھ میں آئیں گے۔ یہ چھوٹے چھوٹے حسین گلابی پارہ ہائے ماہتاب معلوم ہوتے تھے۔

بالآخر کار اُس نے ہار اپنے گلے میں ڈال لیا اور آنکھیں بند کر کے موتیوں کو اپنی جلد پر گدگدیاں کرتے محسوس کرنے لگی۔ ساتوں لڑیوں کو ایک ہی طرح اپنے پستانوں پر سجا کر ہار کا درمیانی موتی اس نے اپنی "وادیٔ سینہ" یعنی پستانوں کے درمیانی نشیب پر آویزاں کر دیا۔

اس کے بعد اس نے ہاتھی دانت کا شانہ نکالا، کچھ دیر غور سے دیکھا، اس پر کندہ تصویر کو انگلیوں سے چھیڑا اور پھر بڑی کوشش کے بعد اسے اپنے بالوں میں ایک موزوں ترین جگہ پر آراستہ کر لیا۔

پایۂ ستوں کے شگاف سے آخرکار اس نے نقرئی آئینہ نکالا، اس میں ادائے ناز سے جھانکا تو اس میں اس کو نشۂ نصرت سے مخمور اپنی ستاروں کی سی آنکھیں اور دیوتاؤں کے ہاں سے چرائی ہوئی مقدس اشیا سے مزین کاندھے نظر آئے۔

اپنے سراپا کو گلناری ریشمیں لبادہ میں ڈھانپ کر وہ قبرستان سے باہر نکل آئی۔ بارِ جواہرات سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

ارغوانی دیواریں

جب دیوداسیوں کی زبانی عوام کو اشیائے مقدسہ کی بے حرمتی کا مکمل یقین ہوگیا تو وہ باغات میں پھیلنے لگے۔ معبد کی قورطیز ایٹی ہزاروں کی تعداد میں سیاہ زیتون کے درختوں کے نیچے سے گذرنے والی راہگذاروں پر جلوس کی شکل میں رواں دواں تھیں۔ ان میں سے بعض نے سروں پر راکھ ڈال رکھی تھی، کچھ بال نوچ رہی تھیں، کچھ سینہ کوبی سے دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں اور بہت سی باہنوں میں منہ دیئے رو رہی تھیں۔ ہجوم کا کچھ حصہ شاہراہِ درامرکس پر بہتا ہوا خاموشی سے شہر کی طرف واپس چلا گیا۔ زمین و آسماں ماتم کناں معلوم ہوتے تھے۔ خوفزدہ دوکانداروں نے انواع و اقسام کے سامان سے مزین اپنی اپنی دوکانیں بڑھا دی تھیں اور بے دریچہ عمارتوں کے زیریں حصوں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ بندرگاہ کی رونق ختم ہو چکی تھی اور جہاز ران اور ملاح حیرت زدہ خاموش بیٹھے تھے۔ وہ جہاز جو کچھ دیر پہلے چلنے کو تیار نظر آتے تھے۔ ایک بار پھر اپنے لنگر ڈال چکے تھے۔ چپوؤں کو ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔ اور بادبان سمیٹ لیے گئے تھے۔ وہ جہاز جنہیں بندرگاہ میں داخل ہونا تھا۔ دور فاصلہ پر بے حرکت کھڑے اجازتِ داخلہ کے اشارات کے منتظر تھے۔ ان جہازوں میں چند مسافر ایسے بھی تھے جن کے رشتہ دار قصرِ شاہی میں ملازم تھے، وہ سب کے سب اس خیال سے مرے جا رہے تھے کہ شہر کسی سیاسی انقلاب اور خوں خرابہ کی زد میں آیا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض نے تو معبودانِ شر کے نام پر قربانیاں بھی دینا شروع کر دی تھیں۔

گودی اور حزبہ منار کے ایک بعید گوشے میں کھڑی لہ عودت کو یکایک کراسس اپنے پہلو میں کھڑی نظر آئی۔

"اُف توبہ! کرسٹس، مجھے سنبھالو۔ میں خوفزدہ ہوں۔ مرطو بھی میرے پاس کھڑی ہے۔ مگر ہجوم اس قدر زیادہ ہے کہ ہمارے بچھڑ جانے کا خطرہ ہے۔ ہمارے ہاتھ پکڑ لو!"

مرطو صبیلہ بولی: "تمہیں کچھ معلوم ہے شہر میں کیا ہو گیا ہے؟ کیا کوئی جانتا ہے یہ کس اٹھایا ہوا طوفان ہے؟ مجرم کو سزا دی جا رہی ہے یا نہیں؟ اس سے پہلے کبھی ایسا عذاب شہر پہ نازل نہیں ہوا — آخر ہم سب کا کیا بنے گا؟"

کرسٹس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہم نے تو فاختائیں بھینٹ چڑھائی تھیں۔" ننھی نے نوازدو شیزہ بولی "کیا دیوی ہماری اس بھینٹ کو بھول تو نہ جائے گی؟ آج تو دیوی بہت ہی قہرمان ہو گی؟ اور تم — پیاری کرسٹس تم جیسے آج بہت خوش اور طاقتور ہو نا تھا۔ تمہارا کیا بنے گا؟"

"سب کام ہو چکا۔" نور طنیرہ نے کہا۔

"تم نے کیا کہا؟"

کرسٹس دو قدم پیچھے کو ہٹی اور اپنا دایاں ہاتھ لبوں پہ رکھ کر بولی: "رعودث! دیکھتی رہو کیا ہوتا ہے۔ تم بھی مرطو صبیلہ! تم لوگ آج ایک ایسا منظر دیکھو گی جو انسانی آنکھوں نے کوہ مُدّاپر دیوی کے ظہور کے دن سے آج تک نہیں دیکھا اور جب تک دنیا باقی ہے ایسا منظر پھر کبھی نظر نہ آئے گا۔"

دونوں مبہوت سہیلیاں اسے دیوانی سمجھ کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ لیکن کرسٹس اپنے خیالات میں گم اس عظیم منار کی طرف نکل گئی جو سنگ مرمر کی آٹھ منزلہ کوہ نما عمارت تھی اس نے کانسی کا دروازہ کھولا اور پھر عوام کی بے توجہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر گھس گئی اور کواڑ پہلے کی طرح بند کر دیئے۔

چند منٹ گذر گئے۔ انبوہ بدستور بے چینی اور سرگوشیوں میں غلطاں و پیچاں تھا۔ ہجوم کی بے ہنگم آوازیں سمندر کے شور سے متصادم ہو رہی تھیں۔ یکایک ایک چیخ

بلند ہوئی جسے فوراً ہی لاکھوں دہنوں نے دہرایا۔

"الفرودت!.... الفرودت!"

ایک رعد آسا شورِ استعجاب اٹھا۔ فاروس کی دیواروں کے زیرِ سایہ ایک قوم کی قوم آن کی آن میں خوشی کے گیت گانے لگی۔ گودی کا تمام ہجوم جزیرے پر آرہا اور چٹانوں پر پھیل گیا، مکانوں کی چھتوں، بادبانوں اور بکتر بند برجوں پہ چڑھ گیا۔ جزیرہ پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہجوم بڑھ رہا تھا ایک سیلاب کی طرح سمندر کی طرف، پہاڑی چوٹیوں کی جانب —— جہاں تک نظر جاتی تھی عورتوں اور مردوں کا یہ عظیم اجتماع پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ قصرِ بطلیموسیاں سے لے کر منہر، بابِ شاہی، بندرگاہ اور یوراسطیس کی لاٹ تک ہر طرف ہر سڑک، ہر گلی اور ہر کوچے سے انسان ایک ٹڈی دل کی طرح اس مرکزِ اکتشاف کی طرف رینگتے چلے آرہے تھے۔ بازوؤں اور چہروں کے سیلابِ رواں کے اوپر دور فاصلہ پہ ملکہ برنیس کی زرد رنگ پالکی افتاں و خیزاں چلی آرہی تھی اور لحظہ بہ لحظہ جب ملکہ کی آمد کی خبر آگ کی طرح ہجوم میں پھیلی تو شور ناقابلِ برداشت ہو گیا۔

فتح و ظفر کیا شے ہے؟ اس سوال کا جواب نہ تو فیوس اور لیڈا کی بیٹی حسینۂ یونان ہیلن دے سکتی ہے (جس نے بابِ شان کے مینار سے اپنے محبوب پیرس کو اپنے شوہر مینالوس پر کاری ضربیں لگاتے دیکھا) اور نہ ہی یونانی قورطبنہ فرائینے دے سکتی ہے (جو فاتح اعظم اسکندر کے ہمرکاب ایشیائی ممالک میں پھرا کی)، اور نہ ہی تھائیس (جس نے اپنے جمالِ آتشیں سے فرسفلاس کی بستی کو جلا کر خاک کر ڈالا تھا۔)

کراٹسس نے سرخ مینار کے پہلے جنگلے پر مغربی دروازہ کے راستہ نمودار ہو چکی تھی۔ وہ برہنہ تھی دیوی کی مانند۔ چرخِ شام کے پس منظر پہ پھڑپھڑاتے ہوئے گلناری نقاب کے کناروں کو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں آئینہ تھا۔ جس میں ڈوبتا سورج منعکس ہو رہا تھا۔

نہایت آہستگی سے اس نے سر جھکایا اور پھر نہایت سحر انگیز اور پر شکوہ ادائے ناز کے ساتھ وہ بلند شگرفی مَنار کے پیچیدہ زینہ پر چڑھنے لگی۔ اس کا نقاب شعلہ کی مانند کانپ رہا تھا۔ سرخی مائل دھند لکے میں اس کا جواہر کار ہار ایک جوشیلے لعلیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ اداس دلگداز عالم رفعت میں اس کے بدن کی درخشاں جلد میں گوشت، خون اور آگ کی تمام مخصوص، نرم اور رگدگدی رنگینیاں رونما تھیں۔ فلک بوس ارغوانی دیواروں کے ساتھ ساتھ گھومتی ہوئی وہ آسمان کی طرف گامزن تھی —

کتاب پنجم: غروب

عظیم رات

"تو دیوتاؤں کی منظورِ نظر ہے،" معمر جیلر نے کہا۔ "اگر مجھ ایسا ایک ادنیٰ غلام ان جرائم کے ہزارویں حصّہ کا بھی مرتکب ہوتا تو مجھے چوبی گھوڑے سے باندھ دیا جاتا، سر کے بل لٹکا دیا جاتا، مار مار کر پرخچے اڑا دیئے جاتے اور جسم کو آہنی سلاخوں سے داغ دیا جاتا۔ وہ لوگ میری ناک میں سرکہ انڈیل دیتے۔ مجھے پتھروں میں چنوا دیتے حتّٰی کہ میرا دم گھٹ جاتا۔ اگر اس طرح میں تکلیف سے مر جاتا تو میری لاش کو کسی تپتے ہوئے ریگزار میں گیدڑ کھا رہے ہوتے مگر ایک تو ہے جس نے جانے کیا کیا کچھ چرا ڈالا، جانے کس کس کو مروا دیا، جانے کس کس مقدس شے کی بے حرمتی کی مگر پھر بھی تو ایک نفیس حجرے میں آرام اور چین کا جھولا جھول رہی ہے۔ ربّ جنیوس کی قسم مجھے تو یہ جاننے کا بھی حق نہیں کہ ایسا کیونکر ہوا؟ خیال ہے ایوانِ شاہی میں یقیناً تیرے ہمدرد دوست ہوں گے!"

"مجھے چند انجیریں دینا۔ میرا منہ خشک ہو رہا ہے،" کراسس بولی۔

عمر رسیدہ غلام ایک سبز رنگ کی ٹوکری، جس میں اس کے لیے ایک درجن رسیلی انجیریں تھیں، اسے دے کر چلا گیا۔

وہ بیٹھ گئی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور حجرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ اس کے بعد اس نے اپنی ہتھیلیاں دیوار پر مارنا شروع کر دیں۔ اسے مطلق احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ آن کی آن میں اس نے اپنے سر شتہ گیسو کھول ڈالے تاکہ وہ خشک ہو جائیں مگر جلد ہی اس نے وہ پھر گوندھ لیے۔

انہوں نے اُسے جبراً ایک لامبا اور بھاری بھرکم اونی لباس پہنا دیا تھا جس کی گرمی سے وہ پسینہ میں بھیگی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں، ایک جمائی لی اور پھر اپنی کہنیاں دریچہ پر رکھ دیں۔

دروازے سے باہر ماہتاب اس قدر تیز چاندنی بکھیر رہا تھا کہ آسمان ایک سیال مادہ نظر آ رہا تھا اور اس پر ایک تارا بھی نظر نہ آتا تھا۔ سات برس پہلے ایک ایسی ہی درخشندہ رات کو وہ سرزمینِ غناسرت سے رخصت ہوئی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ پانچ تھے۔ وہ سب کے سب ہاتھی دانت کے سوداگر تھے۔ ان کے گھوڑوں کی دموں پر رنگ برنگے پھندنے لگے ہوئے تھے، ایک کنوئیں کی منڈیر پر وہ ایک نوعمر لڑکی کو ملے تھے اور ۔ ۔ ۔ ۔

اس سے قبل وہ کم سن دوشیزہ نیلگوں جھیل، شفاف آسمان اور وادیٔ غلیلہ کی شبک رو ہواؤں سے پہروں دل بہلایا کرتی تھی۔ اس کے گھر کے چاروں طرف پٹ سن اور ترمس کے پودے ہی پودے تھے۔ وہ جب تتلیوں کو پکڑنے بھاگتی تو خاردار جھاڑیوں کے کانٹے اکثر اس کی انگلیوں میں چبھ جاتے۔ لہلہاتے کھیتوں کی رنگین ہوا اس کی طبیعت کو گدگداتی۔ بستی کی سادہ لوح بچیاں سارا سارا دن ندی کے نرمل پانی میں کلیلیں کرتی نظر آتیں اور ندی کی گل افروز جھاڑیوں کے نیچے سے انہیں گھونگے ملا کرتے۔ تالابوں کی سطح گلپوش تھی مرغزاروں میں ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے۔ دامنِ کہسار گل ہائے سوسن سے بھرا ہوا تھا اور پہاڑ کی چوٹی تو اسے اپنے نوخیز سینہ کی مانند معلوم ہوتی تھی ——

وفورِ جذبات میں کرائسس نے آنکھیں بند کر لیں، ایک سوگوار مسکراہٹ اس کے رُخِ تاباں پر نمودار ہوئی اور فوراً ختم ہو گئی۔ موت کا خیال اس کے دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دماغ کی سلگن اس وقت تک ختم نہیں ہو گی جب تک وہ خود ختم نہ ہو جائے۔

"اُف، میرے خدایا!" وہ بولی "میں یہ کیا کر بیٹھی ہوں؟ کاش! ابتک اس شخص سے

کبھی نہ ملی ہوتی۔ کاش! اس نے میری بات نہ مانی ہوتی۔ میں اس کے دامِ تزویر میں کیسے پھنس گئی، خداوندا! تو نے مجھے کیسے امتحان سے دوچار کر دیا! ایک طرف محبت سے تو بہ تھی اور دوسری طرف زندگی سے ہاتھ دھونا۔ مگر میری خطا؟ یہ سزا مجھے کیوں دی جا رہی ہے؟"

یکایک صحیفۂ مقدس کی وہ چند سطور جو وہ بچپنے میں سنا کرتی تھی۔ اس کے انتشار زدہ ذہن میں گونجنے لگیں۔ مکمل سات سال یہ سطور اسے یاد نہ آئی تھیں۔ مگر آج — آج وہ سب کی سب اس کے پردۂ ذہن پر نہایت جلی حروف میں رونما تھیں۔ وہ سطور اس کے حال کی آئینہ دار تھیں اور ساتھ ہی اس سزا کی طرف اشارہ کناں تھیں جو اسے عنقریب ملنے والی تھی: "لکھا ہے:

— میں اکثر تیری جوانی کی الفت اور تیرے بیاہ کی محبت کو یاد کرتا ہوں —۔

'کیونکہ مدت ہوئی کہ تو نے اپنے جوئے کو توڑ ڈالا اور اپنے بندھنوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور کہا کہ میں ہرگز تیری تابع نہ رہوں گی۔

ہاں، ہر اونچے پہاڑ پر اور ہر ایک ہریالے اور سایہ دار درخت کے نیچے تو بدکاری کے لیے لیٹ گئی!'

"لکھا ہے:

میں اپنے یاروں کے پیچھے جاؤں گی جو مجھ کو روٹی، پانی اور اونی اور کتانی کپڑے اور روغن و شربت دیتے ہیں،'

'تو کیونکر کہتی ہے، میں ناپاک نہیں ہوں؟ وادی میں اپنی روش دیکھ اور جو کچھ تو نے کیا اسکا جائزہ لے۔ تو تو تیز رو اونٹنی کی مانند ہے جو ادھر اُدھر دوڑتی ہے۔ تو مادہ گورخر کی کی مانند ہے جو بیابان میں آوارگی کی عادی ہے۔ اور جو شہوانی جوش و بدمستی میں ہوا کو سونگھتی ہے۔ بدمستیوں میں بے راہروی سے اسے کون روک سکتا ہے؟"

"لکھا ہے:

"اس نے مصر کی سرزمین میں بدکاری پر بدکاری کی۔"
وہ اپنے ان یاروں پر مرنے لگی جن کا بدن گدھوں کا سا اور جن کا انزال گھوڑوں کا سا تھا۔ اس طرح تو نے بھی اپنی جوانی کو شہوت پرستی میں برباد کیا۔ اس وقت کو یاد کر جب مصری عشاق تیری جوانی کی چھاتیوں کے سبب سے تیرے پستان ملتے تھے۔"

"اوہ!" وہ چلائی۔ "وہ بدکار میں ہی ہوں! وہ بدکار میں ہی ہوں!"
"اور یہ بھی لکھا ہے۔

"لیکن، تو نے تو بہت سے یاروں کے ساتھ بدکاری کی ہے۔"
"اور کیا اب بھی تو میری طرف رجوع کرے گی؟ خداوند نے کہا۔"

"اور میری سزا کے متعلق بھی تو لکھا ہے۔
"(اے بدکار عورت) دیکھ میں ان یاروں کو جن سے تیری جان بیزار ہو گئی ہے، ابھاروں گا کہ تجھ سے مخالفت کریں اور ان کو بلاؤں گا کہ تجھے چاروں سے گھیر لیں۔"
"میں عدالت ان کو سپرد کروں گا اور وہ اپنے آئین کے مطابق تیرا فیصلہ کریں گے۔ وہ غضب ناک ہو کر تجھ سے پیش آئیں گے اور تیری ناک اور تیرے کان کاٹ ڈالیں گے اور تیرے لواحقین اور پس ماندگان بھی تلوار سے مارے جائیں گے!""
"اور یہ بھی لکھا ہے
"رب الافواج فرماتا ہے، دیکھ! میں تیرا دامن اٹھا دوں گا۔ اور قوموں کو تیری برہنگی

اور مملکتوں کو تیرا ستر دکھلاؤں گا اور نجاست تجھ پر ڈلواؤں گا اور تجھ کو رسوا کروں گا — ہاں، تجھے انگشت نما کروں گا۔ تیری نادمایئں روئیں گی اور سینہ کوبی کریں گی!"

"لیکن نوشتۂ ربانی پر کیوں کر اعتبار آئے؟" کرائسسس نے اپنے تیئں دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "کیا کسی دوسری جگہ نہیں لکھا ہے۔

جب تمہاری بہو بیٹیاں بدکاری کریں گی تو میں ان کو سزا نہ دوں گا!"

"اور کیا ایک اور جگہ صحیفۂ مقدس ہمیں نصیحت نہیں کرتا؛

اپنی راہ چلا جا۔ خوشی سے اپنی روٹی کھا اور خوش دلی سے اپنی مے پی کیونکہ خداوند تیرے اعمال کو قبول کر چکا ہے۔

تیرا لباس ہمیشہ سفید ہو اور تیرا سر چکناہٹ سے خالی نہ ہو،

"اپنی بطالت کی زندگی کے سب دن جو خداوند نے تجھے بخشے، اپنی بیوی کے ساتھ عیش میں بسر کر اور اس زندگی میں اور اس محنت کے دوران میں جو تو نے دنیا میں کی تیرا یہی بخرہ ہے۔ جو کام تیرا ہاتھ کرنے کو پائے اسے مقدور بھر کر کیونکہ پاتال میں جہاں تجھے بالآخر جانا ہے نہ کام ہے نہ منصوبہ، نہ علم نہ حکمت!"

وہ کانپی اور آہستہ سے دوہرانے لگی۔

"پاتال میں . . . جہاں تجھے جانا ہے نہ کام ہے نہ منصوبہ، نہ علم نہ حکمت!"

"اور لکھا ہے۔

"واقعی روشنی دل خوش کن ہے اور نورِ آفتاب نہایت خوشگوار!

"پس اے جوان! تو اپنی جوانی میں خوش ہو۔ اور اس کے بخشے ہوئے ایامِ زندگی میں اپنا جی بہلا اور اپنے دل کی راہوں میں اور اپنی آنکھوں کی منظوری میں چل . . . . . . کیونکہ جب بشر اپنے ابدی مکان میں چلا جائے گا تو ماتم کرنے والے

گلی گلی پھریں گے۔ پیشتر اس کے کہ چاندی کی ڈوری کھولی جائے اور سونے کی کٹوری توڑی جائے۔ اور گھڑا چشمہ پر پھوڑا جائے اور حوض کا چرخ ٹوٹ جائے اور خاک خاک سے جا ملے جس طرح آگے ملی ہوئی تھی۔'

لرزہ براندام ایک بار پھر اس نے آہستہ سے کہا: یا خاک خاک سے جا ملے جس طرح آگے ملی ہوئی تھی۔"

ــــ اور جس دم اس نے اپنے اضطراب انگیز خیالات کی بے پناہ رو کو روکنے کے لیے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا تو یکایک اسے اپنی سلگتی ہوئی جلد کے نیچے غیر متوقع طور پر ایک مردہ کھوپڑی کھٹکتی محسوس ہوئی ــ مردہ کھوپڑی ــ جس کی کنپٹیاں اور آنکھوں کے سوراخ اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ پیشانی کے نیچے ناک غائب تھی اور جبڑے بڑھے ہوئے تھے ــــ

وہ ہانپ گئی۔ کیا اس کا یہ حشر ہونے والا تھا؟

معاً ایک وضاحت افروز تابندگی کے جلو میں اسے اپنی لاش نظر آئی اور اس کے ہاتھ بے اختیار اس کے جسم کو سہلانے لگے۔ شاید وہ اس لمحہ اس دردناک خیال کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی جو بظاہر سادہ تھا لیکن ابھی ابھی پہلی بار اس کے ذہن میں آیا تھا ــــ یہ کہ اس کے اندر ایک استخوانی ڈھانچہ ہے جو نہ موت کا، نہ قلب ماہیت کا اور نہ انجام ہستی کا نتیجہ ہے بلکہ ایک علیحدہ وجود ہے۔ جو انسان تمام عمر اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے۔ جو جسد انسانی کا ایک کبھی نہ جدا ہونے والا عفریت ہے اور یہ کہ زندگی کی تمام عمارت ازل سے قبر کی ہی ایک جاندار علامت ہے۔

زندہ رہنے، دنیا کو ایک بار پھر دیکھنے اور ہر شے کو از سر نو شروع کرنے کی ایک زبردست خواہش نے دفعتہً اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ موت کے روبرو اس کی زندگی کی یہ سرکشی اس اعتراف کے مترادف تھی کہ اس دن کی شام تک اس کے زندہ رہنے

کا کوئی امکان باقی نہ تھا جو طلوع ہو رہا تھا اور یہ کہ وہ اپنے موجودہ حسن و جمال، جسم و قوی دماغ اور ہوس کارانہ رنگینیوں سے بھرپور زندگی کو عین عالمِ جوانی میں ایک دم ساکت و جامد ہونے سے کسی طرح نہیں روک سکتی۔ اس کی حیاتِ جمیل کی ہر شے زوال و انحطاط کی طرف ناقابلِ فہم طور پر مائل و آمادہ تھی۔

اتنے میں دروازہ آہستہ سے کھلا اور دماغر تیس اندر داخل ہوا۔

جہاں کا خمیر تھا

"دماطرئیس!" وہ چلائی اور آگے کو بڑھی۔

لیکن نوجوان حبشنی کو عمداً آہستہ سے گرانے کے بعد بے حرکت کھڑا رہا۔ وہ اسے اس قدر سکون اور اطمینان سے دیکھ رہا تھا کہ کرئسس یکایک سناٹے میں آگئی۔ وہ دل ہی دل آس لگائے بیٹھی تھی کہ وہ کمرے داخل ہوتے ہی اس کی طرف دیوانہ وار لپکے گا، اسے سینہ سے لگاکر چوم چوم لے گا مگر اس بے درد نے تو ایک ہاتھ تک بھی آگے کو نہ بڑھایا۔

دماطرئیس بدستور ساکت کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر دانستہ طور پر کچھ اس طرح خاموش کھڑا رہا گویا وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہر طرح کی خدمت کے لیے حسبِ وعدہ اس کے پاس آپہنچا ہے لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اس سے کچھ بھی مانگنے پر آمادہ نہیں۔ وہ دریچے کی طرف چار قدم بڑھا اور پھر جھک کر دریچے میں سے دن چڑھتا دیکھنے لگا

کرئسس ایک بسنہ چوکی پر بیٹھے بیٹھے اسے نہایت سوگوار نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

یکایک دماطرئیس اس طرح بولنے لگا گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

"کتنا اچھا ہوتا اگر صورت حال مختلف ہوتی! موت کے اس لمحۂ تاریک میں طلبِ تعیش کا اظہار چہ معنی؟ حیران ہوں کہ ابتدا سے اپنے اس حسرت ناک انجام کا اسے اندیشہ پیدا نہ ہوا! حیرت ہے کہ اس نازک لمحہ میں بھی وہ میرا استقبال معشوقانہ انداز میں کر رہی ہے، حالانکہ میرے لیے تو وہ عاشقانہ مہم ہمیشہ کیلئے ختم ہو چکی اور مجھے بے حد افسوس ہے کہ وہ مہم اس المیہ انداز میں اختتام پذیر ہوئی۔ مجھے احساس ہے کہ کرئسس کی خطا صرف یہ تھی کہ اس نے اس آرزوئے طلب کا اظہار نہایت بے باکی سے کیا تھا۔ جو ہر عورت کے دل میں موجزن رہتی ہے۔ کاش یہ ضروری نہ ہوتا کہ عوام الناس کے جذبات تنفّر کے

ازالہ کے لیے کسی کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے ورنہ میں اس بدمست شباب اور خود سر عورت کی جلاوطنی کے لیے کوشش کرتا تاکہ وہ اپنی جوانی کی بقیہ خواہشات کو بھی پورا کر سکے۔ افسوس اس کی بداعمالیوں کا شہر میں اس قدر زیادہ چرچا ہو چکا ہے کہ اب اس کو موت کے پنجہ سے بچانے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ بوالہوسیوں اور خود غرضانہ ہوس رانیوں کا بالآخر یہی انجام ہوتا ہے —"

"جنسی شغف خود غرضی سے پاک ہو تو حیاتِ انسانی کا ایسا عبرتناک انجام نہیں ہوتا...
... بے شک ہمیں زندگی میں بہت سی معشوقاؤں سے پیار اور محبت کرنی چاہیے بشرطیکہ مقدس دیوتاؤں کے فضل و کرم کے طفیل ہم اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کریں کہ سب عورتیں ایک سی ہیں اور ان کے لب، ان کے سینے اور ان کے اندام بھی ایک ہی سے ہیں!"

حیاتِ معاشقہ سے متعلق اپنے اخلاقی نظریہ کو نہایت جامع انداز میں بیان کرنے کے بعد وہ حسبِ معمول اپنے ذاتی مسائل کے متعلق سوچنے لگ گیا۔ اچانک اسے وہ عشائیہ یاد آگیا جو گذشتہ شام اس کے ایک مداحِ فن نے دیا تھا۔ اور جس میں وہ دعوت قبول کرنے کے باوجود شریک نہ ہو سکا تھا۔ واقعات کے تیز بہاؤ میں وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اور اب وہ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی خاطر طرح طرح کے اخلاقی بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے بعد اسے اپنے درزی کا خیال آیا جو اپنی قدامت پرستی کی وجہ سے اس کے حسبِ منشا جدید طرز کی قبائیں نہیں سی سکتا تھا۔ کیا وہ اس درزی کے ہاتھ اپنا جہاندیدہ طرز شناس غلام بیچ دے؟

دماطریس کا ذہنِ رسا اس وقت حد درجہ بیدار تھا۔ دفعتہً اس نے اپنی پنسل نکالی اور آن کی آن میں اس کی نوک سے دیوار پر راغوس اور ٹائشز کی باہمی آویزش کا ایک رف اسکیچ بنا ڈالا۔ یہ تمسخر انگیز تصویر ابھی ٹھیک طور پر مکمل نہ ہوئی تھی کہ دروازہ پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر دماطریس اطمینان سے گیا اور دروازہ کھول دیا۔ جلّاد دو مسلح سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

"بس ایک چھوٹا سا پیالہ لایا ہوں!" وہ ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ شاہی عاشق سے مخاطب ہوا۔

مگر دماطریس نے کوئی جواب نہ دیا۔

غم و الم سے نڈھال کراٹسس نے سر اٹھایا۔

"میری بچی آ"، جیلر المناک لہجہ میں بولا۔ "وقت آ پہنچا۔ آرام دینے والا جھوٹا ٹوٹ گیا۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ تو صبر سے اسے پی لے۔ گھبرا مت۔ تجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوگا۔"

کراٹسس نے دماطریس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ سبز حلقوں میں گھری ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں سے اسے متواتر دیکھتے ہوئے کراٹسس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔ پیالہ لیا اور آہستہ سے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ اب زہر پی رہی تھی جس کی تلخی اور اذیت رسانی کو کم کرنے کے لیے شہد اور چند نشہ آور دواؤں کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔

آدھا پیالہ ختم کر چکی تو اس نے بقیہ زہر دماطریس کو نہایت ڈرامائی انداز میں پیش کیا مگر نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے کراٹسس کی جذباتی پیشکش رد کر دی۔

اس کے بعد غلین نے پیالہ دوبارہ منہ کو لگایا اور اس کی تلچھٹ تک نوش کر گئی۔ فوراً ہی ایک اذیت ناک مسکراہٹ جس میں شدید حقارت کی بھی آمیزش تھی۔ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟" اس نے جیلر سے پوچھا۔

"حجرے میں اِدھر اُدھر گھوم میری بچی! گھومتی جا۔ حتّٰی کہ تیری ٹانگیں بوجھل ہو جائیں

پھر چت لیٹ جانا اور زہر اپنا کام شروع کر دے گا۔

کرائٹس اٹھی اور دریچہ کی طرف بڑھی ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیا۔ اور دوسرا ماتھے پر رکھ لیا اور پھر ایک بجھی ہوئی نگاہ صبح کے ارغوانی دھندلکے پر ڈالی۔ افق مشرق پر ایک سیلاب رنگ ہویدا ہو رہا تھا۔ ایک طویل سرمئی لکیر موج آب کی مانند افق پر محیط تھی۔ اس کے اوپر کا آسمان طرح طرح کی رنگینیوں کی باہمی آویزش سے لاجوردی ہو رہا تھا۔ اچانک یہ رنگ دار تہیں آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنے لگیں اور ان کی جگہ ایک زرتار لکیر پیدا ہو گئی اور جلد ہی ختم ہو گئی۔ پھر ایک گلابی جھلک پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ پھیلنے لگی حتےٰ کہ اداس سحر کے بطن سے سورج دیوتا اپنی خوں رنگ کرنوں کے لاؤ لشکر سمیت نکل آیا۔

" لکھا ہے :

" روشنی دل خوش کن ہے اور . . . . ! "

جب تک ٹانگوں نے ساتھ دیا وہ اسی انداز میں کھڑی رہی۔ جونہی ٹانگیں ڈگمگانے لگیں سپاہیوں نے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ اس کے بعد عمر رسیدہ جیلر نے اس کی پوشاک کی تہوں کو سنوارا۔ پھر [illegible]؟"

" نہیں !" اس نے جواب دیا۔

پھر اس نے گھٹنے دبائے اور پوچھا " اب کچھ محسوس ہو رہا ہے ؟"

کرائٹس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے بعد اس کا سر اور منہ (ہاتھ مردہ ہو چکے تھے) کچھ اس انداز میں ہلے گویا ان کی مالک کرائٹس زندگی کے اس آخری بے کیف لمحے میں یکگونہ رنگینیٔ نشاط پیدا کرنے کے لیے دماطریس کی طرف بڑھنا چاہتی تھی۔ مگر اس سے قبل کہ دماطریس اس کی آخری ادائے ناز کا کچھ جواب دیتا۔ اس کا جسم بیٹھ بیٹھ سا گیا اور اس کی آنکھوں کا نور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

جلاد نے فوراً اس کی پوشاک سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔ ایک سپاہی نے اس

مفروضہ کے پیشِ نظر کہ کرُاسس اور دماطریس گذرے ہوئے عہدِ نازک میں ایک دوسرے سے وابستہ رہ چکے ہیں، تلوار سے اس کے بالوں کی ایک لٹ کاٹ دی اور وہ فرش پر آرہی۔ دماطریس نے لٹ اٹھائی۔ وہ لٹ نہیں تھی بلکہ خود کرُاسس تھی۔ اس کے جمالِ تاباں کی ایک زریں یادگار تھی۔ اس کے حسین وجود کی ایک جامع نشانی تھی۔ اس نے وہ گرم گرم لٹ اپنی ایک انگلی اور انگوٹھے سے پیٹ لی؛ اس کا ایک ایک بال الگ کیا اور پھر ان سب کو اپنے پاؤں تلے مٹی میں مسل ڈالا۔

جاوداں کرائسس

اپنے نگار خانہ میں واپس پہنچنے کے بعد دماطریس نے فوراً ہی مصروفِ کار ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے نگار خانہ میں جگہ جگہ سنگ مرمر کے بلاک نا تمام مجسمے اور مچانیں بکھری پڑی تھیں چھینی اور ہتھوڑا لے کر وہ ایک نا تمام مجسمے پر کام کرنے لگا۔ وہ ایک گھوڑے کا قوی ہیکل مجسمہ تھا جسے پوزیدن کے مندر میں نصب کیا جاتا تھا۔ وہ اگرچہ کام کیے جا رہا تھا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا دل فی الحقیقت کہیں اور مصروف ہے۔

تین دن پیشتر اسی زیرِ تکمیل مجسمہ کی ایک ایک عضلاتی تفصیل اس کے ذہن میں موجود تھی لیکن آج جبکہ کرائسس مر چکی تھی اس کی ہر شئے بدلی بدلی معلوم ہوتی تھی۔ دل کسی کام میں نہ لگ رہا تھا بلکہ تیشہ و سنگ سے ہٹ کر اور ہی الجھنوں میں گرفتار تھا۔ سنگِ مرمر اور اس کے درمیان ایک ناپسندیدہ پردہ حائل ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر تنگ آکر اس نے اپنے اوزار پرے پھینک دیئے اور ایک شدید عالمِ اضطراب میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

یکایک اس نے صحن خانہ عبور کیا اور ایک غلام کو بلا کر کہا "غسل کا انتظام کرو، مجھے نہلاؤ اور پھر میرے بدن کو معطر کرو۔ آج میں سپید پوشاک پہنوں گا۔ اور ہاں لوبان بھی سلگا دو!"

غسل کے بعد غلام اپنے آقا کو کپڑے پہنا چکا تو دماطریس نے اپنے دو دوسرے غلاموں کو بلوا کر کہا "شاہی قید خانے تک جاؤ، جیلر کے پاس یہ خمیری مٹی لے جاؤ، کہنا وہ مٹی کو اس حجرہ میں رکھ دے جس میں آج صبح فورطینز کرائسس فوت ہوئی۔ اگر نعش کو اب تک سپردِ خاک نہیں کیا گیا تو کہنا" وہ میرے آنے تک کچھ نہ کریں۔ جاؤ بھاگو!"

اپنی پیٹی میں ایک اوزار پھنسا کر اس نے وہ وسطی دروازہ کھولا جو شاہراہ دراموس کی طرف کھلتا تھا۔

دہلیز پر اس نے ابھی قدم رکھا ہی تھا کہ افریقی دوپہر کی خیرہ کن دھوپ نے اسے چند لمحوں کے لیے رک جانے پر مجبور کیا۔

اس وقت شاہراہ اور اس کے دُو رویہ مکانات کو سپید نظر آنا چاہیئے تھا مگر سورج کی عمودی شعلہ افشانیوں نے سطحِ ارض پر سایوں کا ایک ایسا سیلاب پیدا کر رکھا تھا جس کے اثر سے چونے کی دیواریں اور سڑک کے پتھر جھِل جھلّل کر رہے تھے اور ان سب سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ فضا میں بڑے بڑے رنگ دار دھبے تیرتے نظر آ رہے تھے اور ان کی وجہ سے عمارات کے پلیٹ مناظر پر سائے کانپ رہے تھے شاہراہ کی داہنی منڈیر خم کھاتی ہوئی جگہ جگہ سے فضا میں گم ہو رہی تھی۔ ایک سنگ میل کے قریب ایک کتّا بیٹھا تھا اور دھوپ نے اس کا رنگ قرمزی کر رکھا تھا۔

معاً ماطریس کا دل اس تمام نظارے کو دیکھ کر جذبات تحسین میں ڈوب گیا۔ اس منظر میں اسے اپنی نئی زندگی کے دلفریب آغاز کی علامات نظر آ رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ خاموشی اور سکون میں سرشار راتوں کا کافی وقت وہ تنہا گذار چکا۔ اپنے فکر کی جلا کے لیے شعاعِ ماہتاب کا وہ کافی عرصے [illegible] محتاج رہ چکا اور اپنے نصب العین فن کی پرورش کے لیے حسنِ خوباں کی نازک اندامیوں سے وہ کافی حظوظ حاصل کر چکا مگر اس تمام کاوشِ انہماک کے باوجود اس کا فن ابھی معراجِ کمال کو نہ پہنچ سکا تھا۔ شاید وہ منزلِ مقصود اب دُور نہ تھی۔

اس المناک مہم کے دوران میں جو تین دن متواتر اس کے ذہن کو بیکار کئے رہی آج پہلی بار زندگی کی بادِ لطیف اسکے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ کٹھن آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلا تھا۔ اس نے اپنے سے یہ عہد کرنا نہایت مناسب خیال کیا کہ۔

”میں اب کبھی اپنے بنیادی نظریہ حیات سے منحرف نہ ہوں گا“

اس نظریہ کے مطابق دوسروں کے سامنے بے تکلف ہونا معیوب تھا۔ وہ آج اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ دنیا میں صرف وہی شے لائق تحسین ہے جو بالآخر سنگ مرمر، رنگ، اور شعر کے قالب میں ڈھل کر انسانی دل و دماغ کو دائمی طور پر احساس و فکر کی دولت سے سرفراز کر سکے۔ رہا حسنِ خوباں — تو وہ اس کے نزدیک ایک نہایت مبہم اور غیر مستقل شے تھی جو غم و مسرت کے زیر اثر اپنی ہیئت بدلتی رہتی تھی۔

کچھ ایسے ہی دانشورانہ خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ قید خانے کے دروازہ تک پہنچ گیا۔ وہاں پر اس کے انتظار میں دو غلام کھڑے تھے۔

"حضور! ہم مٹی لے آئے۔ لاش ابھی بستر پر ہی پڑی ہے۔ کسی نے اسے نہیں چھیڑا۔ جیلر سلام عرض کرتا تھا۔" وہ بولے۔

نوجوان نہایت خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ ایک لامبے برآمدے میں سے ہوتا ہوا وہ ایک زینہ کی چند سیڑھیاں چڑھا اور پھر کمرہ میں داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔

لاش بستر پر پڑی تھی۔ سر پر نقاب، ہاتھ پھیلے ہوئے اور پاؤں آپس میں ملے ہوئے تھے۔ انگلیوں میں انگشتریاں اور کلائیوں پر کنگن آراستہ تھے۔ پاؤں کے ناخنوں پر اب بھی سرخ پالش کی تہہ نظر آتی تھی۔

بالآخر دماطریس رخ سے نقاب سرکانے کے لیے آگے کو بڑھا۔ وہ نقاب کو بمشکل چھو بھی نہ پایا تھا کہ کوئی ایک درجن مکھیاں نقاب کے شگاف سے بھنبھناتی ہوئی نکلیں وہ کانپ گیا۔ بہر کیف اس نے سپید اونی کپڑا چہرے سے ہٹا کر سرکا دیا۔

رفتہ رفتہ کرائسس کے چہرہ پر وہ لازوال کیفیتِ اظہار نمودار ہو چکی تھی۔ جو مردوں کے بالوں اور ہونٹوں پر موت اکثر پیدا کر دیتی ہے۔ رخساروں کی نیلگوں سپیدی میں متعدد نیلی رگوں کی وجہ سے ایک مرمریں جھلک چہرے پر عیاں تھی۔ باریک ہونٹوں پر نازک سوراخ بنے ہوئے تھے۔ کان غیر مادی حد تک نازک معلوم ہوتے تھے۔ خواب کی حالت میں یا بیداری

کے عالم میں دماطرتیس نے ایک انحطاط پذیر جلد کو بھی اس قدر تابندہ و درخشاں نہ دیکھا تھا۔

یکایک اسے کرٹیمس کے وہ الفاظ یاد آئے جو اس نے اولین ملاقات پر کہے تھے، "تو نے ابھی صرف میرا رُخ زیبا دیکھا ہے تجھے کیا معلوم ہیں اس کے علاوہ کس قدر دلفریب و ہوش ربا ہوں؟ کیسے کیسے عناصر تحیّر و استعجاب میرے وجود خالقہ میں پوشیدہ ہیں؟ تجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں؟" ان الفاظ کا یاد آنا تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اسی دلفریب و ہوش ربا حُسن کو دیکھنے کا متمنی نہ تھا۔ چنانچہ وہ عنقریب اس حسن کو دیکھنے والا تھا وہ اپنے سہ روزہ نفسانی خلفشار کو ایک ایک یادگار صورت دینا چاہتا تھا جو خود اس کے بعد بھی باقی رہے۔ چنانچہ اب وہ اس دلفریب جسم کو بے نقاب کرنے کے بعد اس مخصوص زہد شکن انداز میں لٹانے والا تھا جو اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ اس بے جان لاش کو اسی پرکشش انداز میں اپنے سامنے رکھ کر ایک ایسا مجسمہ تخلیق کرنے کا خواہاں تھا جو فی الحقیقت ایک حیات جاوداں کا مظہر ہو سکے۔

اس نے سب سے پہلے گیسوئے اور پیٹی کھولی اور پھر لباس! — جسم خاصا بھاری نظر آتا تھا۔ پستان اب بھی مرتعش تھے۔ بانہیں ڈھلکی ہوئی تھیں۔ اس نے پوشاک کو جسم سے اتار کر پرے پھینک دیا تو عریاں جسم بیٹھ سا گیا۔

سرد بغلوں میں ہاتھ ڈال کر دماطرتیس نے جسم کو سرہانے کی طرف کھینچا۔ سر کو بائیں رُخسار کی طرف ڈھلکا کر اس نے تابدار گیسوؤں کو پشت کے نیچے پھیلا دیا۔ پھر دایاں بازو اٹھایا اور کلائی کو پیشانی پر رکھ دیا۔ انگلیاں کچھ اس انداز میں بند کر دیں کہ وہ تکیہ کے کنارے کو بھینچے ہوئے معلوم ہونے لگیں۔ اور ساتھ ہی ڈوحبدار اور عضلاتی شکنیں کان اور کاندھے سے ایک ساتھ ابھر کر دائیں پستان کو ایک پھل کی طرح اٹھائے ہوئے نظر آنے لگیں۔

سب سے آخر میں اس نے ٹانگوں کا نظام درست کیا حتٰی کہ ایک ٹانگ پہلو کے بل آگے کو بڑھی ہوئی معلوم ہونے لگی اور دوسری دوہری ہو کر گھٹنے کے بل اوپر کو اٹھی ہوئی کولہے کو

چھوٹی ہوئی نظر آنے لگی چند ایک مزید تفصیلات درست کرنے کے بعد اس نے کمر کو خفیف سا بَل دیا۔ دایاں پاؤں کو سیدھا کیا اور پھر کنگن، پازیب، ہار اور انگشتریاں اتار ڈالیں —— تاکہ کوئی چیز کریٹسس کے جسم کی عریانی اور اس کی بے عیب آہنگی پہ بار ثابت نہ ہو۔

دماطریس کا نمونہ بت تراشی اس کے سامنے جلوہ فگن تھا۔

اس نے گیلی مٹی میز پہ رکھی۔ اسے دبایا۔ گوندھا۔ لمبا کیا۔ ادھر ادھر چند ہاتھ مارے اور ایک انسانی شکل معرضِ وجود میں آگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پھرتیلی فن کارانہ انگلیوں نے ایک بدنما دیو پیدا کر دیا۔

دماطریس نے ایک گہری نظر ڈالی ——

بے جان لاش ایک شدید جنسی انتشار میں بیکل پڑی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن خون کی ایک باریک دھار دائیں سوراخِ بینی سے نکل کر اس کے ہونٹ کی طرف رواں تھی اور قطروں کی شکل میں نیم دامنہ کے نیچے ٹپک رہی تھی۔

وہ اپنا کام نہایت یکسوئی سے کرتا گیا ——

بے جان مٹی میں زندگی پیدا ہو رہی تھی۔ مٹی میں سے ایک انسانی شکل ابھر رہی تھی حتیٰ کہ وہ زندگی سے بھرپور نظر آنے لگی۔ بت تراش [illegible] کبھی مٹی کے [illegible] کے بالائی حصہ پہ لہراتا تھا اور کبھی بت کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتا گویا وہ مائل ہم آغوشی ہے رانوں کے پٹھوں میں تشدد آمیز ابھار پیدا ہو رہا تھا اور تلوے خمیدہ ہوئے جا رہے تھے۔

جب بطنِ ارض سے ظلمتِ شب ابھر کر پست بام حجرہ کو تاریک کرنے لگی تو دماطریس اپنا مجسمہ مکمل کر چکا تھا۔ چار غلام اس خام مجسمہ کو اٹھا کر اس کے نگار خانہ میں لے گئے۔ اسی شام اس نے چراغ کی روشنی میں مجسمے کے لیے فارنین سنگ مرمر کا بلاک حسب منشا کٹوایا اور اس کے بعد وہ ایک سال تک بھی مرمریں مجسمہ مکمل نہ کر سکا۔

ہمدردی

"جیلر، جیلر، ہمارے لیے دروازہ کھولو!"

رعودَث اور مرطوصیلہ قید خانہ کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔

کسی نے کواڑ تھوڑے سے کھولے: "کیا بات ہے؟"

"ہم اپنی سہیلی کو دیکھنا چاہتی ہیں"، مرطوصیلہ نے جواب دیا۔ "ہم کرِشتس ــــ بیچاری کرِشتس کو دیکھنا چاہتی ہیں جو آج صبح فوت ہوئی۔"

"تم لوگ اسے نہیں دیکھ سکتیں! جاؤ، اپنی راہ لو!"

"براہِ کرم ہمیں اندر آنے دو۔ کسی کو پتہ نہ چلے گا۔ ہم کسی کو نہیں بتائیں گی۔ وہ ہماری مہربان تھی ہمیں ایک بار ضرور اُسے دیکھ لینے دو! ہم زیادہ دیر نہیں لگائیں گی ہم ہرگز شور نہ مچائیں گی!"

"اور اگر میں پکڑا گیا؟ یا تمہاری وجہ سے مجھے سزا مل گئی تو؟ تم دونوں کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔"

"تم پکڑے نہیں جاؤ گے۔ تم اکیلے ہو۔ یہاں کوئی اور مجرم نہیں جو تمہیں دیکھ لے گا۔ تم نے تمہارے دل نے ہی بھجوا دیے۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔ مہربانی کرو اور ہمیں اندر آنے دو۔"

"اچھا تو اندر آ جاؤ۔ دیکھنا، زیادہ دیر نہ لگانا۔ یہ رہی چابی۔ تیسرے دروازہ پہ چلی جاؤ۔ واپس جانے لگو تو مجھے اطلاع کر دینا۔ بہت دیر ہو چکی۔ مجھے سونا بھی ہے۔"

نرم دل بوڑھے نے اپنی پیٹی سے ایک نئی چابی نکال کر ان کے حوالے کر دی اور وہ دونوں کمسن کنواریاں نیم روشن برآمدوں میں دبے پاؤں بھاگ پڑیں۔ جیلر اپنی اقامت گاہ کو چلا گیا اور اس نے مزید پہرا دینا مناسب نہ سمجھا۔ ہیلنائی تاجداروں کے مصر میں چونکہ قید کی سزا رائج نہیں تھی اس وجہ سے بوڑھے جیلر کی محافظت میں سزائے موت والے مجرم ہی کبھی کبھار آتے ورنہ قید خانہ عموماً ویراں رہتا۔

چابی ابھی قفل میں ہی تھی جب رعودث نے اپنی رفیقہ سے کہا "مرطو! میں تو اسے نہ دیکھ سکوں گی مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے پہلے تو اندر جا!"

مرطوصیلہ نے دروازہ کھولا اور ایک نظر اندر دیکھ لینے کے بعد چلائی "تو ابھی اندر مت آ۔ برآمدہ میں ہی ٹھہر۔ اندر مت جھانکنا!"

لاش اب بھی اسی وجد آفریں انداز میں پڑی تھی جس طرح کہ دماطریس سحیات جاوداں کے مظہر اپنے مجسمہ کی خاطر بنا کر چھوڑ گیا تھا۔ چونکہ لطفِ بے پایاں کی پیدا کردہ کیفیت بدنی اذیت شدید سے پیدا ہونے والی ہیئت جسمانی سے متشابہ ہوتی ہے مرطوصیلہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس ولد وزاذیت رسانی اور کس تکلیف و درد کے سبب کر اُس کا جسم اس حیرت ناک انتشار میں مبتلا تھا۔ بہرکیف وہ دبے پاؤں آگے کو بڑھی۔

نتھنوں سے خون اب بھی جاری تھا مگر بدن کی جلد نہایت بے عیب اور سپید تھی پستانوں کے منہ ناف کی طرح اندر کو دھنس گئے تھے۔ جسم پر گلابی جھلک کا نام و نشان تک نہ تھا اور بدیں سبب لاش پر مورتی کا گماں ہوتا تھا۔ البتہ ملائم پیٹ پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے رنگ دار نشان تھے جو ظاہر کرتے تھے کہ تازہ تازہ سرد ہونے والے جسم کے اندر پیدا ہونے والی کروڑوں نئی زندگیوں نے مردہ جسم پر اپنا حقِ وراثت قائم کرنا شروع کر دیا ہے۔

مرطوصیلہ نے سر د بازو اٹھایا اور پہلو کی طرف ڈھلکا دیا۔ اس نے چاہا کہ وہ بائیں ٹانگ کو بھی سیدھی کر دے لیکن چونکہ گھٹنے کا جوڑ الکم وبیش منجمد ہو چکا تھا وہ ٹانگ کو ٹھیک طور پر سیدھا نہ کر سکی۔

"رعودث!" وہ آہستہ سے بولی "آ! اب تم آ سکتی ہو"

بچی جس کے جسم پر کپکپی طاری تھی، کانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ کھچا کھچا سا تھا آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ جوں ہی وہ قریب ہوئیں، ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور زار و قطار رونے لگیں۔

"آہ کرائسس! آہ کرائسس!" رعودث بار بار دوہرا رہی تھی۔

وفورِ دحشت میں وہ ایک دوسرے کو چومنے لگیں۔ ان کے بوسے طویل مگر پاکیزہ تھے۔ ان کے ہونٹ آنسوؤں میں دہشت زدہ روح کی تلخی کا سا مزہ محسوس کر رہے تھے۔ وہ بیہم روئے جا رہی تھیں اور ایک دوسرے کو نہایت ملول نظروں سے دیکھ رہی تھیں کبھی کبھی وہ بیک وقت ایک دوسرے کو کچھ کہنے کے لیے لب کشائی کرتیں مگر ان کی آوازیں حلق میں اٹک کر رہ جاتیں اور الفاظ آہوں کی شکل میں برآمد ہوتے۔

"اف! کرائسس سے ہمیں کس قدر محبت تھی۔ وہ ہماری سہیلی ہی نہ تھی، ہماری ماں تھی — نوجوان ماں!"

"بہت ہی جوان ماں!" رعودث نے دوبارہ زور دے کر کہا۔

مرطو نے رعودث کو لاش کی طرف کھینچا اور پھر آہستہ سے کہا "اسے بوسہ دو!"

پلنگ پر ہاتھ رکھ کر وہ دونوں جھکیں اور باری باری انہوں نے سرد پیشانی کو چوم چوم لیا۔

اس کے بعد مرطو صبلہ نے کرائسس کے بالوں کو ہاتھ میں لے کر کہا: کرائسس! میری پیاری کرائسس! اے کہ تو سیوطہ تمام انات میں سب سے زیادہ حسین اور مقبول تھی۔ اے کہ تو جو ایک دیوی کی طرح قابلِ پرستش تھی۔ تو اب کہاں ہے؟ کس دنیا میں ہے؟ تجھ پہ کیا گذری؟ تو اور تیرا یہ حشر؛ یہ انجام؟"

ایک لمحہ خاموش رہ کر مرطو پھر بولی "اے کرائسس اسکندریہ! تو ایک منبعِ جود و کرم تھی۔ تو مظہرِ لطفِ عام تھی — تیرا ذہن تمام اثمارِ جہاں سے زیادہ شیریں، تیری آنکھوں کا نور مہر روشنی سے زیادہ تابندہ، تیری جلد بذاتِ خود ایک پوشاک زربفت تھی۔ اس جلد پر ہوائے نفس کا ایک تعطرِ دل گداز کی طرح حاوی رہتی تھی۔ تیرے گیسوؤں کا پریشان ہونا طوفانِ آرزو کی بلاخیزیوں کا دوسرا نام تھا — یاد ہے، ہمیں اب تک یاد ہے تیری سپید

عریاں بانہوں کی بے پناہ گرفت جو ہمیں مقدس دیوتاؤں سے پناہ طلبی پر مجبور کرتی تھی۔"

رعودث کی باری آئی تو وہ دو زانو بیٹھ گئی اور بولی "کرائسس، کرائسس! تجھے کیا ہو گیا؟ ابھی کل ہی تو تو ہمارے پاس زندہ اور رجوان کھڑی تھی۔ تیرا دل بے شمار آنے والے ایام کی امید سے معمور تھا۔ اور اب تو ـــ تو میرے سامنے مردہ پڑی ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوت تجھے لب کشائی پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تو نے دنیا سے آنکھیں پھیر لیں اور ہمارا انتظار تک نہ کیا۔ کاش تجھے معلوم ہوتا کہ جب تو جام مرگ پی رہی تھی تو ہم دونوں دیوارِ زنداں کے سائے تلے تیرے غم فراق میں رو رہی تھیں۔ تیری قریب المرگ آنکھوں نے ضرور ہم میں سے کسی کو اِدھر اُدھر تلاش کیا ہوگا۔ اے کاش، تیری آنکھوں نے ہماری پُرنم اور دردمند آنکھوں کو دیکھا ہوتا۔"

نے نواز لڑکی متواتر رو رہی تھی کہ مغنیہ مرطوصیلہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر کہنے لگی "کرائسس، کرائسس! یاد ہے تو نے ایک بار کہا تھا کہ تو ہم دونوں کی شادی رچائے گی؟ دیکھ! آنسوؤں کے جلو میں ہمارا ملاپ ہو رہا ہے۔ ہاں ـــ تیری رعودث اور مرطوصیلہ کی یہ تقریبِ ارتباط بے حد اداس اور غم پاش ہے! کس قدر عجیب ہے یہ سماں انبساطِ محبت کی بجائے تیری موت نے ہمارے ہاتھوں کو آپس میں ملا رکھا ہے انگڑیاں' اب ہم کبھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں گی۔ ہم باہم مل کر تیرے لیے روئی ہیں ـــ اب ہم مل کر تیرے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کرنے کے لیے لے جائیں گی اور ہم مل کر اپنے بال تیرے مدفن 'کرائسڈین' پر بھینٹ چڑھائیں گی۔"

مرطوصیلہ نے خوبصورت لاش کو چادر سے ڈھانپ کر رعودث سے کہا "میرا ہاتھ بٹاؤ!"

دونوں نے بڑے ادب کے ساتھ لاش کو اٹھا کر چلنا چاہا مگر وہ بہت بھاری تھی اس لیے کمسن مغنیائیں اسے اٹھا نہ سکیں اور مجبوراً لاش کو زمین پر رکھ دینا پڑا۔

"ہمیں اپنے جوتے اتار دینے پڑیں گے۔" مرکلو بولی: "برآمدے سے ننگے پاؤں گذرنا ہوگا۔ جیلر یقیناً سو گیا ہوگا۔ وہ بدستور سویا رہا تو ٹھیک ورنہ جاگ گیا تو ہمیں روک دے گا۔ غزآئے گا کہ ہم نے اسے دھوکا دیا۔ ہم کامیاب ہوگئیں تو کل کی پروا نہیں۔ بستر کو خالی پا کر وہ ملکہ کے سپاہیوں کو بتلا دے گا کہ لاش دفنادی گئی جیسا کہ قانوناً روا ہے۔ رعوذشا! ڈرمت۔ ہمت کر۔ میری طرح اپنی پاپوش کو کمر بند میں دے لے۔ آ اور لاش کو گھٹنوں سے پکڑ اور پاؤں کو لٹکنے دے۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھا۔ بہت آہستہ آہستہ!"

سعادت

دوسری گلی کا موڑ مڑ جانے کے بعد انہوں نے لاش زمین پر رکھ دی اور اپنے اپنے جوتے پہننے لگیں۔ رعودتش کے نازک پاؤں پتھریلی سڑک پر چلتے چلتے زخمی ہو گئے تھے۔ چاندنی میں ڈوبی ہوئی رات پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گلی کوچوں میں مکانوں کے آہن رنگ سائے کانپ رہے تھے۔ کمسن کنواریوں نے متاعِ گرانبار کو پھر اٹھایا۔

"ہم کہاں جا رہی ہیں؟" چھوٹی لڑکی نے پوچھا "ہمیں لاش کو کہاں دفن کرنا ہے؟"

"وہ ماننبوس کے قبرستان میں۔ وہ ہمیشہ ویران رہتا ہے۔ یہ وہاں نہایت سکھ اور چین سے رہے گی۔"

"بدنصیب کراسس! معلوم نہ تھا کہ مرنے کے بعد اس کی لاش کو متاعِ دزدیدہ کی طرح گلیوں میں سے چھپا کر لے جانا پڑے گا۔ افسوس! کراسس کی لاش تابوت اور مشعلوں کے بغیر گورستان کی طرف جا رہی ہے!"

وہ مسلسل باتیں کیے جا رہی تھیں۔ گویا لاش کی موجودگی میں چپ چاپ رہنا انہیں گوارا نہ تھا۔ کراسس کی زندگی کا آخری دن ان کے لیے انتہائی استعجاب انگیز ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مل کر سوچ رہی تھیں: آئینہ، شانہ اور ہار اسے کہاں سے ملا تھا؟ دیوی کا مقدس ہار اسے خود توچرانے کی جرات نہ ہوئی ہو گی؟ معبد کے ہوشیار محافظوں کی موجودگی میں ایک تو رطنیرہ کا اندر داخل ہونا محال تھا۔ یہ کام اس کی خاطر یقیناً کسی دوسرے نے کیا ہو گا۔ لیکن کس نے؟ وہ کون ہے؟ جہاں تک انہیں علم تھا راہبانِ معبد میں سے کوئی اس کا عاشق نہ تھا۔ اگر یہ کام واقعی کسی دوسرے کا تھا تو دور اندیش کراسس نے اسے بے نقاب کیوں نہیں کیا؟ حقیقت کچھ بھی تھی لیکن ان ہولناک جرائم کا اصل مقصد کیا تھا۔ ایک عقلمند عورت

ایسی جاہلانہ، بے مقصد غلطی نہیں کر سکتی جب تک وہ کسی کی محبت میں مبتلا نہ ہو۔ کرِشتس کو ضرور کسی سے محبت ہو گی۔ مگر کس سے؟

"ہمیں کچھ نہ معلوم ہو سکے گا!" رعودت نے حتمی فیصلہ سنایا "کرِشتس کی زندگی کا راز بھی اس کے ساتھ دفن ہو جائے گا۔ بہر کیف مجرم کوئی بھی ہو وہ ہمارا نام تو ہرگز نہیں لے گا۔"

اس مرحلہ پر رعودت نے جو بے حد نڈھال ہو چکی تھی، ایک طویل آہ بھری اور بولی "مرطو! بس مزید نہیں چل سکتی، غم اور تھکن سے میرا برا حال ہے۔ میں گرا چاہتی ہوں۔"

مرطو نے پیار سے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور بولی "جانِ مرطو! گھبراؤ نہیں کوشش کرو۔ ہمیں ابھی آگے جانا ہے۔ دیکھتی نہیں اگر ہم نے کرِشتس کو جلد از جلد دفن نہ کیا تو اس کی موت کے بعد کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ابھی تو میں نے اس کے ہاتھ میں ایک ابول دینا ہے ورنہ وہ دریائے جہنم کے کناروں پہ ہمیشہ ماری ماری پھرتی رہے گی۔ آخر ہمیں بھی تو مردہ انسانوں میں جا کر رہنا ہے۔ ہمارا وقت آئے گا تو ہم اسے منہ نہ دکھا سکیں گی۔ وہ ہم سے بے مہری کی شکایت کرے گی تو ہم کیا جواب دیں گی؟"

رعودت پر مرطوصیلہ کی بات کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ الٹا اس سے لگ کر رونے لگی۔

"جلدی کرو، خدارا جلدی کرو! لاش کو سنبھالو!" مرطو یکایک گھبرا کر بولی "کوئی سڑک پر چلا آ رہا ہے۔ لاش کے سامنے کھڑی ہو جاؤ۔ بہتر ہو گا جو ہم لاش پہ اپنی قبائیں ڈال دیں کسی کو پتہ چل گیا تو بُرا ہو گا۔"

وہ اپنی بات خود ہی کاٹ کر بولی "وہ طائمن ہے۔ میں اسے پہچان رہی ہوں۔ چار عورتیں اس کے ہمراہ ہیں۔ اُف! اب کیا ہو گا؟ وہ شخص تو ہر شے کا مذاق اڑایا کرتا ہے۔ وہ ہم پہ بھی یقیناً ہنسے گا۔ رعودت! تو یہیں پہ ٹھہر! میں جاتی ہوں۔ اور اس سے بات کرتی ہوں۔"

"طائمن، طائمن!" وہ التجا آمیز آواز میں چلائی "طائمن! ذرا میری بات سُننا۔ مجھے تم

سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے ــ اور اکیلے میں!"

"میری ننھی الیلی!" نوجوان نے کہا "خیر تو ہے؟ تو بہت گھبرائی ہوئی نظر آتی ہے۔ کیا تیری کوئی چیز گم ہو گئی؟ کہیں تیری گڑیا کی ناک تو نہیں ٹوٹ گئی؟

تیری گڑیا کی ناک کا ٹوٹ جانا تو ایک نہایت ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا!"

لڑکی نے طائمن کو جواب میں انتہائی یاس انگیز نظروں سے دیکھا لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ زباں سے کہتی وہ چار عورتیں ـــ فلوطس، سیسو، سنائیڈس والی، تلستاں اور طرائفہ ـــ اس کے گرد جمع ہو گئیں۔

"ننھی پگلی!" طرائفہ مچل کر بولی، "ہم تیرے لیے بیکار رہیں اگر تو نے اپنی ماما کا تمام دودھ پی ڈالا ہے۔ ہمارے پاس تیرے پلانے کے لیے دودھ کہاں! اری پگلی تجھے تو اس وقت اپنے بستر میں ہونا چاہیے تھا۔ دن نکل رہا ہے جانے تم بچیوں نے کب سے چاندنی راتوں میں آوارہ گردی شروع کر دی؟"

فلوطس نے بات بڑھائی "طرائفے! یہ ماما یا دودھ کی بات نہیں وہ طائمن کو ہم سے چھین کر لے جانا چاہتی ہے!"

"کوڑا اور کوڑا! اس کم بخت کی کوڑے سے مرمت ہونی چاہیے! نقصان پہنچان [illegible] رکے فوراً بعد اس نے مرطو کی کمر میں اپنی بانہیں ڈال دیں اور اسے اوپر کو اٹھا کر اس کی قبا اتارنے لگی۔ وہ تو خیر ہوئی جو سیبسو نے اسے روک دیا "چھوڑو جی! مرطو بیچاری کو مردوں سے کیا واسطہ۔ وہ طائمن کو عیش کے لیے نہیں بلا رہی۔ اسے چھوڑ دو! میں کہتی ہوں اسے چھوڑ دو!"

"مرطو! کیا قصہ ہے؟" طائمن بولا "آؤ، ادھر ایک طرف آؤ اور میرے کان میں اپنی بات کہو۔ کیا واقعی کوئی سنجیدہ بات ہے؟"

"طائمن! وہاں گلی میں ہمارے ساتھ کرٹسس کی لاش ہے۔" مرطو گلوگیر آواز سے بولی

"میں اور رعودت اسے گورستان لے جا رہی ہیں لیکن وہ بہت بھاری ہے۔ خدارا ہماری مدد کرو۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تدفین سے فارغ ہوتے ہی تم اپنی عورتوں کے پاس چلے جانا۔"

طامن نے بڑی ہمدردی سے مرطو کی بات سنی اور بولا "مجھے معاف کرنا، مرطو! میں بے وجہ تم دونوں پر قہقہہ زن رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم دونوں مجھ سے بہتر ہو۔ یقیناً میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ تم اپنی سہیلی کے پاس چلو اور میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ سیدھا اپنی چاروں داشتاؤں کے پاس آیا "معشوقانِ طامن! شاہراہ فوتار سے ہوتی ہوئی تم سب میرے گھر پہنچو۔ میں بعد میں پہنچوں گا۔ میرا اچھا مت کرنا!"

رعودت لاش کے سرہانے بیٹھی تھی۔ طامن کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بولی "خدارا کسی سے کہنا نہیں کہ ہم نعش چرا کر لائیں۔ ہمارے راز کو فاش نہ کر دینا۔ ہم تمہیں دل و جان سے پیار کریں گی۔"

"[illegible] نہیں! مجھے اس قدر کمینہ خیال نہ کرو۔ انسان ہوں۔ مجھے بھی ایک دن مرنا ہے!" [illegible] اٹھایا اور مرطو قبیلہ کے گھٹنوں کی طرف سے۔ وہ چپ چاپ چلتے گئے۔ اور رعودت لرزہ بر اندام ان کے پیچھے پیچھے چلتی آئی۔ طامن نہایت معنی خیز انداز میں خاموش تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ افسوس! دونوں کے مختصر عرصہ میں میری ایک اور رفیقۂ عیش اس جہان سے رخصت ہو رہی ہے۔ بوالہوسیاں انسان کو ضرور ہی اس راہِ مستقیم سے بھٹکا دیتی ہیں جس کی منزل انبساط کامل ہے۔

"انبساط کامل؟" وہ مزید سوچنے لگا "کیا انبساطِ کامل کا واحد ذریعہ حصول اس سے بے نیاز ہو جانا نہیں! نفسانی تسکینِ مطلق؟ وہ کون سا مرد ہے جسے اس عشوہ طراز کو

مکمل طور پر حاصل کرنے کا دعویٰ ہے ؛ بے عیب نفسانی آسودگی ؛ انسان پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ اس کے لیے تڑپتا رہے۔ اسکے حصول کے لیے امیدوں پر امیدیں باندھتا رہے۔ اس کے حصول کی تگ و دَو اور بھی زیادہ تکلیف دہ اور صبرآزما ہو جاتی ہے جب منتہائے آرزو فقط ایک ہستی ہو۔ اس صورت میں تو قلبِ آشفتہ کی بوالہوسیوں کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ وہ اس سے اندھا دھند اکتابِ نشاط کرنا چاہتا ہے۔ اسے ایک لمحہ کے لیے اپنی آغوش سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ کرسس، کرسس......!

وہ ویران قبرستان کے دروازہ پر پہنچ چکے تھے۔

"ہم اسے کہاں دفن کریں گے؟" مرطوصیلہ نے پوچھا۔

"دیوتا کے پاس"

"مگر دیوتا کہاں ہے؛ میں یہاں پہلے کبھی نہیں آئی۔ مجھے قبروں اور ان کے کتبوں سے ازلی نفرت ہے۔ میں حرمانیوں میں کبھی نہیں آئی"

"وہ باغ کے وسط میں ہوگا۔ خیر ڈھونڈ ہی لیں گے۔ میں بچپن میں ایک دفعہ ایک غزال کا تعاقب کرتا ہوا ادھر نکلا تھا۔ آؤ! ان اشجار جمیز کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلیں دیوتا کی مورتی بالآخر مل ہی جائے گی"

اور بالآخر وہ مل ہی گئی۔

نمودِ سحر کی ارغوانی تابندگی مرمریں مجسموں پر رقصاں چاندنی میں گھل مل رہی تھی۔ سرو کے قد کشیدہ درختوں پر ایک ابہام انگیز دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ دور ایک گوشہ میں کھجور کے چند درختوں کی سرسراہٹ پر تازگی پھیلانے والی بارش کا گماں ہوتا تھا۔ طویل کوشش کے بعد جب طامن گلابی پتھر کی سل کو ایک طرف ہٹانے میں کامیاب ہوا تو طبیبانہ انداز میں ایستادہ دیوتا کے ہاتھوں کے زیر سایہ ایک قبر منہ کھولے نمودار ہوئی۔ قبر خالی تھی اگرچہ کسی وقت اس میں ضرور ہی کوئی لاش رہی ہو گی۔ لیکن فی الحال اس میں سالو لی

مٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔

طائسن قبر میں اتر گیا اور ہاتھ بڑھا کر بولا "مجھے لاش پکڑاؤ! اسے ٹھکانے لگانے کے بعد میں قبر کو بند کر دوں گا!"

لیکن رعونت میت پر گر پڑی اور اس سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی "اتنی جلدی نہ کر، طائسن! ایک بار مجھے اس کا چہرہ دیکھ لینے دے۔ ایک بار صرف آخری بار ___ آہ، کرائسس، میری پیاری حرماں نصیب کرائسس! ___ دیکھنا وہ کس قدر بدل چکی ہے! کس قدر ہولناک طور پر!"

اس پر مرطوصیلہ نے لاش سے لپٹی ہوئی چادر سرکا لی تو چہرہ نمودار ہوا۔ وہ اس قدر بدل چکا تھا کہ دونوں لڑکیاں گھبرا کر پیچھے کو ہٹ گئیں۔

رخسار پچکے ہو چکے تھے۔ ہونٹ اور پپوٹے سپید گردن کی طرح متورم ہو گئے تھے۔ لاش میں کرائسس کے مافوق الادراک جمال کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ آخر کار انہوں نے دبیز چادر دوبارہ چہرہ پر سرکا دی۔ لیکن اسی اثنا میں مرطوصیلہ اپنا ایک ہاتھ کفن میں ڈال چکی تھی اور اب ایک ابول کرائسس کی انگلیوں میں شرآن دیوتا کی نیاز کے لیے تھما رہی تھی۔

بالآخر دونوں لڑکیوں نے سسکیاں لیتے ہوئے کرائسس کی پتلی اور بے جان نعش طائسن کی باہوں میں منتقل کر دی۔

لاش کو ریتلی زمین پر بڑی احتیاط اور ادب کے ساتھ رکھنے کے بعد طائسن نے چادر کھینچ لی۔ نقرئی ابول بدستور کرائسس کی بے جان انگلیوں میں محفوظ تھا۔ میت کا سر اس نے ایک چھوٹی سی سل پر رکھ دیا۔ تاکہ لاش پر دائمی خواب کے تسلط کا گماں ہو اور لانبے سنہری بال اس نے پیشانی سے زانوؤں تک پھیلا دیئے اس کے بعد وہ قبر سے باہر نکل آیا۔

اتنے میں رعودث اور مرطو جبیلہ نے، جو قبر کے کنارے دوزانو ہو کر بیٹھی تھیں، اپنے اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹی۔ انہیں اکٹھا کیا اور پھر بالوں کے گچھے کو لاش کے ساتھ دفن کر دیا ــــ" اور اس طرح کرسٹس اور دماطرئیس کا نیرنگِ حسن و عشق اپنے انجام تک پہونچا۔"

تصریحات

صفحہ/سطر	مستعملات اردو	مستعملات انگریزی	تصریحات
۱—۱	ایڈونیس	Adonis	ربّۃ عشق وینس (زہرہ) کا محبوب جو عمر میں اس سے نسبتاً چھوٹا تھا۔
	مدعوسہ	Medusa	ایک حسین یونانی سپیرن جو اپنے سر کے بالوں سے سانپ لپیٹے رکھتی تھی۔ مجازاً خطرناک حسن کی مالک عورت۔
۱—۲	نے نواز دوشیزہ	Flute-girl	قدیم مصر کی تفریح گاہوں میں نے نواز دوشیزائیں اپنی بانسری کے نغموں سے دلدادگانِ عیش و تفریح کا دل بہلاتی تھیں۔ چونکہ وہ تمام عمر کنواری رہنے کا حلف اٹھائے ہوتیں اس لیے مردوں کی نسبت عاشق مزاج عورتیں ان کی طرف زیادہ مائل ہوتیں۔
	اساطیر	Satyr	یونانیوں اور لاطینیوں کا دیوتا جس کی شکل انسان کی، کان، دم اور ٹانگیں گھوڑے کی تھیں۔ اساطیر سے مراد بوالہوس لی جاتی ہے۔ (صیغہ جمع۔ اساطیور)
	حورانِ کوہ	Nymphs	اساطیور کی مرغوبِ خاطر محبوبائیں۔ مجازاً شہوت پرست عورتیں۔
	عیروس	Eros	کام دیو جو اپنی دغابازیوں اور بے وفائیوں کے لیے مشہور تھا۔ عورتیں جہاں اسے چاہتی تھیں وہاں اس سے پناہ بھی مانگتی تھیں۔
	آپالو	Apollo	خالص یونانی دیوتا جو مردانہ وجاہتوں کا حسین ترین مرقع خیال کیا جاتا ہے۔ موسیقی، تیر اندازی، نجوم،

		طلب اور گلہ بانی فنون کی حیثیت میں اس کے گھر کی باندیاں تھیں۔
عطیس	Attis	یونانی تاریخ الاصنام کی رو سے سائبلہ جسے زمین اور بطن نسواں کی زرخیزی کی دیوی مانا جاتا ہے، کا منظورِ نظر تھا۔ وہ بعد میں اس کا شوہر بھی بنا لیکن اس سے پہلے کہ عطیس اور سائبلہ بطور زن و شوہر زندگی شروع کرتے سائبلہ نے جوشِ رقابت میں عطیس کو جنسی طور پر ناکارہ کروادیا کیونکہ عطیس سائبلہ کی چھوٹی بہن اگدسطس کی طرف زیادہ مائل نظر آتا تھا۔ عطیس کے ختنہ ہونے سے سائبلہ بقیہ تمام عمر "خود کردہ را علاج نیست" کی تصویر بنی رہی۔
نرسل دیوی سرینکس	Syrinx	یونانی تاریخ الاصنام میں سرینکس اور پان دیو کا رومان بہت مشہور رہا ہے۔ پان کے دونوں پاؤں بکرے کے سے تھے۔ وہ سرینکس نامی ایک کہستانی حور کا پرستار تھا مگر نازک اندام سرینکس اپنے طلبگار کی بوالہوسی سے اکثر پناہ مانگتی تھی۔ ایک دن وہ پان دیو کے سر پر شہوت کا خوفناک بھوت سوار دیکھ کر بھاگی اور ایک ندیا میں کود گئی۔ دریا کی تہہ تک پہنچ کر وہ زیرآب اگنے والی نرسل کی جھاڑیوں سے چھپنے کی جگہ مانگنے لگی۔ چنانچہ نرسل کی جھاڑیوں نے اسے اندر ایسا

			چھپایا کہ وہ خود نرسل بن گئی۔ کام دیو (عیروس) اس نرسل کو باہر نکال لایا اور اس سے ایک ایسی بانسری بنائی جس سے نہایت پردرد نغمے پیدا ہوتے
	ابول/ابوالی	Abolo/ Aboli	قدیم یونانی سکہ جو درخمہ کا چھٹا یعنی چار سینٹ کے برابر تھا۔ ایک درخمہ ۲۴ سینٹس کے برابر تھا اور ایک سو درخم ایک مینا کے برابر تھے۔
	منار	Light-house	روشنی کا مینار بمعہ ملحقہ عمارت
	ضیوس اور لیدا	Zeus & Leda	(اندر اور پاربتی ضیوس راج ہنس کے روپ میں لیدا سے ملا اور لیدا کے بطن سے ہیلن آف ٹرائے ایک انڈے کی شکل میں پیدا ہوئی۔
	بضیوس	By Zeus	بروزن "بخدا"
۱—۳	فراغیبی	Phrygian	فراغیہ سے ایشائے کوچک کا ایک قدیم ملک جس کے آثار قدیمہ شام، لبنان اور ترکی میں محفوظ ہیں۔ فراغی علم الحرب اور موسیقی اپنے زمانہ میں دور دور تک شہرت رکھتی تھی۔
	ملکہ برنیس	Queen Bernice	بطلیموسی اوتیطر کی باغی بیٹی جو بعد میں ملکہ مصر بننے میں کامیاب ہوئی۔ بطلیموسی سلاطین اپنی ہیئت دانی کے لیے مشہور تھے۔ بطلیموسی سلسلہ حکومت اسکندر اعظم کی موت سے شروع ہو کر قلوپطرہ پہ ختم ہوا۔
	شرایت	Cherites	(صیغہ جمع شرت) شرابت بنات ضیوس۔ یہ تین ہم نام

			لڑکیاں صنف حسن کی تین بڑی خوبیوں۔خوش ادائی، سحر طرازی اور خوش روئی۔کی فرداً فرداً نمائندہ تھیں۔یونان اور یورپ کے نامور بت تراشوں نے اپنے شاہکاروں میں انہیں ہمیشہ اکٹھے دکھایا ہے۔اور انہیں "تین سحر" یعنی تھری گریسس کا نام دیا۔
۱ — ۵	ابن اطلس	Son of Atlas	مراد اطلس کی طرح طاقت ور۔قدیم یونانی عقیدہ کے مطابق کائنات اطلس دیوتا کے کندھوں پہ کھڑی ہے۔
	صافو	Sapho	طبقہ اناث میں ہم جنسی کی پہلی علمبردار۔ایک عظیم یونانی شاعرہ۔
۱ — ۶	دختران آب	Sirens	
۲ — ۱	زوفورا	Zoophora	(صیغہ جمع زوفارس) مخلوط حیوانوں کے مجسمے۔
۲ — ۷	عارفیس	Orpheus	فن موسیقی اور علم النجوم کا دیوتا۔
۳ — ۲	پورکس	Porcus	ایک لاطینی ذومعنی لفظ جس کا مطلب کم سن خنزیر اور اندام نہانی ہے۔
۳ — ۴	حکایت دنائی	Fables of Danae	دنائی جو ضیوس دیوتا کی وساطت سے فرسیوس کی ماں بنی۔کہا جاتا ہے کہ جب دنائی دیوانگی کے جرم میں قید کر دی گئی تو اس کا محبوب ضیوس اس کے پاس سونے کی بارش کی شکل میں اندر پہنچا۔سونے کو دنائی نے اپنے جسم میں جگہ جگہ چھپا لیا اور نتیجتاً وہ حاملہ ہو گئی اور پھر اس کے بطن سے فرابیوس پیدا ہوئی

			فلدماس کی ایک لاطینی نظم کے مطابق فرسیوس صافو کی پیرو کار تھی اور اندرومن نامی ایک دوشیزہ کی شیدائی تھی۔ حکایت دنائی سے متعلق کئی ایک تصاویر جو نامور فرانسیسی اور اطالوی مصوروں مثلاً رمبرانڈت، کوریگیو اور ٹیٹین نے بنائیں، آج بھی پیرس کے آرٹ میوزیم میں محفوظ ہیں۔
۳—۵	زینو	Zeno	بانیٔ رواقیت۔ اس مذہب فلسفہ کے مطابق صرف خیر مقصدِ حیات قرار پائی ہے اور مزید ضبطِ جذبات کی اور راحت والم کے احساس سے آزادی کی تلقین کی ہے۔ زینو نے یہ مذہب ۳۰۸ ق م میں ایتھنز میں قائم کیا۔
۴—۱	غزل الغزلات	Song of songs	حضرت سلیمان کی غزل الغزلات۔ پرانے عہد نامہ سے ماخوذ۔
۵—۱	لکھا ہے...	It is written...	یہ تمام اقتباسات پرانے عہد نامے میں مندرج فرمودات المرسلین سے ترتیب وار ماخوذ ہیں۔ یرمیاہ ۲/۲، ۲۰۔ ہوسیع ۲/۷، یرمیاہ ۲/۳۳، ۳۴، ۲۔ حزقی ایل ۲۳/۲۰، ۲۱۔ یرمیاہ ۳/۱۔ حزقی ایل ۲۳/۲۲، ۲۵ ناحوم ۳/۵، ۶ ہوسیع ۲/۱۴۔ واعظ ۹/۷، ۱۰۔ واعظ ۱۱/۹، ۱۲/۵، ۶

زنــده کتــابیں

۱- خانۂ کعبہ	محمد طاہر الکردی	(تاریخ)	1.75
۲- محمد رسول اللہ	توفیق الحکیم	(سوانح)	5.00
۳- بوڑھا اور سمندر	ہیمنگوے	(ناول)	1.50
۴- جینے کا قرینہ	آندرے موروا	(نفسیات)	3.00
۵- کرنیں	شفیق الرحمان	(افسانے)	2.25
۶- شگوفے	"	(افسانے)	2.25
۷- کامیابی کا راستہ	یوس ٹیس چیسر	(نفسیات)	2.25
۸- زندگی کا راستہ	"	(نفسیات)	3.00
۹- مادام بوواری	گستاو فلوبیر	(ناول)	4.00
۱۰- بڈھا گوریو	بالزاک	(ناول)	3.50
۱۱- آداب زندگی	اقبال سلطان	(نفسیات)	2.00
۱۲- شبنم	عزیز احمد	(ناول)	3.00
۱۳- گریز	"	(ناول)	3.00
۱۴- سرخ و سیاہ	ستاں دال	(ناول)	7.00
۱۵- اپنا راستہ خود بناؤ	فائق کامران	(نفسیات)	2.25
۱۶- کیا آپ کاروبار کرتے ہیں	اعجاز حسین	(کاروبار)	2.75
۱۷- پچھتاوے	شفیق الرحمان	(افسانے)	2.25
۱۸- مد و جزر	"	(افسانے)	1.75
۱۹- ۶۲ء کے بہترین افسانے	حلقۂ ارباب ذوق	(افسانے)	3.00
۲۰- ۶۲ء کی بہترین شاعری	"	(شاعری)	1.50
۲۱- ۶۲ء کے بہترین مقالے	"	(مضامین)	1.50
۲۲- کچھ تو کہیے (اہم ادبی بحثیں)	"	(مباحثے)	1.00
۲۳- روزمرہ آداب	الطاف فاطمہ	(ایٹی کیٹ)	2.00
۲۴- پیار کی دیوی	پئر لوئی	(ناول)	2.75
۲۵- رستم و سہراب	آغا حشر	(ڈراما)	1.25
۲۶- تیغ ستم	شفیع عقیل	(مزاح)	2.00
۲۷- امتحانوں کی تیاری	کولن۔ای۔وڈلے	(عام)	1. 25

PAYAAR KI DEVI